کشفِ بُردہ

نفیس احمد مصباحی

ناشر
مجلسِ برکات، جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ
(یوپی) پن ۲۷۶۴۰۴

باسمہ وحمدہ تعالیٰ وتقدس

کشفِ بردہ

(اردو زبان میں قصیدۂ بردہ شریف کا ترجمہ، تشریح، علمی، فکری، فنی، عروضی اور بلاغی تجزیہ)

تصنیف

نفیس احمد مصباحی بارہ بنکوی

استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یو-پی

ناشر

المجمع القادری، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہدیۂ تشکّر

یہ کتاب مخیرّ قوم وملت جناب انجم ابراہیم صاحب (یو. ایس. اے) کے خصوصی تعاون سے منظر عام پر آرہی ہے، ہم اس تعاون کے لیے تہِ دل سے ان کے شکر گزار ہیں، اللہ تعالیٰ اس مقبول بارگاہِ رسالت قصیدہ کے طفیل انہیں اخلاص وللّٰہیت کا نمونہ بنائے، ان کی جان، مال، عزت وآبرو اور والدین اور اہل وعیال کی حفاظت فرمائے، انہیں اور ان کے اہل خانہ کو دونوں جہان کی دولتوں، ثروتوں اور سعادتوں سے مالامال فرمائے، ان سے دین حنیف کی بیش از بیش خدماتِ جلیلہ مقبولہ لے۔ محمد جان مرحوم اور خاندان کے دیگر مرحومین کی مغفرت فرمائے، بابایاں بائی ابوبکر سُورا اور دیگر بیماروں کو شفائے کاملہ وصحتِ عاجلہ سے ہم کنار فرمائے اور پریشان حالوں کی تمام پریشانیاں دور فرمائے۔

آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین، و صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیھم وعلیٰ آلہ وصحبہٖ أجمعین.

تعارفِ مصنف

ایک نظر میں

از:- مولانا ساجد علی مص
(استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پ

نام مع ولدیت : نفیس احمد مصباحی بن محمد زماں قادری (مرحوم)

تاریخ پیدائش : ۵/جون ۱۹۶۸ء

وطن : شیخن ٹولہ، قصبہ سدّھور، ضلع بارہ بنکی، یو۔پی۔انڈیا

تعلیم : (۱) ابتدائی تعلیم: مدرسہ عربیہ بحر العلوم، سدھور، بارہ بنکی، یو۔پی۔

(۲) عالمیت: جامعہ عربیہ اظہار العلوم، نیا بازار، جہانگیر
امبیڈکر نگر، یو۔پی

(۳) فضیلت: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یو۔پی

تعلیمی اسناد : عالم وفاضل (درس نظامی)، فاضل دینیات وفاضل ادب
(عربی وفارسی اتر پردیش، بورڈ)

تدریس : (۱) دار العلوم قادریہ، چریا کوٹ، مئو، یو۔پی
(۴/سال، از ابتدا ۱۹۹۰ء تا آخر ۱۹۹۳)

(۲) دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، ضلع بستی، یو۔پی
(۲/سال، از ابتدائے ۱۹۹۶ء تا آخر ۱۹۹۷ء)

(۳) جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یو۔پی
(از جنوری ۱۹۹۸ء تا حال)

مشاغل : تدریس، تصنیف، تحقیق، مقالہ نگاری۔

رشحاتِ قلم

۱-اصول حدیث (اردو)-۲-بردۂ مدحت (قصیدۂ بردہ کی اردو زبان میں مختصر شرح وترجمانی)-۳-کشف بردہ (قصیدۂ بردہ کی اردو زبان میں مفصل شرح، فکری وفنی اور عروضی وبلاغی تجزیہ)-۴-میزانُ الـمُـتَـرَبِّـی (عربی زبان میں دیوان متنبّی کی مفصل شرح)۔

۵-نافذة تاريخية موجزة على الجامعة الأشرفية (عربی)-۶-نظرة على الجامعة الأشرفية (عربی)-۷-الأدلة الطاعنة في أذان الملاعنة (عربی ترجمہ)-۸-غاية التحقيق في إمامة العلي و الصديق (عربی ترجمہ)-۹-ردّ الرفضة (عربی ترجمہ)۔

۱۰-شرح قصيدتان رائعتان (اردو)-۱۱-اوراردووعربی زبان میں درجنوں علمی وفقہی اورادبی مقالے۔

فہرستِ مضامین

باسمہٖ وحمدہٖ تعالیٰ وتقدس

عرضِ حال

یہ کوئی اوائلِ محرم ۱۴۲۲ھ کی بات ہے جب میں نے بعض احباب کی خواہش پر قصیدۂ بردہ شریف کی اردو میں مختصر شرح وترجمانی کا کام شروع کیا، جو بحمدہٖ تعالیٰ اُسی سال ۱۷ربیع الاول کو تکمیل آشنا ہوگیا، اور پھر ''بردہ مدحت'' کے نام سے طبع ہوکر مقبول انام ہوا، اس کتاب کی تیاری کے دوران قصیدۂ بردہ کی بہت سی شرحیں مطالعہ میں آئیں ایک دن یکا یک دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اردو زبان میں اس مقبولِ بارگاہ رسالت قصیدہ کی ایسی شرح لکھی جائے جس میں ترجمہ، حل لغات، معنوی تشریح اور محاسن بلاغت کے بیان کے ساتھ ہی اس قصیدہ کا مختلف زاویوں سے جائزہ پیش کیا جائے۔ پھر کیا تھا، میں نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کے فضل وکرم پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کا ایک اجمالی خاکہ بناکر کام کا آغاز کردیا، پھر مقررہ خطوط پر آہستہ آہستہ کام چلتا رہا، اور تقریباً ایک سال پہلے یہ کام مکمل ہوگیا، پھر اصلاح ونظر ثانی کی غرض سے فقیہِ اسلام، محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی دام ظلہ، صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ کی خدمت بابرکت میں پیش کیا، کثرتِ مصروفیات کے باوجود حضرت نے کرم فرمایا، اور اس کتاب پر نظر ثانی فرماکر مفید اصلاحات فرمائیں، اور مقدمہ کے ایک

باب کو از سرِ نو لکھنے اور اشعار کی تشریح میں کچھ ضروری اضافوں کا مشورہ دیا۔ اس طرح حضرت کے ارشاد کے مطابق کتاب کو تیار کرنے میں کافی عرصہ لگ گیا، کتاب کی تکمیل کے بعد پھر اصلاح کی نیت سے میں نے اسے اپنے محسن و مربی استاذ، محقق عصر، صدر العلماء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ العالی صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی بارگاہ میں پیش کیا، قلتِ وقت اور کثرتِ مشاغل کی بنا پر حضرت نے صرف اشعار کے ترجمے، قصیدۂ بردہ کی فنّی، عروضی اور بلاغی پیمائش پر نظر ثانی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کا سایہ تا دیر ہمارے سروں پر قائم رکھے، اور انہیں ان کی خدماتِ جلیلہ کا وہ صلہ عطا فرمائے جو اس کی شان کریمی کے لائق ہے۔ اس کتاب کی خاکہ بندی اور ترتیب وتزئین میں درج ذیل علمائے کرام نے بھی اپنے مفید اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔

(۱) فاضل جلیل، ادیب اسلام حضرت مولانا فروغ احمد مصباحی، صدر المدرسین دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی۔

(۲) مصلح قوم وملت، فاضل گرامی حضرت مولانا مسعود احمد برکاتی مصباحی، استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور (مقیم حال امریکہ)۔

(۳) آبروے فکر وقلم، ترجمان اشرفیہ، حضرت مولانا مبارک حسین مصباحی، استاذ جامعہ اشرفیہ وچیف ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور۔

(۴) فاضلِ باکمال، حضرت مولانا محمد نظام الدین علیمی مصباحی، استاذ دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی۔

(۵) فاضل نوجوان، حضرت مولانا محمد افروز قادری چریاکوٹی، امین مکتبہ امام احمد رضا لائبریری، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور۔

میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان حضرات کا شکر گزار ہوں۔

اصلاح وتزئین اور کتابت وتصحیح کے مختلف مراحل سے گزر کر اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، مذکورہ بالا اساطینِ امت اور علماے کرام کی نظر ثانی، اصلاحات اور مشوروں سے بہرہ مند ہونے کی بنا پر امید ہے کہ اسے دینی وعلمی حلقوں میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوگی اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ دورانِ مطالعہ اگر کوئی خامی نظر آئے تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں اور اسے اس بے مایہ کے قصورِ نظر پر محمول فرمائیں اور خوبیوں کو ان بزرگوں اور کرم فرماؤں کی دقتِ نظر اور ژرف نگاہی کا نتیجہ سمجھیں۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد النبي الأمین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ أجمعین إلیٰ یوم الدین.

نفیس احمد مصباحی بارہ بنکوی
خادم تدریس، جامعہ اشرفیہ،
مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا۔

۱۱ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
۲۱ر فروری ۲۰۰۵ء
بروز دوشنبہ مبارکہ

کلماتِ طیبات

محقق مسائل جدیدہ، فقیہ اسلام حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی دام ظلہ
صدر شعبۂ افتا، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً

قصیدۂ بردہ شریف کو عالم اسلام میں جو شہرت وقبولیت حاصل ہے وہ بلاشبہہ حضور سید عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی مقبولیت کا فیض ہے۔

اس قصیدۂ مبارکہ کی چند امتیازی خوبیاں یہ ہیں:

۱- اس کی سطر سطر سے عشق رسالت کی خوشبو پھوٹ پھوٹ کر ہر صاحبِ ایمان کے مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔

۲- اہل حق ''اہل سنت و جماعت'' کے مشہور عقائد، مثل توسل، شفاعت، علم غیب، دفعِ بلا، تقسیمِ نعم، نیابت مطلقہ، محبوبیتِ کبریٰ وغیرہا کا جابجا اظہار واثبات ہوتا ہے۔

۳- کم الفاظ میں کثیر معانی کو اس طرح جمع کر دیا گیا ہے جیسے کوزہ میں دریا سمٹ کر آ گیا ہو اور اس خوبی کے ساتھ کہ تعبیرات فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور معانی کتاب وسنت سے ماخوذ، اسلاف سے منقول، یا اجماع کا آئینہ ہیں۔

ان خوبیوں کو اجاگر کرنے کے لیے اس کے ترجمہ وتشریح کی ضرورت پیش آئی، عربی زبان میں اس کی کئی ایک مبسوط ومختصر شروح لکھی گئی ہیں، جن سے عربی داں طبقہ تو خوب مستفیض ہوتا ہے لیکن اردو داں طبقہ ان سے استفادہ نہیں کر پاتا، اس لیے جامعہ اشرفیہ کے شعبۂ عربی ادب کے لائق فائق استاذ محبّ محترم جناب مولانا نفیس احمد مصباحی

دام مجدہٗ نے اردو زبان میں اس کی شرح لکھ کر یہ ضرورت پوری فرمادی، مولانا نے قصید
مبارکہ کی درج بالا خوبیوں کو اجاگر کرنے کی خوب خوب سعی فرمائی ہے اور راقم الحروف
تاثر یہ ہے کہ وہ اپنی اس سعی میں بفضلہٖ تعالیٰ کامیاب ہیں۔

اس شرح میں مولانا نے مشکل الفاظ کی لغوی اور نحوی تشریح فرمائی ہے، سلیس
اور عام فہم اردو زبان میں اس کا معنیٰ خیز ترجمہ کیا ہے، پھر ہر شعر کے مفاہیم عالیہ کو دل نشیں
انداز میں سمجھا کر کتاب اللہ کی آیات، فرمودات نبوی، آثارِ صحابہ اور ارشاداتِ ائمہ سے ا
کا ثبوت فراہم کیا ہے اور اختصار کے ساتھ محاسن بلاغت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ترجمہ بجائے خود ایک بہت مشکل کام ہے، کیوں کہ ترجمہ کسی لفظ کا صرف لغو
معنیٰ بتادینے کا نام نہیں، بلکہ ایک زبان کے مواقع اطلاقات، محاورات، استعارات
تشبیہات پر گہری نظر رکھتے ہوئے اس کا صحیح مفہوم متعین کر کے دوسری زبان کے محاورات
استعارات وتشبیہات میں اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ منتقل کردینے کا نام ہے، بلف
دیگر اس میں ایک زبان کے الفاظ کی روح دوسری زبان کے الفاظ کے قالب میں ڈالی جا
ہے، اس لیے ترجمہ کا حق وہی ادا کرسکتا ہے جو دونوں زبانوں کے ادب سے بخوبی واقفیہ
اور شغف رکھتا ہو، ساتھ ہی ذوق لطیف کا حامل ہو۔

مولانا موصوف میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں، اس لیے ان کا ترجمہ بجا طور
ایک اچھا اور نفیس ترجمہ قرار دیا جاسکتا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ ایسا ہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا کی یہ سعی حسن قبول فرمائے، ان کے قلم میں مز
استحکام بخشے اور انہیں دین حنیف کی بیش از بیش خدمات کی توفیق رفیق عطا فرمائے، آمین
بجاہ حبیبہ النبی الامین علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ وازواجہ الصلاۃ والتسلیم

محمد نظام الدین الرضوی
خادم درس وافتا
دار العلوم اشرفیہ مبارک پور

۲۴؍رمضان ۱۴۲۵ھ
۸؍نومبر؍۲۰۰۴ء
شب دوشنبہ

امام شرف الدین بوصیری

حیات اور کارنامے

نام ونسب: ساتویں صدی ہجری کے مشہور عربی شاعر، ماہر خطاط، زبردست محدث وفقیہ اور سلسلہ شاذلیہ کے صاحبِ نسبت واجازت صوفی بزرگ امام بوصیری علیہ الرحمہ کا نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب شرف الدین، والد کا نام سعید اور دادا کا نام حماد ہے، مصر کے علاقہ بوصیر میں آپ کا دادیہال اور دَلاص میں آپ کا نانیہال تھا، آپ قوم بربر کے صِنہاجہ نامی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں، اسی لیے آپ کو قبیلہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے ''دلاصی'' اور مقام سکونت کی طرف نسبت کرتے ہوئے ''بوصیری'' کہتے ہیں اور کبھی دَلاص اور بوصیر دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایک مرکب نسبت ''دَلاصیری'' ذکر کرتے ہیں۔

ولادت: امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ یکم شوال ۶۰۸ھ مطابق ۶/مارچ ۱۲۱۲ء کو دلاص میں پیدا ہوئے، بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کی جاے ولادت ''بَہْشیم'' بتائی ہے، یہ دونوں مقامات مصر کے ''بَہْنَسا'' نامی خطے میں واقع ہیں۔

تعلیم وتربیت: تحصیل علم کے لیے آپ مصر کے مشہور ومعروف مرکزی شہر قاہرہ گئے، جہاں آپ نے پوری محنت اور لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور مروجہ علوم وفنون کے ساتھ عربی زبان وادب میں کمال حاصل کیا، کہا جاتا ہے کہ آپ نے تیرہ برس کی عمر ہی میں، قرآن مجید کا حفظ اور دیگر اسلامی علوم وفنون کی بھی تعلیم مکمل کرلی۔

بیعت وارادت: آپ قطب زمانہ حضرت ابوالعباس مُرسی (متوفی ۶۸۶ھ) کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، جو حضرت ابوالحسن شاذلی (متوفی ۶۵۶ھ) کے نام ور خلیفہ تھے اور آپ نے ان ہی سے طریقت وتصوف کی تعلیم بھی حاصل کی اور شیخ کی صحبت کی برکت

سے آپ کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جو ان کے معاصرین میں کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

کار گاہِ حیات میں : امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ دس سال تک بیت المقدس (یروشلم) میں رہے، پھر مدینہ طیبہ آئے اور تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں رہ کر علوم قرآن کی تعلیم دیتے رہے اور یہ کوئی ۶۵۹ھ کی بات ہوگی کہ آپ اپنے وطن مصر واپس آکر بلبیس (شرقیہ) میں "کاتب" کی حیثیت سے حکومت کے ملازم ہو گئے، تقریباً چار سال تک اسی ملازمت سے وابستہ رہے، پھر آپ نے تعلیم قرآن کے لیے ایک ادارہ قائم کرنا چاہا، کچھ دنوں بعد آپ قاہرہ آگئے اور اُمرا و حکام اور اربابِ اقتدار کی شان میں مدحیہ قصائد لکھنے شروع کیے، لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی تو آپ نے اپنے سابقہ ارادہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک مدرسہ قائم فرمایا اور خدمت دین میں مصروف ہو گئے، اس دوران آپ برابر اسکندریہ آتے جاتے رہے، جہاں آپ کے شیخ اور مرشدِ طریقت حضرت ابوالعباس مُرسی رہا کرتے تھے۔

علمی کمالات : آپ ساتویں صدی ہجری کے جلیل القدر فقیہ، محدث، ماہر خطاط اور حساب داں تھے، لیکن آپ کا شہرہ چار دانگ عالم میں ایک با کمال ماہر فن، نکتہ سنج عربی شاعر کی حیثیت سے ہوا، آپ نے توریت و انجیل کے علاوہ یہود و نصاریٰ کی متعدد مذہبی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کے اُن افکار و عقائد کا بھرپور رد کیا جو اسلامی نظریہ سے متصادم تھے، آپ کے بعض قصائد اور حواشی میں ردعیسائیت و یہودیت کا عنصر بالکل نمایاں ہے، ان میں سب سے مشہور قصیدہ لامیہ ہے جس میں ۲۴۰ اشعار ہیں، اس کا مطلع یہ ہے

"جَاءَ الْمَسِيْحُ مِنَ الْاِلٰهِ رَسُوْلًا"

تلامذہ : امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے باضابطہ درس گاہ میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے درمیان ایک مدت تک علم و فضل کے گوہر لٹائے، لاینحل مسائل کی عقدہ کشائی فرمائی اور تشنگانِ علوم کو پوری فیاضی سے سیراب کرتے رہے، آپ کی درس گاہِ فیض سے اکتساب

کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے، ان کے بعض تلامذہ آسمانِ شہرت ومقبولیت پر مہر و ماہ بن کر چمکے اور اپنے انوار وتجلیات سے ایک عالم کو ضیا بخشی، چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:
(۱) شیخ ابوحیّان (۲) شیخ یعمری (۳) شیخ ابوالفتح بن سید الناس (۴) محقق زمانہ علامہ عزالدین بن جماعہ۔

مذہب: شارح قصیدہ بردہ علامہ عمر بن احمد خرپوتی کے بیان کے مطابق آپ کا تعلق مذہب شافعی سے تھا۔ (عصیدۃ الشھدہ، ص۱۳۳)

ادبی حیثیت: امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ شعر وشاعری میں کمال وتفوق کے ساتھ عربی زبان کے بہترین نثر نگار بھی تھے، ان کی نثر نگاری آسان اور رواں اسلوب میں ہوتی تھی، قصیدۂ لامیہ پر ''اَلْمُخْرَجُ وَالْمَرْدُوْد علی النصاریٰ والیَهُوْد'' کے نام سے آپ کے حواشی اور تعلیقات ہیں جو آسان، بے تکلف، رواں عربی زبان میں ہیں، لیکن آپ کی نثر نگاری، شاعری کے ہم پلہ نہ تھی اور شعر وشاعری کی طرح اس میں آپ کو خاص مہارت اور نمایاں دستگاہ حاصل نہ تھی جو آپ کو اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز کرتی۔

وفات: امام بوصیری علیہ الرحمہ نے لمبی عمر پائی، اخیر عمر میں قُوائے جسمانی پر ضعف و نقاہت کا غلبہ ہوگیا تھا، بالآخر ۶۹۴ھ میں علم ومعرفت کا یہ آفتاب مصر کے مشہور شہر اسکندریہ میں روپوش ہوگیا اور وہیں آپ کو سپرد خاک کیا گیا، جہاں آج بھی آپ کا مزار مبارک مشہور ومعروف اور زیارت گاہِ خاص وعام ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے سن وفات ۶۹۶ھ لکھا ہے۔

شعر وشاعری: اپنے معاصرین کے درمیان شعر وشاعری میں یکتائے روزگار تھے، نعتِ رسول آپ کی شاعری کا خاص موضوع تھا، قصیدۂ بردہ کے علاوہ بھی آپ کی متعدد نعتیں ہیں، آپ کا پورا دیوان نعتیہ کلام پر مشتمل ہے جو ''دیوان بوصیری'' کے نام سے مصر میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے، انگریزی اور جرمن زبانوں میں بھی اس کے تراجم ہوئے، اس مجموعہ میں ہر قصیدہ تشبیب اور نسیب سے شروع ہوتا ہے جو عربی شاعری کا روایتی انداز ہے اور ہر حرف تہجی میں ان کا نعتیہ قصیدہ موجود ہے، ان میں قصیدۂ ہمزیہ کو بڑی مقبولیت

اور شہرت حاصل ہے، اس میں چار سو چھپن اشعار ہیں، یہ قصیدہ سیرت نبویہ کا ایک تفصیلی منظوم خاکہ ہے، جس میں سرکار کی ولادت طیبہ، شیر خواری، اعلان نبوت، واقعہ معراج، غزوات، فتح مکہ، حج وغیرہ مضامین پائے جاتے ہیں، اہل بیت، صحابۂ کرام اور عشرہ مبشرہ کا ذکر ہے اور قصیدہ کا اختتام صلوٰۃ وسلام پر ہوتا ہے، اس کا مطلع ہے:

كَيْفَ تَرْقىٰ رُقِيَّكَ الْاَنْبِيَآءُ يَا سَمَآءً مَا طَاوَلَتْهَا السَّمَآءُ

(آپ کی بلندی تک انبیاے کرام کی رسائی کیسے ہوسکتی ہے؟ اے اوج و رفعت کے آسمان کہ کوئی آسمان بلندی میں جس کا ہمسر نہیں ہوسکتا)

علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف ''المجموعۃ النبھانیۃ'' میں آپ کا ایک طویل قصیدہ نقل کیا ہے، جو قصیدۂ بانت سعاد کی زمین میں ہے، جس کا مطلع ہے:

اِلیٰ مَتیٰ اَنْتَ بِاللَّذَّاتِ مَشْغُوْلُ
وَاَنْتَ عَنْ كُلِّ مَا قَدَّمْتَ مَسْئُوْلُ

مذکورہ بالا قصائد کے سوا آپ کے قصیدۂ مضریہ کو بھی شہرتِ دوام اور قبول عام حاصل ہوا، ہند و بیرون ہند، عرب ممالک وغیرہ میں قصیدۂ بردہ کی طرح قصیدۂ مضریہ بھی محافل میلاد اور مجالس ذکر میں بڑے والہانہ انداز میں پڑھا جاتا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

يَارَبِّ صَلِّ عَلَى الْمُخْتَارِ مِنْ مُّضَرٍ
وَالْاَنْبِيَا وَجَمِيْعِ الرُّسْلِ مَا ذُكِرُوْا

آپ کے عہد میں مصر کی حالت: امام بوصیری جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ بڑا پُر فتن، پُر آشوب اور رو بہ زوال دور تھا، اس وقت مصر بڑے انقلاب و تغیر سے گزر رہا تھا، ہر طرف انحطاط و زوال، شکست و ریخت، قنوط و یاس اور جمود و تعطل کا پہرہ تھا حضرت سلطان صلاح الدین ایوبی کا بھائی الملک العادل مصر و شام کا حکمراں تھا، اس کے عہدِ سلطنت میں تو حالات قدرے غنیمت تھے، اس کے رعب و دبدبہ، اثر و رسوخ اور

فراست وتدبر کی بدولت ایوبی خاندان کے افراد بظاہر متحد تھے، گوکہ سیاسی کشمکش اور اقتدار پسندی کا عفریت اندر اندر اپنے پیر پھیلا رہا تھا اور اپنی شیطنت کے پنجے گاڑ رہا تھا، ادھر الملک العادل کا انتقال کرنا تھا کہ ایوبیوں میں اقتدار پر قبضہ کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلۂ جوالہ بن کر ابھریں اور دیکھتے ہی دیکھتے باہمی اتحاد واتفاق کا خرمن راکھ کا ڈھیر بن گیا، آپس میں ایسی خانہ جنگی کا آغاز ہوا کہ ان کی ہوا اکھڑ گئی، رعب ودبدبہ جاتا رہا، یکے بعد دیگرے لوگ تخت نشین ہوتے رہے اور مصر وشام صلیبیوں کے حملوں اور باہمی آویزشوں کا نشانہ بن گئے۔

مصر وشام کے سوا عالم اسلام کے دیگر خطوں کے حالات بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھے، ایران توران بنی عباس اور خوارزمیوں کی رسّا کشی سے کراہ رہے تھے، شمال سے تاتاری درندے اپنی پوری طاقت وتوانائی کے ساتھ عظمت اسلام کو تہس نہس کرنے کے لیے خلافت بغداد کے زیر نگیں علاقوں پر پیہم حملے کر رہے تھے، ان کا سیل رواں اسلامی افواج کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا اور کوئی نہ تھا جو ان کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر اہل اسلام کا بھرپور دفاع کرتا۔

دوسری طرف مصری حکام واُمرا، ارباب اقتدار اور دیگر حکومتی عملے کے حالات نہایت بدتر ہو چکے تھے، ان میں خدا سے بے خوفی، رشوت خوری، فرائض منصبی سے بے پروائی اور احکام الٰہی سے سرتابی عام تھی، پورا معاشرہ فساد وبے راہ روی کا شکار تھا، ان حالات کی شکایت خود امام بوصیری نے ایک قصیدہ میں کی ہے جس کا مطلع ہے:

نَقَدْتُّ طَوَائِفَ الْمُسْتَخْدِمِيْنَا

فَلَمْ اَرَ فِيْهِمْ حُرًّا اَمِيْنَا

(یعنی امرا وحکام اور سرکاری عملہ کے تمام گروہوں کو میں نے جانچا اور پرکھا تو مجھے ان میں کوئی شریف اور دیانت دار نظر نہ آیا)۔

اس قصیدہ سے مصر کے اجتماعی اور معاشرتی حالات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے، یہ

قصیدہ مصری سوسائٹی کے ناگفتہ بہ حالات پر نہایت لطیف طنز کے پیرایہ میں کہا گیا ہے۔

قصیدۂ بردہ:

یوں تو امام بوصیری نے بہت سے نعتیہ قصائد تحریر کیے جن میں سے ہر قصیدہ فنی وادبی حیثیت اور معنوی اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے، مگر جس قصیدہ نے انہیں شہرت ومقبولیت کے بامِ عروج تک پہنچایا اور نعت گو شعرا میں انہیں امتیازی مقام عطا کیا وہ قصیدہ بردہ ہی ہے، امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اس کا نام ''الکواکب الدریة فی مدح خیر البریة'' رکھا تھا، مگر پھر ''بردة المدیح'' اور ''قصیدۂ بردہ'' کے نام سے اسے شہرتِ دوام حاصل ہوئی، بعض لوگوں نے صحابیِ رسول اور شاعر بارگاہِ رسالت سیدنا حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ کے ''قصیدۂ بردہ'' (جو کہ قصیدۂ بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے) اور اس قصیدہ کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے امام بوصیری کے قصیدہ کو ''بردۂ منامیہ'' کا عنوان بھی دیا ہے، کیوں کہ انہیں خواب میں بارگاہِ رسالت مآب سے ''بُرْدہ'' (دھاری دار چادر) مرحمت ہوئی تھی۔

اس قصیدہ نے اسلامی شعروادب اور مدح ونعت کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کردیا، اس نے بہت سے شعرا کو نہ صرف نعت گوئی کی طرف متوجہ کیا بلکہ ان میں مدحت رسول کی سچی رغبت اور والہانہ شوق بھی پیدا کردیا، یہ قصیدہ مسلمانوں کے عربی داں طبقہ اور خود بلادِ عربیہ میں بے حد مقبول ہوا، مجالس ذکر اور محافل میلاد میں پوری دنیا میں نہایت عشق وعقیدت اور والہانہ محبت کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے، اس خداداد مقبولیت کو دیکھنے کے بعد یہ بات بلا جھجھک کہی جاسکتی ہے کہ عربی نعت گو شعرا میں شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بعد جس شاعر کے کلام کو سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت اور بقائے دوام کا اعزاز ملا وہ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدۂ بردہ ہی ہے۔

علمی وفنی اور ادبی وبلاغی حیثیت سے قصیدہ کا جائزہ لیجیے تو سمجھ میں نہیں آئے گا کہ

وہ بجلی کی طاقت، مقناطیسی اثر اور لوگوں کے قلوب کو اپنی طرف کھینچنے والی روحانی کشش اور جاذبیت کس بنا پر ہے، کیوں کہ عربی و اسلامی اشعار کے ذخیروں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے بدرجہا بہتر اشعار کہے جا چکے ہیں، جن میں نحو و بلاغت کی خوبیاں، ادبی وفنی محاسن، شاعرانہ بانکپن، بندش کی چستی، معانی کی لطافت، تشبیہات واستعارات کی ندرت قصیدۂ بردہ سے کہیں زیادہ ہے، مگر کیا بات ہے کہ ان میں وہ جاذبیت ومقناطیسیت اور وہ تازگی اور چاشنی نہیں جو اس قصیدہ میں ہے، وہ قصیدے ایک دو بار پڑھے گئے اور کتابوں کی زینت بن کر رہ گئے، مگر واہ رے قصیدۂ بردہ! کہ بار بار پڑھا جاتا ہے، مگر پامال ہونے کی بجائے اس کی تازگی بڑھتی ہی جا رہی ہے، اکتاہٹ کی بجائے چاشنی اور لذت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

معلوم ہوا مقبولیت اور چیز ہے اور فن اور چیز۔ یہ مقبولیت کا معاملہ ہے، اس قصیدہ کو اس بارگاہِ والا تبار میں شرفِ قبول مل چکا ہے جہاں کی مقبولیت اہل ایمان کے لیے ترقی وکامرانی کی معراج ہے، سچ تو یہ ہے کہ امام بوصیری نے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اس قصیدہ کو نظم فرمایا، ان کا مطمح نظر فنی قابلیت کا مظاہرہ اور ادبی لیاقت کی نمائش نہ تھی، مقصدِ اصلی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی اور ثنا خوانی تھی:

ثنائے سرکار ہے وظیفہ، قبولِ سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا، رَوی تھی کیا کیسے قافیے تھے

ساتھ ہی اس قصیدے سے خرقِ عادت کا ایک اہم واقعہ بھی جڑا ہوا ہے، اس لیے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا، تو دو وجہیں ہوئیں۔ ایک تو مقبولیتِ بارگاہ، دوسرے خرقِ عادت کا ظہور۔

وجہِ تسمیہ: شارحین نے اس کی مختلف وجوہ تسمیہ ذکر کی ہیں، مگر ان میں سب سے مشہور وجہ یہ ہے:

(۱) کہ امام بوصیری نے خواب میں جب یہ قصیدہ بارگاہ رسالت میں پڑھا تو حضور اکرم ﷺ

نے اپنی بُردِ یمانی (یمنی چادر) ان کو اڑھادی، جس کی برکت سے انہیں مرض فالج سے نجات مل گئی، اس لیے اس قصیدہ کا نام ''قصیدۂ بردہ'' پڑا۔

اس کے علاوہ درج ذیل وجہیں بھی بیان کی جاتی ہیں:

(۲) لغت میں ''بُردۃ'' دھاری دار چادر کو کہتے ہیں، چوں کہ امام بوصیری نے اس قصیدہ میں مختلف مضامین بیان کیے ہیں، کہیں بادصبا سے مخاطبہ، کہیں اظہار شوق وذوق، کہیں غم ہجر کی داستان، کہیں تنہائی کا شکوہ، کہیں نفس امارہ پر عتاب، کہیں مدعا علیہ سے سوال و جواب، کہیں اعترافِ قصور، کہیں عذر خواہی، کہیں نفس کے مکروفریب سے بچنے کی تنبیہ، کہیں وعظ و نصیحت کہیں دربارِ رسالت میں استغاثہ وتوسل، کہیں سرکار مدینہ سے شفاعت کی درخواست، کہیں صلوٰۃ وسلام ببارگاہِ خیر الانام، تو گویا یہ مختلف مضامین لباسِ عشق ومحبت پر خطوط اور دھاریوں کے مانند ہیں، اسی بنا پر اس قصیدۂ مبارکہ کا نام ''قصیدۂ بردہ'' رکھا گیا۔

(۳) یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ بردہ ''بَرَدٌ'' سے ماخوذ ہو جس کا معنی آرام پہنچانا، سکون دینا، تکلیف کو ہلکا کرنا ہے، تو چوں کہ اس قصیدہ سے قاری کو روحانی اطمینان اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے اور پریشانی دور ہوتی ہے اس لیے اسے بردہ کہا جاتا ہے۔

(ماخوذ از طیب الوردۃ، تالیف علامہ ابوالحسنات محمد احمد قادری علیہ الرحمہ)

قصیدہ لکھنے کی وجہ: امام شرف الدین بوصیری اپنی علمی لیاقت اور خداداد قابلیت کی بنا پر ابتدائی عمر ہی میں کسی بادشاہ کے ملازم ہو گئے تھے، آپ سلطان وقت اور اُمرائے زمانہ کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھا کرتے تھے، آپ کی عمر کا ایک خاصا حصہ اسی طور پر گزرا، آپ نے قصیدۂ بردہ کے درج ذیل اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

خَدَمْتُهُ بِمَدِيْحٍ اَسْتَقِيْلُ بِهٖ ذُنُوْبَ عُمْرٍ مَّضٰى فِي الشِّعْرِ وَالْخِدَمِ

اِذْ قَلَّدَانِيَ مَا تُخْشٰى عَوَاقِبُهٗ كَاَنَّنِيْ بِهِمَا هَدْيٌ مِّنَ النَّعَمِ

اَطَعْتُ غَيَّ الصِّبَا فِي الْحَالَتَيْنِ وَمَا حَصَّلْتُ اِلَّا عَلَى الْاٰثَامِ وَالنَّدَمِ

(ترجمہ: میں نے حضور اکرم ﷺ کی ایک نعتیہ قصیدہ سے خدمت کی جس کے وسیلے سے میں اپنی عمر کے اس حصہ کے گناہوں کی بخشش کا طلبگار ہوں جو شعر گوئی اور لوگوں کی خدمت گزاری میں بسر ہوا، اس شعر گوئی اور خدمت گزاری نے میری گردن پر گناہوں کا قلادہ ڈال دیا ہے جن کے نتائج خوفناک ہیں، ان کی وجہ سے میں ایسا لگتا ہوں جیسے قربانی کا جانور ہوں۔ میں نے ان دونوں حالتوں میں نوخیزی کی بے راہ روی کی پیروی کی اور اس سے مجھے گناہوں اور شرمساری کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا)۔

ایک دن آپ بادشاہ کے دربار سے اپنے گھر واپس آرہے تھے کہ راستے میں ان کی ملاقات ان کے ایک دوست شیخ ابورجا رحمۃ اللہ علیہ سے ہوگئی، جو اپنے وقت کے قطب اور نہایت صالح اور متقی بزرگ تھے، انہوں نے پوچھا: بوصیری! کیا آج رات تمہیں خواب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت نصیب ہوئی ہے؟ آپ نے کہا کہ ابھی تک میں حضور کے جمال جہاں آرا کے دیدار سے محروم ہوں، اسی وقت سے ان کے دل میں ایک خاص جذبۂ شوق پیدا ہوا اور عشق وعقیدت کا تلاطم خیز دریا موج زن ہوگیا، خود کہتے ہیں: میں گھر آکر سوگیا اور شوق زیارت میں محو تھا اسی رات خواب میں سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ زیبا کی زیارت نصیب ہوئی، میں نے حضور کو صحابۂ کرام کے جھرمٹ میں اس طرح دیکھا جیسے چاند ستاروں کے جھرمٹ میں ہو، آنکھ کھلی تو خود کو زیارتِ سرکار کی برکتوں سے مسرور پایا اور دل کی دنیا میں وہ عظیم انقلاب دیکھا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے دل ہمہ وقت سرشار رہنے لگا، اسی زمانہ میں میں نے چند نعتیہ قصیدے لکھے، قصیدۂ مضریہ اور قصیدۂ ہمزیہ اسی دور کی یادگار ہیں۔

اس کے بعد ایک روز اچانک امام بوصیری پر فالج کا حملہ ہوا جس سے ان کے جسم کا نصف حصہ مفلوج ہوگیا، علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر:

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

جب شفایابی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اچانک ایک دن دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ
اس طبیب کی طرف رجوع کروں جو سراپا خیر و کرم ہے، ہر مایوس، نا امید اور بے سہارا
مریض کا سہارا ہے، جو رحمۃ للعالمین ہے، بیماری کے لیے مجسم شفا ہے، شاید میری مشکل
آسان ہو جائے، چنانچہ اسی حالت میں میں نے یہ مبارک قصیدہ نظم کیا، قصیدہ کی تکمیل کے
بعد میں سو گیا تو عالم خواب میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، خواب ہی میں میں
نے یہ قصیدہ مسیحِ کونین، شفائے دارین ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا، بعد اختتامِ قصیدہ میں نے
دیکھا کہ سرکار نے اپنا دستِ شفا میرے جسم پر پھیرا اور اپنی ردائے رحمت مجھے اڑھا دی
میں اسی وقت شفایاب ہو گیا، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جسم پر بیماری کا نام و نشان تک موجود نہیں
اور ایسا تندرست ہو گیا گویا بیماری کبھی لاحق ہی نہ ہوئی تھی، اسی خوشی اور مسرت کے عالم میں
صبح میں اپنے گھر سے نکلا، راستے میں شیخ ابوالرجاء سے ملاقات ہوئی، فرمانے لگے آپ
مجھے وہ قصیدہ عنایت فرمایئے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں آپ نے کہا ہے، میں
نے کہا کون سا قصیدہ؟ میں نے کئی نعتیہ قصیدے لکھے ہیں، شیخ نے فرمایا وہ قصیدہ جو "اَمِنْ
تَذَکُّرِ جِیْرانٍ بِذِیْ سَلَمٖ" سے شروع ہوتا ہے، میں نے حیرت سے عرض کیا یَا اَبَا
الرَّجَاءِ مِنْ اَیْنَ حَفِظْتَهَا؟ اے ابوالرجاء! آپ نے یہ قصیدہ کہاں سے یاد کیا؟ میں نے
سرکار کے سوا اب تک کسی کو یہ قصیدہ نہیں سنایا ہے، شیخ ابوالرجاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

لَقَدْ سَمِعْتُهَا الْبَارِحَةَ تُنْشِدُهَا بَیْنَ یَدَیِ النَّبِیِّ ﷺ وَهُوَ یَتَمَایَلُ وَ یَتَحَرَّكُ
اِسْتِحْسَانًا تَحَرُّكَ الْاَغْصَانِ الْمُثْمِرَةِ بِهُبُوْبِ نَسِیْمِ الرِّیَاحِ. (عصیدة الشهدة، ص ۳)
(گزشتہ رات تمہیں یہ قصیدہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں
پڑھتے ہوئے سنا ہے، اسے سن کر حضور خوشی میں سرشار ہو کر اس طرح جھوم رہے تھے جس
طرح پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں بادصبا کے جھونکوں سے جھومتی ہیں)۔

امام بوصیری فرماتے ہیں، یہ سن کر میں نے فوراً وہ قصیدہ ان کی خدمت میں پیش

کردیا، پھر یہ بات ملک کے گوشے گوشے میں عام ہوگئی۔

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ''الزبدة العمدة في شرح البردة '' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں: ''رفتہ رفتہ یہ خبر شاہ مصر الملک الطاہر کے وزیر بہاء الدین تک پہنچی تو انہوں نے اس قصیدۂ مبارکہ کی نقل لی اور نذر مانی کہ اس قصیدۂ مبارکہ کو روزانہ پیادہ پا، برہنہ سر کھڑے ہوکر سنوں گا، چنانچہ اس کی برکتوں سے وہ اور ان کے اہل خانہ دنیا وآخرت کی بے شمار بھلائیوں اور کامیابیوں سے ہم کنار ہوئے، پھر وہیں ایک شخص کو اس شدت کا آشوبِ چشم ہوا کہ اس کی بینائی جانے کا اندیشہ ہونے لگا، اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص اس سے کہہ رہا ہے کہ بہاء الدین وزیر سے ''بردہ'' لے کر اپنی آنکھوں پر رکھ لے، وہ شخص وزیر کے پاس آیا اور خواب کا سارا ماجرا اس کے سامنے پیش کیا، وزیر بہاء الدین نے کہا کہ بردہ نام کی کوئی چیز تو میرے پاس نہیں ہے، ہاں! حضور شافعِ یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نعت میرے پاس ہے، جس کے وسیلہ سے میں بارگاہِ خداوندی میں شفا کی درخواست کرتا ہوں، پھر قصیدۂ بردہ شریف نکال کر اس مریض کی آنکھوں پر رکھ دیا اور پورا قصیدہ اس کے سامنے پڑھا، اللہ تعالیٰ نے اس قصیدہ کی برکت سے اسے آشوبِ چشم سے شفا عطا فرمادی۔

اس سے انداز ہوتا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے امام بوصیری کو فالج سے شفا اور رحمت کی رِدا تو عطا ہی فرمائی، اس کے ساتھ ان کے قصیدہ کو بھی ''داروے شفا'' بنادیا، اور ایسا قبولِ عام بھی عطا کردیا کہ دنیا حیرت زدہ ہے۔

قصیدۂ بردہ اور جہانِ علم ودانش

اس قصیدۂ مبارکہ کی اہمیت وافادیت کے مزید جلوے دیکھنے کے لیے اربابِ علم ودانش کے ان اقوال وآرا کا مطالعہ بہت مفید ہوگا جو ذیل میں درج کیے جارہے ہیں۔

☆ مجدد اسلام علامہ نورالدین علی بن سلطان محمد ہروی مکی معروف بہ ملا علی قاری رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''طلبِ حاجات اور نزولِ مہمات کے وقت اس کا پڑھنا (حاجت براری کے لیے) مجرب ہے۔ میرے دل میں اس مبارک ومسعود قصیدہ کی شرح کرنے کا خیال اس امید پر پیدا ہوا کہ اس کی برکت سے مجھے ظاہری وباطنی بیماریوں سے شفا اور اخلاقی پستی کے روگ سے نجات مل جائے اور سرکار کے اخلاق حسنہ کی برکتوں سے استفادہ کرسکوں''۔

(الزبدة العمدة فی شرح البردة، ص ۱)

☆ شیخ زادہ علامہ شیخ محی الدین محمد بن مصطفیٰ قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

''قصیدۂ بردہ کے برکات وثمرات کا مشاہدہ کثرت سے ہوا ہے، جمہور خواص وعوام نے اس کے عجائب اس تواتر سے پائے کہ مجھے تفصیل سے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اس کے محاسن ومناقب اتنے ہیں کہ قلم لکھنے اور زبان بیان کرنے سے قاصر ہے''۔(شرح البردة لشیخ زادہ علیٰ ہامش عصیدة الشھدة،ص۶)

☆ علامہ عمر بن احمد خرپوتی شافعی مفتی شہر خرپوت لکھتے ہیں:

''یہ قصیدہ بڑا بابرکت، دینی ودنیوی حاجات میں یقینی حد تک موثر اور مجرب ہے بشرطے کہ حضورِ قلب اور شرائط کی رعایت کے ساتھ پڑھا جائے'' (عصیدة الشھدة،ص۱)

☆ عارف کامل حضرت سید علی ہمدانی شرح قصیدہ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

''قصیدۂ بردہ شریف کی برکات تحریر و بیان سے باہر ہیں، یہ قصیدہ شاہی خزانوں اور لائبریریوں میں دفع اعدا اور دفع بلیات کے لیے محفوظ رکھا جاتا ہے، آج کل حوادث و آفات کی شدت اور دفع بلیات میں علما و مشائخ اس قصیدہ کو وسیلہ بناتے ہیں، اسے پڑھ کر دعاؤں کی قبولیت و اجابت کا انتظار کرتے ہیں، اسے بے حساب مجرب پایا گیا ہے، اسی بنا پر اکابر علما و مشائخ نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

قصیدۂ مبارکہ کے معانی و حقائق پر توجہ رکھی جائے تو ظاہری حظ کے علاوہ باطنی ذوق بھی میسر آتا ہے اور یقین ہے کہ مقصد، سرعتِ اجابت سے سرفراز ہوگا اور پڑھنے والا ان شاء اللہ مقصد سے محروم نہیں رہے گا'' (شرح ہمدانی)۔

☆ مولانا عبد المالک خاں مشیر مالیات ریاست بہاول پور رقم طراز ہیں:

''اخلاص و محبت کے لحاظ سے حضور علیہ السلام کی نعت میں آج تک اس شان کا کوئی قصیدہ نہیں لکھا گیا، اس کے ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک لفظ میں تاثیر ہے، بعض اشعار کی تاثیر کے تعلق سے بڑے بڑے صالحین اور عام لوگوں نے اس تواتر سے شہادت دی ہے جس کی نسبت شک کرنا خلافِ اخلاص ہے، میرے خاندان میں ہمیشہ سے یہ قصیدہ پڑھا جاتا ہے اور میں نے بارہا آزمایا تو یہ حصولِ حاجات اور دفعِ مصائب کے لیے تیر بہ ہدف ثابت ہوا''۔ (مقدمہ حسن الجردۃ فی شرح قصیدۃ البردۃ)

☆ صاحبِ کشف الظنون شیخ مصطفیٰ بن عبد اللہ معروف بہ حاجی خلیفہ و کاتب چلپی رقم طراز ہیں.

''یہ قصیدہ لوگوں کے درمیان مشہور و متعارف ہے، خواص و عوام اس سے برکتیں حاصل کرتے ہیں، یہاں تک کہ جنازوں کے آگے اور مساجد میں اس کی قراءت کی جاتی ہے، بیماریوں میں اس کے وسیلہ سے دعائے شفا کی جاتی ہے'' (کشف الظنون، ج۲، ص۱۳۳۱)

☆ مصر کے مشہور مورخ احمد اسکندری اور مصطفیٰ عنانی لکھتے ہیں:

''اس بات پر سب کا اجماع و اتفاق ہے کہ صحابہ کرام کی نعتوں کے بعد سب سے بہ
قصیدہ مدحیہ ''قصیدۂ بردہ'' ہے، مرض فالج میں اس قصیدہ کو مصنف نے نظم کرکے بارگاہِ رسال
میں اسی کے توسل سے شفا طلبی کی اور اپنی لاعلاج بیماری سے شفایاب ہوئے''۔ (الوسیط، ص ۳۱۱
آگے لکھتے ہیں:

''اس قصیدہ نے اکثر معاصر شعرا کو سرکار کی مدح و ثنا کی طرف راغب کیا اور پھ
لاتعداد قصائد لکھے گئے، مگر وہ اس قصیدہ کے غبار کو بھی نہ پہنچ سکے''۔ (ایضا، ص ۳۱۲)

☆ علامہ اقبال احمد فاروقی تحریر فرماتے ہیں:

''مشائخ علما اور صوفیہ نے اسے ہر دور میں حرز جان بنایا، ہر مجلس میں پڑھا، ایک
بار نہیں ہزار بار پڑھا، لاکھوں صالحین امت اسی قصیدہ بردہ کو پڑھتے پڑھتے بارگاہِ نبوت
میں باریاب ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ ساز قصیدہ نے جہاں عاشقان رسول ک
ایک مرغوب و مقبول روحانی غذا دی وہیں صاحبِ قصیدہ کو آسمان شہرت کی ان بلندیوں پ
پہنچا دیا جہاں بہت کم لوگوں کی رسائی ہوئی ہے''۔ (مقدمہ طیب الوردۃ، ص ۷)

☆ علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''قصیدۂ بردہ شریف ایک ایسا مقبول و محمود قصیدہ ہے کہ مصنف کی زبان سے خو
مقصودِ کونین، مطلوبِ ثقلین، رحمۃ للعالمین، انیس الفقراء والمساکین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ
اصحابہ اجمعین نے سماعت فرمایا اور اتنا پسند آیا کہ بعض اشعار پر مثل عَذبات البان (درخت
بان کی شاخوں کی طرح) متمائل ہوئے، پھر اس کی شرح کی طرف ایک دو شارح ملتفت نہ
ہوئے اور معمولی شُرّاح نے اس کی شرح پر خامہ فرسائی نہ کی بلکہ شیخ زادہ اور خرپوتی مفتی
مدینہ خرپوت جیسے متبحر اس کی شرح فرما چکے ہیں''۔ (طیب الوردۃ، ص ۱۹)

☆ علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''آقائے نامدار، مدنی تاجدار، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نعت پاک میں ج

شمار قصیدے عربی، فارسی، اردو وغیرہ زبانوں میں لکھے گئے، اوران میں بہ کثرت قصائد نے اہلِ ذوق سے دادو تحسین حاصل کی، لیکن علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدۂ بردہ شریف کی عظمت وبلندی تک کوئی نہ پہنچ سکا، قصیدۂ بردہ کے علمی، ادبی محاسن کے علاوہ اس کی سب سے بڑی خوبی اورامتیازی شان یہ ہے کہ بارگاہِ نبوت میں اسے شرفِ قبولیت حاصل ہوا، اس کا والہانہ اندازِ بیان دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے، عشاقِ بارگاہِ نبوت کو اس کے ایک ایک لفظ سے عشق ومحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لذت حاصل ہوتی ہے"۔

(مقدمہ قصیدۂ بردہ، مترجم بہ چہار تراجم، از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ملتان)

☆ مفتی محمد رحیم سکندری، خطیب مسجد درگاہ پیر جو گوٹھ خیر پور، سندھ، پاکستان، لکھتے ہیں:

"اس قصیدہ شریف نے شعروادب کی دنیا میں نہ فقط ایک انقلاب برپا کردیا بلکہ مدح ونعت کے باب میں ایک طرح کی کرامت کا اظہار کیا ہے، یہ قصیدۂ بردہ ہی ہے جس نے دوسرے شعرا کو مدح رسول کی سچی رغبت دلائی اور خود مصنف کو صرف اسلامی دنیا ہی میں نہیں بلکہ علم وادب کی بین الاقوامی دنیا میں عظمت کے آسمان تک پہنچادیا"۔

(حرف آغاز، الزبدۃ العمدۃ، ص ۲۷)

قصیدۂ بردہ کے شارحین اور شرحیں

قصیدۂ بردہ کو وہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کی تشریح وتوضیح کرنے اور اس کے پوشیدہ معانی اجاگر کرنے کو اربابِ علم وفن اور اہل عشق وعرفان اپنی فیروز بختی اور خوش نصیبی سمجھتے ہیں، اسی بنا پر مختلف زبانوں میں نہ جانے اس کی کتنی شرحیں معرض وجود میں آچکی ہیں، آرہی ہیں اور آتی رہیں گی، سردست چند شارحین کے اسما درج ذیل ہیں:

۱- شیخ علی بن محمد بسطامی شاہرودی (م۸۷۵ھ)

۲- شیخ بدرالدین محمد بن محمد غزی (م۹۸۴ھ) ان کی شرح کا نام ''الزبدۃ'' ہے۔

۳- شیخ محی الدین محمد بن مصطفیٰ المعروف بہ شیخ زادہ (م۹۵۱ھ) ان کی شرح ''عصیدۃ الشہدۃ'' کے حاشیہ پر اصح المطابع آرام باغ، کراچی سے شائع ہوچکی ہے، میں نے اس کتاب کی تیاری میں اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۴- قاضی بحر بن رئیس بن الہارونی مالکی، ان کی شرح کا نام ''ارتشاف الشہدۃ فی شرح قصیدۃ البردۃ'' ہے۔

۵- مولانا عبیداللہ محمد بن یعقوب فناری (م۹۳۶ھ) صاحب شقائق نے لکھا ہے کہ ان کی شرح بہت عمدہ ہے۔

۶- شیخ حسام الدین حسن عباسی۔

۷- شیخ شرف الدین علی یزدی (۸۱۰ھ)

۸- شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن زمردی معروف بہ ابن الصائغ (م۷۷۶ھ)

۹- شیخ کمال الدین حسین خوارزمی (م۸۴۰ھ)

۱۰- شیخ جمال الدین عبداللہ بن یوسف معروف بہ ابن ہشام نحوی (م ۷۶۱ھ)

۱۱- شیخ زین الدین خالد بن عبداللہ ازہری (م ۹۰۵ھ) انہوں نے پہلے قصیدۂ بردہ کی مفصل شرح لکھی، اس کا نام "الزبدة فی شرح قصیدة البردة" رکھا، رجب ۹۰۳ھ میں اس سے فراغت پائی، پھر اس کی تلخیص کی، زیر نظر کتاب کی تالیف میں راقم نے ان کی شرح مفصل سے خوب استفادہ کیا ہے، میرے پیش نظر وہ نسخہ ہے جو علامہ ابراہیم باجوری (م ۱۲۷۶ھ) کی شرح بردہ کے حاشیہ پر محمد توفیق کتبی کے زیر اہتمام میدان الازہر الشریف مصر سے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ میں طبع ہوا ہے، اس میں شارح نے کلماتِ مفردہ کی توضیح کے ساتھ ترکیب نحوی اور اشعار کا ترجمہ بتانے کا التزام کیا ہے، یہ عربی زبان میں بہت عمدہ شرح ہے۔

۱۲- شیخ جلال الدین محمد بن احمد محلی شافعی (م ۸۶۴ھ) آپ تفسیر جلالین نصفِ آخر کے مصنف ہیں، ان کی شرح مختصر ہے۔

۱۳- شیخ احمد بن محمد بن ابی بکر، انہوں نے پہلے تو مختصر شرح لکھی جس میں صرف حل الفاظ پر اکتفا کیا، اس کی تکمیل ماہ محرم الحرام ۷۹۷ھ میں ہوئی، پھر ماہ شعبان ۸۰۹ھ میں اس کی ایک مبسوط شرح لکھی جس کا نام "نزهة الطالبین و تحفة الراغبین" رکھا۔

۱۴- شیخ خیر الدین خضر بن عمر عطوفی (م ۹۴۸ھ)۔

۱۵- شیخ زین الدین ابوالمظفر طاہر بن حسن المعروف بہ ابن حبیب حلبی (م ۸۰۸ھ) ان کی شرح کا نام "وشی البردة" ہے۔

۱۶- شیخ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن مرزوق تلمسانی (م ۷۸۱ھ)، ان کی شرح بہت مفصل اور عظیم الشان ہے، اس کا نام "الاستیعاب لما فی قصیدة البردة من البیان و الاعراب" ہے، انہوں نے قصیدۂ بردہ کی ایک اور شرح لکھی ہے جس کا نام "اظهار صدق المودة فی شرح قصیدة البردة" ہے۔ یہ بھی بہت عمدہ اور شاندار شرح ہے۔

۱۷- شیخ احمد بن مصطفیٰ، انہوں نے پہلے عربی میں شرح لکھی پھر دوبارہ ترکی زبان

میں اس کی شرح لکھی جو ۱۰۰۱ھ میں تکمیل آشنا ہوئی۔

۱۸-الشیخ الفاضل مسعود بن محمود بن یحییٰ الحسینی، ان کی شرح کا نام بھی "نسزھۃ الطالبین و تحفۃ الراغبین" ہے۔

۱۹-شیخ یحییٰ بن منصور بن یحییٰ الحسنی، یہ شرح "نتائج الأفکار" کے نام سے موسوم ہے۔

۲۰-امام فخر الدین احمد بن محمد بن ابوبکر شیرازی، انہوں نے پہلے حلِ الفاظ اور شرحِ معانی پر مشتمل قصیدۂ بردہ کی ایک مختصر شرح محرم ۷۹۷ھ میں تصنیف کی، جس میں مبادی، مقاصد، تراجم، اشعار کی تقطیع اور اعرابِ نحوی کو بیان کیا، پھر شعبان ۸۰۹ھ میں اس کی ایک مبسوط شرح رقم فرمائی، جس میں بہت سی تحقیقی اور علمی بحثیں تحریر فرمائیں۔

۲۱-شیخ محمد بن ملا ابوبکر بن محمد بن ملا سلیمان کردی سہرانی حنفی: ان کی شرح کا نام "الدرۃ المضیئۃ فی شرح الکواکب الدریۃ" ہے جو رمضان ۱۰۴۸ھ میں جامع ازہر میں مکمل ہوئی۔

۲۲-شیخ جلال بن قوام بن الحکم۔

۲۳-مجددِ اسلام ملا نور الدین علی بن سلطان محمد قاری ہروی مکی (م ۱۰۱۴ھ) ان کی شرح کا نام "الزبدۃ العمدۃ فی شرح البردۃ" ہے، صاحب کشف الظنون نے اسے بہترین شرح قرار دیا ہے، فقیر راقم الحروف نے بھی اس کتاب کی تالیف میں اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، یہ شرح جمیعۃ علمائے اسکندریہ، درگاہ پیر گوٹھ، خیر پور، سندھ، پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے۔

۲۴-شیخ شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی شارح بخاری (م ۹۲۳ھ): اس کا نام "مشارق الانوار المضیئۃ فی شرح الکواکب الدریۃ" ہے۔

۲۵-شیخ قاضی زکریا بن محمد انصاری (م ۹۲۶ھ): ان کی شرح کا نام "الزبدۃ الرائقۃ فی شرح البردۃ الفائقۃ" ہے، ماہ صفر ۹۲۸ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔

۲۶-ملا عصام الدین ابراہیم بن عرب شاہ اسفرائینی (م ۹۴۴ھ): ان کا

شرح فارسی زبان میں ہے۔

۲۷-شیخ جلال الدین احمد بن محمد خُجَندي (ولادت ۷۱۹ھ): ان کی شرح کا نام"طیب الحبیب هدية الى كل محب لبيب" ہے(۱)۔

۲۸-شیخ یوسف بن ابی اللطف قدسی (۱۰۰۰ھ)۔

۲۹-شیخ عمر بن احمد آفندی خرپوتی شافعی مفتی خرپوت، صاحب طیب الوردۃ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری نے اپنی شرح میں جن دو شرحوں پر اعتماد فرمایا اور ان کی تحسین وتعریف کی ان میں ایک علامہ خرپوتی کی اور دوسری علامہ محی الدین محمد بن مصطفیٰ شیخ زادہ کی شرح ہے، میں نے بھی ان دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے اس تالیف میں کافی استفادہ کیا ہے۔

۳۰-شیخ الاسلام علامہ ابراہیم باجوری مصری بن شیخ محمد جیزاوی (متوفی ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۷۶ھ)، راقم نے ان کی شرح سے اس تالیف میں سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے، یہ عربی زبان میں قصیدۂ بردہ شریف کی بہت عمدہ، شاندار اور تحقیقی شرح ہے۔

۳۱-علامہ محمد نور بخش توکلی (متوفی ۱۲ جمادی الاولی ۱۳۶۷ھ/۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء): آپ نے قصیدۂ بردہ شریف کی دو شرحیں لکھیں، ایک عربی میں اور دوسری اردو میں، یہ دونوں شروح بھی فقیر کے مطالعہ میں رہ چکی ہیں، یہ کتابیں مختلف حیثیتوں سے نہایت مفید اور قابل مطالعہ ہیں، عربی شرح "العمدة في شرح البردة" کے نام سے مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے نئی کمپوزنگ، دیدہ زیب سرورق کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔

۳۲-علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری (م ۲ شعبان ۱۳۸۰ھ): ان کی شرح کا نام "طیب الوردہ" ہے، یہ اردو زبان میں نہایت مفصل اور بہترین شرح ہے، میں نے اس کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اس سے اس تالیف میں استفادہ کیا ہے۔

---

(۱) یہاں تک کے مندرجات کچھ حذف واضافہ کے ساتھ کشف الظنون ج ۲، ص ۱۳۳۲ تا ۱۳۳۶ سے ماخوذ ہیں۔

قصیدۂ بردہ کی فنی پیمائش

عربی قصیدہ کے ایک ایک شعر کو لفظی اور معنوی حیثیت سے پرکھنے کے لیے معانی و بیان و بدیع اور عروض کے سیکڑوں اصول وضع کیے گئے۔ علاوہ ازیں کسی قصیدے کی عمدگی جانچنے کے لیے اس کے یہ تین اجزا خاص طور سے دیکھے جاتے ہیں:

- اول: یہ کہ شاعر نے ابتدا کس چیز سے کی ہے۔
- دوسرے: یہ کہ اگر تشبیب سے ابتدا کی ہے تو گریز کا انداز کیسا ہے۔
- تیسرے: یہ کہ قصیدہ ختم کس طرح کیا ہے۔

اجزاے ترکیبی کے لحاظ سے قصیدہ کی دو قسمیں ہیں:

۱- باتشبیب ـ ۲- بے تشبیب۔

یعنی قصیدہ تشبیب کا حامل بھی ہوتا ہے اور اس سے عاری بھی۔

باتشبیب قصیدہ کے اجزاے ترکیبی درج ذیل ہیں:

۱- تشبیب ـ ۲- گریز ـ ۳- مدح یا ہجو ـ ۴- خاتمہ۔

(۱) تشبیب یا نسیب:

عربی شعر و ادب میں عشقیہ شاعری کو کہتے ہیں، خواہ وہ مدحیہ قصیدہ کی تمہید میں ہو یا پوری نظم کا موضوع ہو، فارسی میں جب غزل ایک صنف سخن کی حیثیت سے وجود میں آئی تو تشبیب صرف قصیدہ کی عشقیہ شاعری کا نام رہ گیا، بعد میں ہر قسم کی تمہید کو تشبیب کہنے لگے۔

(۲) گریز:

مشبب قصیدہ کا دوسرا جز ''گریز'' ہے، اس کو عربی میں خروج، توسل، یا تخلص کہتے ہیں، اس

کی تعریف ابن رشیق نے یوں کی ہے:

الخروج: انماھو ان تخرج من نسیب الی مدح أو غیرہٖ بلطف تحیل۔ (العمدۃ، ج/۱،ص/۲۰۷،مطبوعہ المکتبۃ العصریہ،صَیدا، لبنان۔)

ترجمہ: (گریز،نسیب سے مدح یادوسرے موضوع کی طرف حیلے سے نکل جانے کانام ہے)

دورجاہلیت میں گریز کی لطافت کاچنداں خیال نہیں کیاجاتا تھا،عباسی دور میں اس فن کوعروج ہوااور متنبی نے اسے انتہائے کمال تک پہنچایا۔

(۳)مدح یا ھجو:

یہ قصیدہ کا تیسرا اورسب سے بنیادی جز ہے اورقصیدہ کا مرکزی مضمون اسی میں ہوتاہے،یہ جزشعرا کی توجہ کامرکز اوران کی فنی مہارت کی امتحان گاہ ہوتا ہے۔

(۴)خاتمہ:

قصیدہ کی آخری منزل خاتمہ ہے، اسے مقطع،حسن خاتمہ،دعائیہ بھی کہا جاتاہے،اگرقصیدہ کا خاتمہ اچھاہے تو قصیدہ اچھامانا جاتاہے، ورنہ برا۔ابن رشیق نے متنبی کوان تینوں میں تمام شعرا سے فائق تسلیم کیاہے۔

عربی، فارسی اوراردو کسی بھی زبان کے قصیدوں میں ان اجزاے ترکیبی کی پابندی لازم نہیں ہوتی، مدحیہ قصیدوں میں تو یہ اجزا اکثر کام میں لائے گئے ہیں، لیکن دوسرے موضوعات کے قصیدوں میں ان کاخیال نہیں رکھاجاتا۔

قصیدۂ بردہ مشبب قصیدہ ہے،اس میں مندرجہ بالا چاروں جز (تشبیب، گریز، مدح، خاتمہ) پائے جاتے ہیں۔

(۱) پہلاجز تشبیب ہے،جو''اَمِنْ تَذَکُّرِ جِیْرَانٍ بِذِیْ سَلَمٖ'' سے شروع ہوکربارہویں شعر''مَحَضْتَنِی النُّصْحَ لٰکِنْ لَسْتُ اَسْمَعُہٗ'' الخ پرختم ہوتاہے،امام بوصیری نے قصیدہ کا آغاز تو قدیم عربی شاعری کے روایتی انداز سے کیاہے، مگرنعت کے مضمون کا تقدس، موقع ومحل کی

نزاکت اور ممدوح گرامی جناب رسالت مآب ﷺ کا جمال وجلال پورے طور پر ان کے پیش نظر ہے، اسی لیے تشبیب کے مضمون کو زیادہ طول نہ دے کر چند اشعار میں اسے مکمل کر دیا ہے اور اس میں جاہلی شعرا کی طرح کسی خیالی محبوب کے کاکل وعارض، خط وخال اور حسن وجمال کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی سطحیت، یاوہ گوئی اور فحش کلامی کے مضامین نظم کیے ہیں، جیسا کہ امرؤ القیس وغیرہ جاہلی شعرا کے قصائد میں ملتا ہے، بلکہ سرزمین حجاز کے ان چند مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں سے کسی زمانہ میں حاجیوں کے قافلے گزرا کرتے تھے۔

قصائد کے آغاز میں تشبیب لانے سے قدیم شعرا کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اصل مضمون کو بیان کرنے کے لیے محبوب سے نسبت وتعلق رکھنے والی اشیا، اسے یاد دلانے والے مقامات کا تذکرہ کیا جائے، یا اس کے بے مثال حسن وجمال اور بے نظیر محاسن وکمالات کو بیان کیا جائے تا کہ قارئین اور سامعین دونوں کی آتش شوق تیز ہو، خوابیدہ جذبات واحساسات بیدار ہوں اور جس وقت اصل مضمون پر آئیں اس وقت قاری کے بیان کا جوش اور سامع کی سماعت کا اشتیاق نقطۂ عروج اور ذروۂ کمال تک پہنچ چکا ہو، اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشبیب کا مضمون عام طور سے قصیدہ کے ایک تہائی یا نصف پر حاوی ہوتا ہے، مگر کامیاب شاعر وہ ہوتا ہے جو اس مضمون کو اتنا طول نہ دے بلکہ چند اشعار ہی میں ایسے اچھوتے، پرکشش اور سحر انگیز مضامین لائے جن سے سامعین کے ذہن ودماغ کے تار جھنجھنا اٹھیں، دل کی تشنگی اپنے شباب پر آ جائے اور قلب وذہن پورے شوق ورغبت کے ساتھ اصل مضمون کی طرف متوجہ ہو جائیں، امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کی تشبیب اس معیار پر پوری اترتی ہے اور ان کے جذبۂ شوق اور سوز دروں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ مہارت اور فنی عظمت وجلالت کو بے نقاب کرتی نظر آتی ہے۔

(۲) دوسرا جز ''گریز'' ہے، جو تیرہویں شعر ''اِنِّی اتَّھَمْتُ نَصِیحَ الشَّیْبِ فِی عَذَلِی'' سے شروع ہو کر اٹھائیسویں شعر:

وَلَا تَزَوَّدْتُ قَبْلَ الْمَوْتِ نَافِلَةً — وَلَمْ اُصَلِّ سِوَیٰ فَرْضٍ وَلَمْ اَصُمِ

پر ختم ہوتا ہے، اس کے اندر امام بوصیری نے نفس کی شرارت، گمرہی، بے راہ روی کی بیماریوں اور

ان سے حفاظت کے نسخے اوراحتیاطی تدابیر بیان فرمائی ہیں، اس میں اگرچہ آپ نے براہ راست تو اپنے نفس کونشانہ بنایا ہے، مگراس کے ضمن میں حکمت وموعظت کی وہ اَن مول باتیں بیان فرمائی ہیں جو ہرایک کے لیے نہایت موثر وعظ اور نسخۂ کیمیا ہے، اس کا مقصد قاری وسامع کے فکرواحساس کو''نعت نبوی'' کے لیے تیار کرنا ہےاوردرحقیقت نعت نبوی ہے بھی ایسی چیز کہ جس کے لیے فکروشعور کو پہلے ہی سے پاکیزہ کرلیا جائے، قلب وجگر کوآبِ توبہ وندامت سے غسل دیا جائے، نفس کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا جائے اور ہرطرح کی کدورتوں، نجاستوں اورآلودگیوں سے پاک اورمنزہ کرلیا جائے، پھربھی صحیح معنوں میں اس کا حق ادانہ ہو، بقول بلبل شیراز:

ہزار بار بشُویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

(۳) قصیدہ کا تیسرا بنیادی اوراہم جز مدحِ سرکاراورنعتِ محبوبِ پروردگار ہے، اس کا آغاز انتیسویں شعر:

ظَلَمْتُ سُنَّةَ مَنْ اَحْيَى الظَّلَامَ اِلىٰ اَنِ اشْتَكَتْ قَدَمَاهُ الضُّرَّ مِنْ وَّرَمِ

سے ہوتا ہےاور۱۵۵ویں شعر:

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَ ضَرَّتَهَا وَ مِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

پر اس کا اختتام ہوجاتا ہے، اس میں حضور اقدس ﷺ کے اوصاف وکمالات، آیات و معجزات، آپ کے اعوان وانصاراوراصحابِ ابراراوراخیار کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

(۴) اس قصیدہ کا چوتھا اورآخری جز''خاتمہ'' ہے، جو ۱۵۶ویں شعر:

يَا نَفْسُ لَا تَقْنَطِيْ مِنْ زَلَّةٍ عَظُمَتْ اِنَّ الْكَبَائِرَ فِي الْغُفْرَانِ كَاللَّمَمِ

سے شروع ہوتا ہےاورقصیدہ کے آخرتک اسی کا سلسلہ چلتا ہےاوراس کے اختتام کے ساتھ قصیدہ بھی اختتام پذیر ہوجاتا ہے۔

قصیدۂ بردۃ المدیح کا فکری تجزیہ

قصیدۂ بردہ شریف کا اصل موضوع ذاتِ نبوی اور حبِ نبوی ہے، اسی بنا پر امام بوصیری نے اس میں سرکار کی ذات وصفات، محاسن وکمالات، اخلاق وعادات، نمایاں خصوصیات، معجزات وآیات کا ایک منظوم خاکہ کھینچا ہے جس سے مذکورہ بالا اشیا کے تعلق سے ان کے افکار وعقائد کا نقشہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے، ذیل میں اسی موضوع پر کچھ خامہ فرسائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باعثِ تخلیقِ کائنات:

سرکارِ مصطفیٰ ﷺ باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں، آپ نہ ہوتے تو کائنات نہ ہوتی، ساری کائنات اپنے وجود میں آپ کی محتاج ہے، کیوں نہ ہو کہ آپ وجودِ کائنات کے سبب اور علت ہیں۔

حاکم وبیہقی نے روایت کیا: کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے عرش کے کھمبوں پر ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھا ہوا دیکھا اور اپنی لغزش کی معافی کے لیے حضور اکرم ﷺ کو وسیلہ بنایا تو اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

سَأَلْتَنِي بحقهِ أن أغفِرَ لک ، وقد غَفَرْتُ لک، ولولاہ ماخلقتک.

(اے آدم!) تو نے محمد (ﷺ) کے وسیلہ سے مجھ سے اپنی بخشش کی درخواست کی ہے، میں نے تجھے بخشا اور اگر محمد (ﷺ) نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا نہ کرتا)۔

مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہوا کہ سرکار باعثِ تخلیق آدم ہیں، تو آدم علیہ السلام کا

وجودِ سرکار کے وجود پر موقوف ہے، آدم علیہ السلام ابوالبشر اور ساری مخلوقِ انسانی کی اصل ہیں، شمس و قمر، لیل و نہار غرضیکہ دنیا کی ساری چیزیں انسان کے لیے پیدا کی گئیں، ارشاد ہے:

"خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعاً" (البقرۃ:۲۹)

(اس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے)۔

"وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ" (ابراہیم:۳۳)

(اور اس نے تمہارے لیے سورج اور چاند مسخر کیے جو برابر چل رہے ہیں اور تمہارے لیے رات اور دن مسخر کیے)۔

جب دنیا کی ساری چیزیں انسان کی وجہ سے پیدا کی گئیں اور انسانوں کے باپ ابوالبشر آدم علیہ السلام کی تخلیق سرکارِ مصطفےٰ ﷺ کی وجہ سے ہوئی تو ثابت ہوا کہ سرکار باعثِ تخلیق کائنات ہیں۔ امام بوصیری نے قصیدۂ بردہ میں اس فکر کو یوں پیش فرمایا:

وَكَيْفَ تَدْعُوْ اِلَى الدُّنْيَا ضَرُوْرَةُ مَنْ

لَوْلَاهُ لَمْ تَخْرُجِ الدُّنْيَا مِنَ الْعَدَمِ

ترجمہ: (اگر وہ نہ ہوتے تو دنیا خود عدم سے وجود میں نہ آتی، تو ضرورت انہیں اس دنیا کا طالب کیا بنا سکے گی۔)

حقیقتِ محمدیہ کا ادراک ناممکن:

ساری مخلوق حقیقتِ محمدیہ کے ادراک سے عاجز و قاصر ہے، کوئی شخص خواہ وہ حضور سے قریب زمانے کا یا بعید زمانے کا، دور کا رہنے والا ہو یا نزدیک کا، بلند رتبہ ہو یا پست رتبے والا، آپ کی حقیقت کو اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتا۔

خود سرکار نے اپنے سب سے قریب صحابی، خلیفۂ اول سیدنا صدیق اکبر کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

"يَا اَبَا بَكْرٍ! لَمْ يَعْرِفْنِي حَقِيْقَةً غَيْرُ رَبِّي"

کے سوا کسی کو نہیں معلوم)۔

(اے ابوبکر! میری حقیقت میرے پروردگار کے سوا کسی کو نہیں معلوم)۔

اگر زیادہ گہرے جایئے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے دنیوی وجود کو دیکھنے والے بھی اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے خاص کر رکھا ہے جہاں کسی نبیِ مرسل یا ولیِ مقرب کی رسائی نہیں اور انہوں نے اگر چہ آپ کو دیکھا مگر آپ کے اصلی مرتبہ کو نہیں جان سکے، جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے جس نے ان کو یہ مرتبہ بخشا ہے اور ان کا یہ دیکھنا بھی ایسا ہے جیسے کوئی خواب دیکھے: ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

امام بوصیری تشبیہات و تمثیلات کی روشنی میں اسی فکر و عقیدہ کی یوں ترجمانی کرتے ہیں:

اَعْیَی الْوَرٰی فَهْمُ مَعْنَاهُ فَلَیْسَ یُرٰی	لِلْقُرْبِ وَالْبُعْدِ مِنْهُ غَیْرُ مُنْفَحِمِ
کَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَیْنَیْنِ مِنْ بُعُدٍ	صَغِیْرَةً وَتُکِلُّ الطَّرْفَ مِنْ أَمَمِ
وَکَیْفَ یُدْرِکُ فِی الدُّنْیَا حَقِیْقَتَهٗ	قَوْمٌ نِیَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

ترجمہ: (آپ کی حقیقت کے ادراک نے ساری خلقت کو عاجز کر دیا تو دور و نزدیک کہیں ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو عاجز نہ ہو۔ جیسے سورج دور سے آنکھوں کو چھوٹا نظر آتا ہے اور قریب سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ وہ خوابیدہ افراد آپ کی حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں جنہوں نے ایک تصور و خیال ہی سے تسلی کر لی ہے۔)

سرکار کے لامحدود فضائل و کمالات:

سرکار کے فضائل و کمالات بے حد و بے شمار ہیں، ان کی کوئی انتہا نہیں، یہ بات صرف جوشِ عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ آپ کی زندگی کی آنے والی گھڑیاں گزشتہ گھڑیوں سے بہتر ہیں اور آپ کی آخرت دنیا سے بہتر ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ۝ (الضحیٰ: ۴)

(بے شک پچھلی تمہارے لیے پہلی سے بہتر ہے)۔ (کنز الایمان)

صدر الافاضل، فخر الاماثل علامہ نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یعنی آخرت دنیا سے بہتر، کیوں کہ وہاں آپ کے لیے مقام محمود وحوضِ مورود وخیرِ موعود اور تمام انبیا ورسل پر تقدم اور آپ کی امت کا تمام امتوں پر گواہ ہونا اور شفاعت سے مومنین کے مرتبے اور درجے بلند ہونا اور بے انتہا عزتیں اور کرامتیں ہیں جو بیان میں نہیں آتیں، اور مفسرین نے اس (آیت) کے یہ معنی بھی بیان فرمائے ہیں کہ آنے والے احوال آپ کے لیے گزشتہ احوال سے بہتر ہیں، گویا حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ روز بروز آپ کے درجے بلند کرے گا، اور عزت پر عزت اور منصب پر منصب زیادہ فرمائے گا اور ساعت بساعت آپ کے مراتب ترقیوں میں رہیں گے"۔ (تفسیر خزائن العرفان، سورۃ الضحیٰ)

سارے علما و مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس دنیا سے حیاتِ ناسوتی کے منقطع ہو جانے کے بعد بھی آپ کی روحانی ترقیات جاری ہیں اور تا قیامت جاری رہیں گی، حدو انتہا تو اس شے کی ہوتی ہے جو ایک حد پر رک جائے اور آگے بڑھنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے، مگر یہاں تو ترقی کا سفرِ مسلسل جاری ہے، اسی لیے آپ کے فضائل و کمالات اور بلندیوں و عظمتوں کی کوئی حد نہیں۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ اسی فکر کو یوں پیش کرتے ہیں:

فَاِنَّ فَضْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ لَیْسَ لَہٗ　　حَدٌّ فَیُعْرِبَ عَنْہُ نَاطِقٌ بِفَمٖ

(رسول اللہ ﷺ کے فضل و کمال کی کوئی حد نہیں کہ کوئی بولنے والا اپنی زبان سے بیان کر سکے)۔

وسعتِ علمِ نبوی:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو بے پناہ علوم و معارف سے نوازا، تخلیقِ کائنات سے قیامِ قیامت تک بلکہ جنتیوں کے جنت اور دوزخیوں کے دوزخ میں

داخل ہونے تک کے علوم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے اور اس کے علاوہ کیا کیا علوم آپ کو عطا ہوئے دینے والا خدا جانے اور لینے والے نبی جانیں، اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ سرکار کا علم اتنا وسیع ہے کہ لوح وقلم کے علوم اس کا ایک حصہ ہیں۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ ، فَقَالَ اُكْتُبْ ، قَالَ مَا أَكْتُبُ، قَالَ اُكْتُبْ مَقَادِيْرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ. (شرح البردة للباجوری، ص۷۶)

(سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا فرمایا، پھر ارشاد فرمایا، لکھ، قلم نے کہا: کیا لکھوں؟ فرمایا قیامت تک پیدا ہونے والی سبھی چیزوں کی مقداریں لکھ)۔

تفسیر خازن میں زیرِ آیت کریمہ ''وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝'' (الانعام:۵۹) (اور نہیں کوئی تر اور خشک جو روشن کتاب میں نہ لکھا ہو) یوں ہے:

''والثاني أن المراد بالكتاب المبين هو اللوح المحفوظ لأن الله كتب فيه علمَ ما يكون وماقد كان قبل أن يخلق السمٰوٰت والأرض''۔

(دوسری توجیہ یہ ہے کہ کتاب مبین سے لوح محفوظ مراد ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جو کچھ ہوگا اور جو کچھ ہو چکا آسمان وزمین کی تخلیق سے پہلے ہی لکھ دیا ہے)۔

اس سے ثابت ہوا کہ لوحِ محفوظ میں ماضی، حال اور مستقبل سبھی زمانوں کے احوال و کوائف کا روشن بیان ہے، جسے ہم ''علم ما کان وما یکون'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور قرآن کریم میں سرکار کی وسعتِ علمی کو یوں بیان کیا گیا: ''اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝'' (سورۃ الرحمٰن:۱-۴)۔ (رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا، انسانیت کی جان محمد ﷺ کو پیدا کیا اور انہیں ما کان وما یکون کا بیان سکھایا)۔

تفسیر خازن میں اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں ہے:

''قيل أراد بالانسان محمداً صلى الله تعالىٰ عليه وسلم. علّمهُ

البیانَ یعنی بیان ما کان وما یکون لأنه علیه السلام نبیٔ عن خبر الأولین والآخرین وعن یوم الدین ''۔

(کہا گیا ہے انسان سے مراد محمد ﷺ ہیں، کہ ان کو اگلے پچھلے امور کا بیان سکھا دیا گیا، کیوں کہ حضور کو گزشتہ اور آئندہ کے احوال اور روزِ قیامت سے باخبر کر دیا گیا)۔

اور قرآن کریم میں سرکار کے حوالہ سے یہ واضح بیان بھی موجود ہے:

وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْماً۝ (النساء:۱۱۳)

(اور تم کو سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے)۔

تفسیر جلالین میں اس کی تفسیر یوں ہے:

''أي من الأحکام والغیب'' (یعنی احکام اور غیب کا علم تمہیں دیا گیا)۔

تفسیر حسینی میں بحر الرائق کے حوالہ سے کچھ اور واضح بیان موجود ہے:

''آں علم ما کان وما یکون ہست کہ حق سبحانہٗ در شبِ اسرا بداں حضرت عطا فرمود، چنانچہ در حدیثِ معراج ہست کہ من در زیر عرش بودم، قطرہ در حلق من ریختند فَعَلِمْتُ مَاکَانَ وَمَا یَکُوْنُ ''۔

(یہ ما کان وما یکون کا علم ہے کہ حق تعالیٰ نے شبِ معراج حضور علیہ السلام کو عطا فرمایا، چنانچہ معراج کی حدیث میں ہے کہ ہم عرش کے نیچے تھے، ایک قطرہ ہمارے حلق میں ڈالا، تو ہمیں گزشتہ وآئندہ کے سارے امور معلوم ہو گئے)۔

مذکورہ بالا آیات وتفاسیر کی روشنی میں درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) لوح محفوظ میں ابتدائے آفرینش سے قیام قیامت تک کے امور درج ہیں۔ (ب) سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علم ما کان وما یکون عطا کیا گیا۔ (ج) حضور کو احکام کے علم کے ساتھ امورِ غیبیہ کا بھی علم عطا کیا گیا۔ تو سرکار کا علم پاک آئندہ، موجودہ اور گزشتہ امور کو محیط ہے۔

بلکہ سرکار اقدس ﷺ کے وسعتِ علم کا تو یہ عالم ہے کہ ما کان وما یکون کا علم اور لوح و قلم کا علم تو اس بحرِ زخار کا صرف ایک حصہ ہے۔

ملک العلماء، بحر العلوم علامہ عبد العلی فرنگی محلی لکھنوی علیہ الرحمہ حاشیہ شرح میر زاہد بر رسالہ قطبیہ کے خطبہ میں لکھتے ہیں:

"و علمه علوما بعضها ما احتوىٰ عليه القلم الأعلىٰ و ما استطاع علىٰ احاطتها اللوح الأدنى، لم يلد الدهر مثله من الأزل و لم يولد الى الأبد، فليس له في السموٰت و الأرض كفواً احد"۔

(الدولۃ المکیۃ للامام احمد رضا القادری، ص ۲۹۰، مطبوعہ ارشد برادرس، دہلی)

(اور انہیں بعض وہ علوم سکھائے جن کا احاطہ نہ قلم کر سکا اور نہ لوحِ محفوظ، زمانہ نے روزِ ازل سے ہی نہ ان کے جیسا پیدا کیا، نہ ابد تک ویسا پیدا ہو، تو سارے آسمانوں اور زمین میں کوئی ان کا ہمسر نہیں)۔

سرکارِ اقدس ﷺ کی اسی وسعتِ علمی کو امام بوصیری علیہ الرحمہ نے قصیدۂ بردہ میں یوں بیان کیا ہے:

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِکَ الدُّنْیَا وَضَرَّتَهَا   وَمِنْ عُلُوْمِکَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

(اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا و آخرت آپ کی بخشش کا اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے)۔

علم غیب:

غیب کا علم ہونا نبی کا لازمہ ہے، قرآن کریم کی آیات، احادیث اور سلف صالحین کے اقوال سے نبی کا غیب داں ہونا ثابت ہے، خود عربی لغات کے مطالعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے استاذِ ادب مولانا عبد الحفیظ بلیاوی اپنی کتاب

''مصباح اللغات'' میں لکھتے ہیں:

''اَلنَّبِيْءُ وَ النَّبِيُّ: اللہ تعالیٰ کے الہام سے غیب کی باتیں بتانے والا، آئندہ کی پیشین گوئی کرنے والا، خدا کی طرف سے پیغام بر''۔ (ص ۸۴۷، مکتبہ برہان، دہلی)

o قرآن کریم میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ. (آل عمران:۱۷۹)

ترجمہ: (اللہ کی شان یہ نہیں کہ (اے عام لوگو) وہ تمہیں غیب کا علم دے، ہاں! اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے (اس کے لیے) چن لیتا ہے۔)

o دوسری آیت میں یوں ہے:

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا o اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (سورۂ جن:۲۶)

ترجمہ: (تو اللہ اپنے غیب پر اپنے پسندیدہ رسولوں کے سوا کسی کو مسلط نہیں کرتا۔)

اس آیت کی تفسیر، تفسیرِ خازن میں کچھ اس طرح ہے:

الّا من یصطفیه لرسالته ونبوته فیظهر علیٰ من یشاء من الغیب حتّیٰ یستدلّ علیٰ نبوته بما یخبر به من المغیبات فیکون ذٰلک معجزةً له.

(سوا اس کے جس کو اپنی رسالت ونبوت کے لیے چن لے، تو جسے چاہتا ہے اپنے غیب پر مُطّلع کر دیتا ہے تاکہ ان غیبی چیزوں سے جن کی وہ خبر دیتے ہیں ان کی نبوت پر دلیل پکڑی جائے، تو یہ ان کا معجزہ ہوتا ہے)۔

o تیسری آیت یہ ہے:

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ o (التکویر:۲۴) (اور یہ نبی غیب بتانے میں بخیل نہیں۔)

تفسیر معالم التنزیل میں اس آیت کی تشریح کچھ اس طرح ہے:

عَلَى الْغَيْبِ وَخَبَرِ السَّمَاءِ وَمَا اُطْلِعَ علیه من الأخبار والقصص بِضَنِيْنٍ: اي

بل یُعلِمکم وَ یُخبِرُکم ولا یبخل. یقول انہ یأتیہ علمُ الغیب فلا یبخلُ بہ علیکم بل یُعلِمکم وَ یُخبِرُکم ولا یکتمہُ کما یکتم الکاھنُ.

(حضور ﷺ علم غیب، آسمانی خبروں اور ان خبروں اور واقعات کے سلسلہ میں بخیل نہیں جن سے وہ باخبر ہوتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ آپ کے پاس علم غیب آتا ہے تو آپ اس کے بارے میں تم سے بخل نہیں کرتے، بلکہ تمہیں بتاتے اور خبر دیتے ہیں)۔

حدیثوں سے بھی ثابت ہے کہ سرکار کو بارگاہِ خداوندی سے علم غیب کی دولت ملی اور آپ نے مناسب موقع پر اپنے امتیوں کو اس سے باخبر بھی فرمایا:

٥ حضرت ثوبان ﷺ سے روایت ہے کہ سرکارِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ زَوّٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَأَیْتُ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا.

(مشکوٰۃ المصابیح، باب فضائل سید المرسلین، ج ۲، ص ۵۱۲، مطبوعہ مجلس برکات، مبارک پور)

(اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین سمیٹ دی تو میں نے زمین کے تمام مشرقوں اور مغربوں کو دیکھ لیا)۔

٥ ''صاحبِ سِرِّ رسول'' حضرت حذیفہ بن یمان ﷺ سے روایت ہے:

قام فینا رسول اللہ ﷺ مقاماً، وماترک شیئاً مما یکون فی مقامہ ذلک الیٰ قیام الساعۃ الّا حدّثنا بہ، حفظہ من حفظہ ونسیہ من نسیہ.

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الفتن، فصل اول، ج ۲، ص ۴۶۱)

(ایک دن سرکارِ اقدس ﷺ خطبہ دینے کے لیے ہمارے درمیان کھڑے ہوئے، آپ نے قیامت تک ہونے والے تمام واقعات کا ذکر فرمایا، جس کو کچھ صحابہ نے یاد رکھا اور کچھ نے بھلا دیا)۔

٥ حضرت حذیفہ ہی سے روایت ہے:

واللہ ماترک رسول اللہ من قائد فتنۃ الیٰ أن تنقضي الدنیا یبلغ من معہٗ ثلاث مائۃ فصاعداً الّا قد سمّاہ باسمہٖ واسم أبیہ و قبیلتہٖ.

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الفتن، فصل ثانی، ج ۲، ص ۴۶۳)

(خدا کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے قیامت تک برپا ہونے والے تمام فتنوں کے قائدین جن کے پیروکاروں کی تعداد تین سو یا اس سے زائد پہنچ چکی تھی کا نام بھی بتایا، اس کے باپ اور قبیلہ کا نام بھی بتایا)۔

o امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں حضرت ابوزید عمرو بن اخطب سے ایک جامع حدیث روایت کرتے ہیں، اس کا متن مع ترجمہ ہدیۂ قارئین ہے:

قَالَ (اَبُوْزَیْد) صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْفَجْرَ وَصَعِدَ الْمِنبَرَ فَخَطَبَنَا حَتّٰی حَضِرَتِ الظُّھْرُ فَنَزَلَ فَصَلّٰی ثُمَّ صَعِدَ الْمِنبَرَ فَخَطَبَنَا حَتّٰی حَضِرَتِ الْعَصْرُ ثُمَّ نَزَلَ وَ صَلّٰی ثُمَّ صَعِدَ الْمِنبَرَ حَتّٰی غَرُبَتِ الشَّمْسُ وَاَخْبَرَنَا بِمَا کَانَ وَبِمَا ھُوَ کَائِنٌ وَاَعْلَمُنَا اَحْفَظُنَا. (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۹۰)

("ابوزید عمرو بن اخطب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی، اس کے بعد منبر پر تشریف لے گئے اور ہمیں خطبہ دینا شروع کیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا، حضور منبر سے نیچے تشریف لائے اور ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی اس کے بعد پھر حضور منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ دینا شروع کیا، یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا، حضور منبر سے نیچے تشریف لائے اور ہمیں عصر کی نماز پڑھائی پھر حضور منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ صحابی فرماتے ہیں کہ حضور نے اپنے اس مفصل اور طویل خطبہ میں جو ہو چکا تھا اور جو آئندہ ہونے والا ہے، اس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا، جتنا زیادہ کسی کو وہ خطبہ یاد ہے اتنا ہی وہ سب سے بڑا عالم ہے۔")

o حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت فاروق اعظم ﷺ سے درج ذیل حدیث روایت کی ہے:

عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ

وَسَلَّمَ مَقَامًا فَاَخْبَرَنَا عَنْ بَدْءِ الْخَلْقِ حَتّٰی دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ مَنَازِلَهُمْ وَاَهْلُ النَّار مَنَازِلَهُمْ حَفِظَ ذٰلِکَ مَنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مَنْ نَسِيَهُ.

(مشکوٰۃ المصابیح، ج۲، ص۵۰۶، مطبوعہ مجلس برکات، مبارک پور)

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک روز سرکارِ دوعالم ﷺ ایک جگہ قیام فرما ہوئے (اور خطبہ ارشاد فرمایا) اس میں ہمیں ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک جب اہلِ جنت اپنی منزلوں میں فروکش ہوں گے اور دوزخی جہنم کی آگ میں جل رہے ہوں گے ہمیں تمام حالات کی خبر دی، یاد رکھا ان ارشاداتِ نبوت کو جس نے یاد رکھا اور بھلا دیا انہیں جس نے بھلا دیا۔)

○ حضرت عبدالرحمٰن بن عائش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَيْتُ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ فِي اَحْسَنِ صُوْرَةٍ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰى؟ قُلْتُ اَنْتَ اَعْلَمُ، قَالَ فَوَضَعَ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ فَوَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (ایضاح ۱، ص۷۰)

(رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آج میں نے اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی زیارت کی، بڑی حسین اور پیاری صورت میں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ملاءِ اعلیٰ کے مکین (فرشتے) کس بات پر جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے عرض کی: اے اللہ تو ہی خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی جس کی ٹھنڈک میں نے سینے میں محسوس کی، پھر میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں میں تھا اور زمین میں تھا۔)

اس حدیث پاک کی تشریح کرتے ہوئے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ کی شرح أَشِعَّةُ اللَّمعَات میں تحریر فرماتے ہیں:

"پس دانستم ہر چہ در آسمانہا و ہر چہ در زمینہا بود، عبارتست از حصول تمامۂ علوم جزوی و کلی و احاطۂ آں"۔

(پس جو چیز آسمانوں میں تھی اسے بھی میں نے جان لیا اور جو چیز زمینوں میں تھی اسے بھی میں نے جان لیا، (پھر فرماتے ہیں) کہ اس ارشادنبوی کا مقصد یہ ہے کہ تمام علوم جزوی وکلی مجھے حاصل ہوگئے اور ان کا میں نے احاطہ کرلیا)۔

علامہ ملاعلی قاری علیہ الرحمہ اپنی کتاب مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں پہلے اس حدیث پاک کا مفہوم بیان کرتے ہیں، اس کے بعد شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی کا قول نقل کرتے ہیں، میں یہاں اختصار کوملحوظ رکھتے ہوئے صرف علامہ ابن حجر کے قول پر اکتفا کرتا ہوں:

قَالَ ابْنُ حَجَرٍ اَیْ جَمِیْعَ الْکَائِنَاتِ الَّتِیْ فِی السَّمٰوٰتِ بَلْ وَمَا فَوْقَھَا ......وَالْاَرْضِ، ھِیَ بِمَعْنَی الْجِنْسِ: اَیْ وَجَمِیْعَ مَا فِی الْاَرْضِ السَّبْعِ وَمَا تَحْتَھَا ...... یَعْنِیْ اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَرٰی اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَکَشَفَ لَہٗ ذٰلِکَ وَفَتَحَ عَلَیَّ اَبْوَابَ الْجَنَّۃِ. (مرقاۃ المفاتیح، ج۱،۴۶۳)

(علامہ ابن حجر نے فرمایا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات جوآسمانوں میں تھی بلکہ ان کے اوپر بھی جو کچھ تھا، اور جو کائنات ساتوں زمینوں میں تھی بلکہ ان کے نیچے بھی جو کچھ تھا وہ میں نے جان لیا، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کوتو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی تھی اور اسے آپ پر منکشف کیا تھا اور مجھ پر اللہ تعالیٰ نے غیب کے دروازے کھول دیے ہیں۔)

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

وَضَعَ کَفَّہٗ بَیْنَ کَتِفَیَّ قَدْ وَجَدْتُ بَرْدَ اَنَامِلِہٖ بَیْنَ ثَدْیَیَّ فَتَجَلّٰی لِیْ کُلُّ شَیْءٍ وَعَرَفْتُ.

(اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے کندھوں کے درمیان رکھا اور دست قدرت کی انگلیوں کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی، پس ہر چیز میرے لیے واضح ہوگئی اور ان کو میں نے پہچان لیا۔)

ممکن ہے اس حدیث کی سند کے بارے میں کسی کو شک ہو، اس لیے اس کے متعلق مشکوٰۃ کے مصنف کی رائے غور سے سنیے جو انہوں نے یہ حدیث متعدد طرق سے نقل کرنے کے بعد تحریر کی ہے، اگر دل میں حق پذیری کا جذبہ موجود ہوا تو بفضلہٖ تعالیٰ یقیناً تسلی ہو جائے گی:

رواه أحمد والترمذي وقال حسنٌ صحيحٌ وسألتُ محمدبن إسمعيل البخاري عن هذا الحديث فقال هذا حديثٌ صحيحٌ.

(مشکوٰۃ المصابیح، ج ۲،۱۷، مطبوعہ مجلس برکات، مبارک پور)

"اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے متعلق امام بخاری سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے"۔

مذکورہ بالا دلائل وشواہد سے واضح ہو گیا کہ سرکارِ اقدس ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے علم غیب عطا فرمایا ہے اور آپ نے اپنے صحابہ کو امورِ غیبیہ سے باخبر بھی فرمایا اور اس میں کسی بخل اور کنجوسی سے کام نہیں لیا، پھر آپ نے جو اطلاع دی وہ واقع کے عین مطابق ثابت ہوئی، غیبی خبروں کے تعلق سے سرکارِ اقدس ﷺ سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں، امام قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمہ شفا شریف میں لکھتے ہیں:

هٰذا بحرٌ لا يُدرَكُ قَعرُهُ وَلا يُنزَفُ غَمرُهُ.

(اس موضوع سے متعلق جو احادیث ہیں) وہ اپنی کثرت میں اس سمندر کی طرح ہیں جس کی تہ کو نہیں پہنچا جا سکتا اور جس کا پانی نہیں نکالا جا سکتا۔

امام بوصیری علیہ الرحمۃ والرضوان نے اسی اسلامی فکر وعقیدہ کو یوں بیان کیا ہے:

تَبارَکَ اللّٰهُ مَا وَحيٌ بِمُكتَسَبٍ وَلا نَبِيٌّ عَلىٰ غَيبٍ بِمُتَّهَمِ

(اللہ پاک ومنزہ ہے، وحی کوئی کسبی چیز نہیں اور کسی نبی کو غیب کی (ضروری) بات

چھپانے کا الزام نہیں دیا جا سکتا)۔

شفاعت اور دست گیری:

روزِ محشر اولین و آخرین کے مجمع میں سرورِ کائنات ﷺ کی بے مثال عزت افزائیاں ہوں گی، انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کو بابِ شفاعت وا کرنے کی اجازت بارگاہِ رب العالمین سے ملے گی اور آپ اس وقت اپنے پریشان حال امتیوں کی دست گیری فرمائیں گے اور ان کی پریشانیاں دور فرمائیں گے۔

ترمذی شریف میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، اسی میں ہے کہ سرکار نے فرمایا:

"وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَ اَوَّلُ مُشَفَّعٍ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ، وَلاَ فَخْرَ".

(سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا، سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی، میں بطورِ فخر نہیں کہہ رہا ہوں)۔

ابن ماجہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خُیِّرْتُ بَیْنَ اَنْ یَّدْخُلَ نصفُ أمتي الجنة و بين الشفاعةِ فاخترتُ الشفاعةَ لأنّها أعمُّ، أَتَرَوْنَهَا للمتقين؟ لا، ولكنّها للمذنِبِيْن الخطّائِيْن".

(اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا کہ یا میں اپنی نصف امت کو جنت میں داخل کرا لوں یا شفاعت کروں، میں نے شفاعت کو پسند کیا، کیوں کہ شفاعت کا فیضان عام ہے، پھر فرمایا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ شفاعت پرہیز گاروں کے لیے ہوگی؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ گناہ گاروں اور خطا کاروں کے لیے ہوگی)۔

امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے اپنی صحیحین میں حدیث شفاعت کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے بالتفصیل بیان کیا ہے، یہ حدیث مبارک قارئین کی

خدمت میں پیش ہے:

''جب لوگ میدانِ حشر میں جمع ہوں گے تو سورج ان کے سروں کے بالکل نزدیک ہوگا، لوگ ناقابلِ برداشت غم واندوہ میں مبتلا ہوں گے، طویل انتظار کے بعد ان کو یارائے صبر نہ رہے گا، وہ آپس میں مشورہ کریں گے اور کہیں گے کہ کیا تم کسی ایسی ہستی کے پاس نہیں چلتے جو تمہارے لیے خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں شفاعت کرے، چنانچہ وہ سب ابوالانبیاء آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور یوں عرض گزار ہوں گے:

أَنْتَ اٰدَمُ اَبُو الْبَشَرِ خَلَقَکَ اللّٰہُ بِیَدِہٖ وَنَفَخَ فِیْکَ مِنْ رُوْحِہٖ وَأَسْکَنَکَ جَنَّۃً وَأَسْجَدَ لَکَ مَلَائِکَتَہٗ وَعَلَّمَکَ اَسْمَآءَ کُلِّ شَیْءٍ. اِشْفَعْ لَنَا عِنْدَ رَبِّکَ حَتّٰی یُرِیْحَنَا مِنْ مَکَانِنَا، اَلَا تَرٰی مَا نَحْنُ فِیْہِ.

(آپ آدم ہیں، ساری نوعِ انسانی کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دستِ قدرت سے تخلیق فرمایا اور آپ میں اپنی روح پھونکی، پھر آپ کو جنت میں بسایا، تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کو سجدہ کریں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اشیا کے نام سکھائے، اے بڑی شان والے ہمارے پدرِ بزرگوار! ازراہِ عنایت ہمارے لیے بارگاہِ ربّ العزت میں شفاعت کیجیے تاکہ اس تکلیف دہ موقف سے ہمیں رہائی نصیب ہو، کیا آپ ملاحظہ نہیں فرمارہے کہ ہم کس کرب وغم میں مبتلا ہیں)۔

آدم علیہ السلام فرمائیں گے، میرا رب آج بہت غضب ناک ہے، وہ اس سے پہلے اتنا غضب ناک کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ آج کے بعد وہ کبھی اتنا غضب ناک ہوگا، اللہ تعالیٰ نے مجھے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا، مگر مجھ سے لغزش ہوگئی، نفسی نفسی اذھبوا الیٰ غیری، یعنی مجھے تو آج اپنی فکر ہے، شفاعت کی التجا کرنے کے لیے کسی اور کے پاس جاؤ''۔

پھر سارے لوگ نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے:

اَنْتَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلٰٓی اَھْلِ الْاَرْضِ وَسَمَّاکَ اللّٰہُ عَبْدًا شَکُوْرًا، اَلَا

تَرٰی مَا نَحْنُ فِیْہِ ؟ اَلا تَرٰی مَا بَلَغَنَا اَلا تَشْفَعُ لَنَا اِلیٰ رَبِّکَ.

(اے نوح علیہ السلام ! آپ اہل زمین کی طرف سب سے پہلے رسول بنا کر بھیجے گئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''عَبْدًا شَکُوْرًا'' (شکر گزار بندہ) کا لقب عطا فرمایا، کیا آپ ملاحظہ نہیں فرما رہے کہ ہم کس مصیبت میں مبتلا ہیں؟ کیا آپ اپنے رب کی بارگاہ میں ہمارے لیے شفاعت نہیں کریں گے؟)

حضرت نوح علیہ السلام جواب دیں گے: ''آج میرا پروردگار از حد غضب ناک ہے، اتنا غضب ناک نہ وہ کبھی پہلے ہوا تھا اور نہ آئندہ ہوگا، نفسی نفسی: مجھے تو آج اپنی ذات کی فکر ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک دعا مانگنے کا حق دیا تھا جو وہ ضرور قبول فرمائے گا، میں نے اپنا یہ حق استعمال کر لیا ہے اور اپنی قوم کی بربادی کی دعا مانگی ہے، اب میں اللہ کی بارگاہ میں شفاعت کے لیے لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا، کسی اور کے پاس جاؤ، حضرت ابراہیم کے پاس جاؤ، وہ اللہ کے خلیل ہیں۔

پھر سارے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور بڑے ادب سے عرض کریں گے:

اَنْتَ نَبِيُّ اللّٰہِ وَخَلِیْلُہٗ مِنْ اَھْلِ الْاَرْضِ اِشْفَعْ لَنَا اِلیٰ رَبِّکَ. أَلاَ تَرٰی مَا نَحْنُ فِیْہِ.

(آپ اللہ کے نبی ہیں اور تمام اہل زمین میں سے اللہ کے خلیل ہیں، از راہِ نوازش اپنے خداوند کریم کی بارگاہ میں ہمارے لیے شفاعت کریں، کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس مصیبت میں مبتلا ہیں)۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام بھی وہی جواب دیں گے کہ آج میرا رب از حد غضب ناک ہے، میں تمہارے لیے شفاعت نہیں کر سکتا، مجھے تو آج اپنی جان کی فکر ہے، موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، وہ کلیم اللہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں، ان کو اللہ نے تورات جیسی

کتاب مرحمت فرمائی ہے اوران کو قریب بلا کران سے سرگوشی کی ہے، ساری مخلوق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی عرضداشت بصد ادب پیش کرے گی، آپ بھی معذرت کریں گے کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کیوں کہ وہ کلمۃ اللہ اورروح اللہ ہیں۔

پس سب لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی حالتِ زار بیان کریں گے اوران سے درخواست کریں گے کہ بارگاہِ الٰہی میں وہ ان کی شفاعت کریں۔

آپ بھی معذرت فرمائیں گے،لیکن اللہ تعالیٰ کی پریشان حال اورغم واندوہ سے نڈھال مخلوق کوایک ایسے کریم اورمحبوب کا پتہ بتائیں گے،جس کے دروازے پرآنے والا کوئی سائل کبھی محروم نہیں لوٹتا، آپ ان سے کہیں گے کہ محمد عربی کی بارگاہِ بے کس پناہ میں حاضر ہوکر یہ فریاد کرو، کیوں کہ حضور اللہ تعالیٰ کے ایسے برگزیدہ اورمقبول بندے ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اگلوں اور پچھلوں کی خطائیں معاف فرمائی ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ساری مخلوق دردر کی ٹھوکریں کھانے اور ہر دروازہ سے مایوس ہونے کے بعد میرے پاس آکر فریاد کرے گی، تو میں انہیں جواب دوں گا:

اَنَا لَهَا،اَنَا لَهَا (ہاں مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں شفاعت کروں)یعنی اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

رحمتِ عالم ﷺ فرماتے ہیں:

کہ میں وہاں سے چل کرعرش الٰہی کے پاس حاضر ہوں گا اوراپنے رب سے شفاعت کرنے کی اجازت طلب کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے اجازت مرحمت فرمائے گا، جب میں اپنے کریم پروردگار کوعرشِ عظیم پر جلوہ فرما دیکھوں گا تو سجدہ ریز ہو جاؤں گا، اس وقت اللہ تعالیٰ مجھے شرح صدر کی نعمت مرحمت فرمائے گا اور میں اس کے ایسے محامد بیان کروں گا اوراس کی ایسی ثنا وستائش کروں گا کہ آج تک اس طرح میں حمد وثنا نہیں کرسکا تھا، میں دیر تک سجدہ ریز رہوں گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئے گی: يَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَکَ.

سَلْ تُعْطَهُ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ ''اے میرے محبوب! اپنا سر مبارک سجدہ سے اٹھاؤ اور مانگو جو تم مانگو گے میں عطا کروں گا''، شفاعت کرو، جس کی شفاعت کرو گے اس کے بارے میں تمہاری شفاعت قبول ہوگی۔

یہ مژدۂ جانفزا سن کر میں سجدہ سے سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا:

یَارَبِّ اُمَّتِیْ یَارَبِّ اُمَّتِیْ: اے میرے پروردگار میری امت پر رحم فرما اور اس کو نجات دے۔ اے میرے پروردگار میری امت پر رحم فرما اور اس کو نجات دے۔

میرا پروردگار مجھ سے فرمائے گا:

اَدْخِلْ مِنْ اُمَّتِکَ مَنْ لَّا حِسَابَ عَلَیْهِ مِنَ الْبَابِ الْاَیْمَنِ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ.

''جنت کے دروازوں سے دائیں جانب کے دروازے سے اپنے ان امتیوں کو داخل کرو جن سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا۔

اور جنت کے دوسرے دروازوں سے بھی آپ کی امت جنت میں داخل ہوگی۔

حضرت انس سے اس سلسلے میں یہ الفاظ مروی ہیں:

ثُمَّ اَخِرُّ سَاجِدًا یُقَالُ لِیْ یَامُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَکَ وَ قُلْ یُسْمَعْ لَکَ وَ اشْفَعْ تُشَفَّعْ وَ سَلْ تُعْطَهُ. فَاَقُوْلُ یَارَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ، وَ یُقَالُ انْطَلِقْ فَمَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ بُرَّةٍ اَوْ شَعِیْرَةٍ مِنْ اِیْمَانٍ فَاَخْرِجْهُ وَانْطَلِقْ وَافْعَلْ.

(پھر میں اللہ تعالیٰ کی جناب میں سربسجود ہوجاؤں گا، مجھ سے کہا جائے گا اے میرے حبیب اپنا سر مبارک اٹھاؤ تم جو عرض کرو گے میں سنوں گا، تم جس کی شفاعت کرو گے میں شفاعت قبول کروں گا، جو مانگو گے وہ ضرور دیا جائے گا، اس عام اجازت کے بعد میں عرض کروں گا: اے میرے پروردگار میری امت کو بخش دے)۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ رحمت سے یہ جواب ملے گا:

''آپ تشریف لے جایئے اور آپ کے جس امتی کے دل میں گیہوں یا جَو کے

دانے کے برابر بھی ایمان ہے اس کو دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جایئے"۔

حسبِ ارشاد میں جاؤں گا اور ایسے تمام لوگوں کو جن کے دل میں گیہوں یا جو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا ان کو بھڑ کتے ہوئے جہنم سے نکال کر فردوسِ بریں کی بہاروں میں داخل کرادوں گا۔

پھر لوٹ کر میں اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو کر سجدہ ریز ہوں گا، پھر اس کی حمد و ثنا میں مصروف رہوں گا، اللہ تعالیٰ پھر مجھ سے فرمائے گا: اے حبیب! اب عجز و نیاز کی انتہا ہو چکی، اب سجدہ سے سر مبارک اٹھایئے، تم مانگتے جاؤ میں دیتا جاؤں گا، تم کہتے جاؤ میں سنتا جاؤں گا، تم سفارش کرتے جاؤ میں شفاعت قبول کرتا جاؤں گا۔

پھر ارشاد ہوگا ہر وہ شخص جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے اس کو نکال کر جنت میں پہنچاؤ، چنانچہ میں اپنے تمام امتیوں کو جن کے دلوں میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا ان کو فردوسِ بریں میں پہنچادوں گا۔

تیسری مرتبہ پھر یہی صورتِ حال ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ اَدْنٰى اَدْنٰى اَدْنٰى مِنْ مِثْقَالِ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَافْعَلْ.

"اے میرے محبوب! تمہارے جس غلام کے دل میں رائی کے دانے سے بھی کم، بہت کم، بہت کم ایمان ہے اس کو بھی جہنم سے نکال کر جنت میں پہنچادو، چنانچہ میں ایسا ہی کروں گا"۔

چوتھی مرتبہ پھر عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ کی شانِ رفیع کا مالک اللہ کا رسول اور ہمارا آقا پھر سجدہ ریز ہوگا۔ اپنی عاجزانہ التجاؤں سے رحمتِ الٰہی کو پھر اپنی طرف ملتفت کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرمائے گا:

اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ يُسْمَعْ اِشْفَعْ تُشَفَّعْ، سَلْ تُعْطَهْ.

"اے میرے حبیب! اپنا سر مبارک اٹھاؤ: تم کہتے جاؤ میں سنتا جاؤں گا، تم

شفاعت کرتے جاؤ میں شفاعت قبول کرتا جاؤں گا، تم مانگتے جاؤ میں دیتا جاؤں گا''۔

حضور فرماتے ہیں، میں چوتھی بار یہ عرض کروں گا:

يَارَبِّ ائْذَنْ لِيْ فِيْ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.

''اے میرے پروردگار! مجھے اجازت عطا فرما کہ ہر اس شخص کو جنت میں پہنچاؤں جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے حبیب! یہ میرا کام ہے، مجھے اپنی عزت کی قسم، اپنی کبریائی کی قسم، اپنی عظمت کی قسم، اپنے جبروقہر کی قسم! میں ہر اس شخص کو آتش جہنم سے نکال لوں گا جس نے کہا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

یہ حدیث شفاعت صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں بالتفصیل مذکور ہے، میں نے یہ حدیث الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ للقاضی عیاض کی جلد اول مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت (ص۲۸۹ تا ۲۹۹) سے نقل کی ہے۔

حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ جب لوگ بارگاہِ مصطفوی میں حاضر ہوں گے اور شفاعت کے لیے التجا کریں گے تو پل صراط کو بچھا دیا جائے گا، حضور کی شفاعت سے جن کو نجات مل جائے گی وہ اس پل سے گزر کر جنت میں جائیں گے، بعض لوگ بجلی کی تیزی سے گزریں گے، بعض ہوا کی رفتار سے گزریں گے اور بعض پرندوں کی طرح پرواز کرتے گزریں گے، حضرت حذیفہ آخر میں فرماتے ہیں:

وَنَبِيُّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَلَى الصِّرَاطِ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ حَتّٰى يَجْتَازَ النَّاسُ.

''جب حضور ﷺ کی شفاعت سے نجات پانے والے لوگ اس پل صراط سے گزر رہے ہوں گے تو سرورِ عالم ﷺ اس پل کے قریب کھڑے ہوئے التجا کر رہے ہوں گے، اے میرے اللہ! میرے امتیوں کو اس نازک مرحلہ سے سلامتی کے ساتھ گزارنا''۔

کیا شانِ رحمۃ للعالمینی ہے اس محبوبِ رب العالمین کی کہ دنیا میں بھی اپنی امتیوں کی بخشش اور نجات کے لیے آنسوؤں کے دریا بہاتے رہے اور قیامت کے دن بھی کبھی مقامِ محمود پر سرفراز ہو کر اور کبھی پلِ صراط کے قریب کھڑے ہو کر ان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ دَعَا بِهَا فَاسْتُجِيْبَ وَ اَنَا اُرِيْدُ اَنْ اَدَّخِرَ دَعْوَتِيْ شَفَاعَةً لِاُمَّتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

"ہر نبی کو ایک دعا مانگنے کی اجازت دی گئی جس کی قبولیت کا رب العالمین نے وعدہ کیا، سب انبیا نے اپنی اس مخصوص دعا کو اس دنیا میں مانگ لیا، حضور فرماتے ہیں کہ میں نے اس مقبول دعا کو بچا رکھا ہے، تاکہ قیامت کے دن میں اس دعا کو امت کی شفاعت کے لیے مانگوں"۔

اسی لیے ہر امتی کو سرکار کی شفاعت کا آسرا ہے، امام بوصیری علیہ الرحمۃ والرضوان اسی عقیدہ اور فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هُوَ الْحَبِيْبُ الَّذِيْ تُرْجٰى شَفَاعَتُهٗ ‏ ‏ ‏ لِكُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْاَهْوَالِ مُقْتَحَمِ

(وہ ایسے محبوب خدا ہیں جن کی شفاعت کا آسرا ہر پیش آنے والی ہول ناک مصیبت میں کیا جاتا ہے)۔

اور اسی بنیاد پر ہر امتی کو آپ سے دست گیری کی امید ہے اور آپ کی شانِ رحمت سے یہ بعید ہے کہ اپنی ذات سے مدد کی آس لگانے والے کو محروم فرمائیں۔

امام بوصیری فرماتے ہیں:

اِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْ مَعَادِيْ آخِذًا بِيَدِيْ ‏ ‏ ‏ فَضْلًا وَاِلَّا فَقُلْ يَازَلَّةَ الْقَدَمِ

حَاشَاهُ اَنْ يُّحْرَمَ الرَّاجِيْ مَكَارِمَهٗ ‏ ‏ ‏ اَوْ يَرْجِعَ الْجَارُ مِنْهُ غَيْرَ مُحْتَرَمِ

(یعنی اگر حضور نے اپنے فضل و کرم سے آخرت میں میری دست گیری نہ فرمائی تو مجھے

کہنا چاہیے ہائے لغزش قدم (یعنی میرا بہت برا حال ہوگا)۔ آپ کی شان اس سے بالاتر ہے کہ اپنے امیدوار کو فیض وکرم سے محروم رکھیں یا آپ کے جوارِ رحمت میں پناہ لینے والا بے توقیر ہو)۔

استغاثہ واستمداد:

قرآن مجید اوراحادیث کریمہ سے ثابت ہے کہ اللہ کے محبوب بندوں کے ذریعہ پریشاں حال لوگوں کی پریشانیاں دور ہوتی ہیں، حاجت مندوں کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۝ (النساء:۶۴)

(اوراگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تیرے حضور حاضر ہوں پھر اللہ سے بخشش چاہیں، اور معافی مانگے ان کے لیے رسول، تو بے شک اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے)۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ بارگاہِ رسالت سے حاجت مندوں کی حاجت روائی ہوتی ہے، پریشاں حالوں کی پریشانیاں دور ہوتی ہیں۔

دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝ (البقرہ:۲۵۱)

(اگراللہ تعالیٰ کا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع کرنا نہ ہوتا تو یقیناً زمین تباہ ہوجاتی، مگراللہ سارے جہان پر فضل والا ہے)۔

ائمۂ مفسرین اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے سبب کافروں سے اور نیکوں کے سبب بدوں سے بلا دور کرتا ہے۔

اسی بنا پر بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے اپنی

حاجتیں مانگو۔

○ حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: اُطْلُبُوا الحوائج إلیٰ ذوي الرحمة من أمتي تُرزَقُوا وتُفلِحُوا. وفي لفظ: اُطْلُبُوا الفضل عند الرُّحماء من أمتي تعيشوا في أكنافهم فانَّ فيهم رحمتي. وفي لفظ: اُطْلُبُوا الفضلَ من الرحماء. وفي رواية أخرىٰ: اُطْلُبُوا المعروف من رُحَمَاءِ أمتي تعيشوا في أكنافهم.

(میرے رحم دل امتیوں سے حاجتیں مانگو، ان سے فضل طلب کرو، ان سے بھلائی چاہو رزق پاؤ گے، مرادوں کو پہنچو گے، ان کے دامن میں آرام سے رہو گے، ان کی پناہ میں چین کرو گے کہ ان میں میری رحمت ہے)۔

[أخرجه العقيلي والطبراني في الأوسط باللفظ الأول، وابن حِبَّان والخَرَاطِي والقُضَاعي وأبو الحسن المَوصِلي والحاكم في التاريخ باللفظ الثاني، والعقيلي باللفظ الثالث، كلهم عن أبي سعيد الخدري، والأخرىٰ للحاكم في المستدرک عن علي المرتضىٰ رضي الله تعالىٰ عنهما]

اور قرآن کریم کے ساتھ حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے حاجت پوری کرتے ہیں اور مدد کرتے ہیں۔

امام طبرانی نے معجم کبیر میں سندِ حسن کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ حضورِ اقدس ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالیٰ عباداً اختصَّهم بحوائج الناس، يَفْزَعُ الناسُ اِلَيهِمْ في حوائِجِهِمْ، أولٰئِكَ الْآمنون من عذاب الله.

(اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص بندے ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی حاجت روائی کے لیے خاص فرمالیا ہے، لوگ گھبرائے اپنی ضرورتیں ان کے پاس لاتے ہیں، یہ بندے عذابِ الٰہی سے امان میں ہیں)۔

قرآن وحدیث کے ان ارشادات کی وجہ سے محبوبانِ بارگاہِ الٰہی، انبیاے کرام و اولیاے عظام سے مدد مانگنے اوران کی بارگاہ میں استغاثہ کرنے کو سوادِ اعظم اہل سنت وجماعت کے علما، صلحا، اولیا ومشائخ، فقہا، محدثین نے نہ صرف جائز کہا بلکہ یہ ان کا معمول بھی رہا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ تفسیر فتح العزیز ص ۲۰ پر رقم طراز ہیں:

"باید فہمید کہ استعانت از غیر بوجہے کہ اعتماد برآں غیر بود وا و را مظہر عون الٰہی نداند حرام است، واگر التفات محض بجانب حق است وا و را یکے از مظاہر عون دانستہ ونظر بکارخانۂ اسباب وحکمت تعالیٰ درآن نمودہ بغیر استعانت نماید دور از عرفان نہ خواہد بود ودر شرع نیز جائز وروا است وانبیا واولیا ایں نوع استعانت بالغیر کردہ اند ودر حقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لا غیر"۔

(جاننا چاہیے کہ کسی غیر پر اعتماد کرتے ہوئے اوراسے عونِ الٰہی کا مظہر جانے بغیر مدد مانگنا حرام ہے، اوراگر توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہے اوراس کو اللہ کی مدد کا ایک مظہر جان کر اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کارخانۂ اسباب پر نظر کرتے ہوئے اس سے مدد مانگی تو یہ عرفان سے دور نہیں اور شریعت میں بھی جائز ہے، اوراس قسم کی استعانت بالغیر تو انبیاے کرام واولیاے ذوی الاحترام نے بھی کی ہے، حقیقت میں یہ حق تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد مانگنا نہیں بلکہ اسی سے مدد مانگنا ہے)۔

صاحب درمختار علامہ علاء الدین حصکفی متوفی (۱۰۸۸) نے امام الائمہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے قصیدۃ النعمان کے یہ اشعار نقل فرمائے ہیں:

يَا اَكْرَمَ الثَّقَلَيْنِ يَا كَنْزَ الْوَرىٰ ۔۔۔ جُدْ لِي بِجُوْدِكَ، اَرْضِنِيْ بِرِضَاكَ

اَنَا طَامِعٌ بِالْجُوْدِ مِنْكَ لَمْ يَكُنْ ۔۔۔ لِأَبِيْ حَنِيْفَةَ فِي الْاَنَامِ سِوَاكَ

ترجمہ: (اے جن وانس میں سب سے مکرم ومحترم، اے مخلوقِ خدا کے خزانے! اپنے جود وکرم سے مجھ پر بخشش کیجیے اوراپنی خوشنودی سے مجھے بھی شادکام فرمائیے، میں آپ کی بخشش

کا امیدوار ہوں اور آپ کے سوا لوگوں میں ابوحنیفہ کا کوئی نہیں۔)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ بارگاہِ رسالت میں یوں استغاثہ کرتے ہیں:

یَا اَکْرَمَ الْخَلْقِ مَالِیْ مَنْ اَلُوْذُ بِهٖ سِوَاکَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمَمِ

ترجمہ: (اے ساری مخلوق سے افضل و برگزیدہ نبی! آپ کے سوا میرا کون ہے کہ عمومی اور ہمہ گیر مصیبت کے وقت میں جس کی پناہ لوں۔)

اور فرماتے ہیں:

وَمَا سَامَنِي الدَّهْرُ ضَيْماً وَاسْتَجَرْتُ بِهٖ اِلَّا وَنِلْتُ جِوَارًا مِّنْهُ لَمْ يُضَمِ

وَلَا الْتَمَسْتُ غِنَى الدَّارَيْنِ مِنْ يَدِهٖ اِلَّا اسْتَلَمْتُ النَّدٰى مِنْ خَيْرِ مُسْتَلَمِ

ترجمہ: (جب بھی زمانہ نے مجھ پر ستم ڈھایا اور میں نے ان کی پناہ مانگی تو مجھے ان سے غیر معمولی پناہ حاصل ہوئی، اور جب بھی آپ سے دنیا و آخرت کی کوئی بھلائی چاہی ایک بہتر داتا کے ہاتھوں بخشش کی بھیک پائی۔)

ندائے یا رسول اللہ:

سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حیاتِ ظاہری میں اور بعدِ وصال شایانِ شان اوصاف سے پکارنا اور ندا دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ سلف صالحین اور بزرگانِ دین کا معمول رہا ہے۔

سرکار کی حیاتِ ظاہری میں پکارنے کا ثبوت اس حدیث پاک سے ہے جس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے:

فصعد الرجال والنساء فوق البيوت وتفرّق الغلمان والخدام في الطرق يُنادون يامحمد يا رسول الله، يا محمد يا رسول الله (صحیح مسلم، باب حدیث الهجرة، ج۲)

(تو عورتیں اور مرد گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور بچے اور غلام گلی کوچوں میں متفرق ہوگئے، وہ نعرے لگا رہے تھے یا محمد یا رسول اللہ، یا محمد یا رسول اللہ)۔

بعد وصال سرکار کو ندا دینے پر صحابہ وتابعین اور بزرگان دین کا عمل رہا ہے۔

حضور کے وصال کے بعد آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا نے ایک طویل قصیدہ حضور کی شان میں کہا، فرماتی ہیں:

أَلَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کُنْتَ رَجَاءَ نَا وَکُنْتَ بِنَا بَرًّا وَّلَمْ تَکُ جَافِیاً

ترجمہ: (اے اللہ کے رسول! آپ ہم سب کی امیدوں کا مرکز تھے، اور آپ ہم پر مہربان تھے، سخت گیر نہ تھے۔)

امام الائمہ، کاشف الغمہ، سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (وصال ۱۵۰ھ) رضی اللہ عنہ اپنے ''قصیدۂ نعمانیہ'' میں عرض کرتے ہیں:

یَا سَیِّدَ السَّادَاتِ جِئْتُکَ قَاصِدًا أَرْجُوْ رِضَاکَ وَأَحْتَمِيْ بِحِمَاکَ

وَاللّٰہِ یَا خَیْرَ الْخَلَائِقِ إِنَّ لِيْ قَلْبًا مَّشُوْقًا لَا یَرُوْمُ سِوَاکَ

یَا أَکْرَمَ الثَّقَلَیْنِ یَا کَنْزَ الْوَرٰی جُدْ لِيْ بِجُوْدِکَ وَ ارْضِنِيْ بِرِضَاکَ

ترجمہ: (اے آقاؤں کے آقا! میں بالقصد آپ کے پاس آیا ہوں، آپ کی خوشنودی کا امیدوار اور آپ کی پناہ گاہ میں پناہ کا خواستگار ہوں۔ اے مخلوق میں سب سے بہتر ہستی! بخدا میرا قلبِ مشتاق آپ کے سوا کسی اور کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اے جن وانس میں سب سے محترم شخصیت! اور اے خلقِ خدا کے خزانہ! اپنے جود وکرم کی مجھ پر بخشش کیجئے اور اپنی رضامندی سے مجھے شادکام فرمائیے۔)

امام بوصیری نے قصیدۂ بردہ میں کئی مقام پر سرکار کو ندا دی ہے، فرماتے ہیں:

یَا خَیْرَ مَنْ یَّمَّمَ الْعَافُوْنَ سَاحَتَہٗ سَعْیًا وَفَوْقَ مُتُوْنِ الْأَیْنُقِ الرُّسُمِ

ترجمہ: (اے سب سے بہترین داتا جس کے درِ دولت پر مانگنے والے پیادہ پا اور برق رفتار اونٹنیوں کی پشت پر سوار ہو کر چلے آتے ہیں۔)

یَا أَکْرَمَ الْخَلْقِ مَالِيْ مَنْ أَلُوْذُ بِہٖ سِوَاکَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ

(اے ساری مخلوق سے افضل و برتر نبی! آپ کے سوا میرا کون ہے کہ
اور ہمہ گیر مصیبت کے نزول کے وقت میں جس کی پناہ لوں۔)

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر:

سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ آپ خدا نہیں بلکہ بشر ہیں، لیکن عام بشر نہیں، افضل البشر ہیں، ایسے بشر کہ جن کی نظیر محال و ناممکن ہے، ان کے پایے اور مرتبے کا کوئی انسان نہ دنیا میں پیدا ہوا ہے نہ ہوگا، متنبّی نے اپنے ممدوح سیف الدولہ کے بارے میں کہا ہے:

مَضَتِ الدُّهُوْرُ وَمَا أَتَيْنَ بِمِثْلِهٖ   وَلَقَدْ أَتٰى فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِهٖ

(زمانے گزرتے گئے مگر ممدوح کی مثال نہ پیش کر سکے، اور جب وہ دنیا میں آ گیا تو بھی اس کی نظیر لانے سے عاجز و قاصر رہے)۔

سیف الدولہ کے بارے میں تو یہ شعر غلو ہے، لیکن اگر سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں کہا جائے تو حق اور بجا ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی صحیح معنوں میں اس کی حق دار ہے۔

سرورِ کونین ﷺ کے بارے میں راہِ اعتدال یہی ہے کہ نہ تو انہیں خدا یا خدا کا بیٹا کہا جائے جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ روح اللہ کے بارے میں کہا اور نہ عام انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا جائے جیسے کہ بعض حرماں نصیبوں نے کیا، بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہہ کر وہ سارے مراتب و درجات، اوصاف و کمالات سرکار کی طرف منسوب کیے جائیں جو بشر کے سب سے اعلیٰ فرد کے لیے ثابت کیے جا سکتے ہوں۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ اسی معتدل فکر اور اسلامی عقیدہ کی ترجمانی یوں کرتے ہیں:

دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِيْ نَبِيِّهِمْ   وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

وَانْسُبْ اِلٰى ذَاتِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ   وَانْسُبْ اِلٰى قَدْرِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ

ترجمہ: (عیسائیوں نے اپنے نبی کے بارے میں جو دعویٰ کیا ہے اسے چھوڑ کر جو تیرا جی

چاہے ان کی شایانِ شان مدح کر اور اعتدال پر قائم رہ۔ اور آپ کی ذات کی طرف جس شرف و عزت کو چاہے منسوب کر اور آپ کے رتبہ بلند کی جانب جو عظمت و رفعت چاہے منسوب کر یعنی

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نام محمد کی برکت:

اسمِ رسالت "محمد" کی احادیثِ کریمہ میں بڑی فضیلتیں وارد ہیں:

ہ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن دو بندے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے، انہیں جنت میں جانے کا حکم ملے گا، وہ عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم کس بنا پر جنت کے مستحق بن گئے، ہمارے اعمال تو ایسے نہیں کہ ہم جنت کے حق دار ہوتے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا:

عَبْدَيَّ اُدْخُلَا الْجَنَّةَ، فَاِنِّي اٰلَيْتُ عَلٰى نَفْسِي اَنْ لَا يَدْخُلَ النَّارَ مَنِ اسْمُهٗ اَحْمَدُ اَوْ مُحَمَّدٌ (المواہب اللدنیہ)

(اے میرے بندو! تم جنت میں داخل ہو جاؤ، کیوں کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ جس کا نام "محمد" یا "احمد" ہوگا وہ جہنم میں نہ جائے گا۔)

ہ حضرت جعفر بن محمد سے روایت ہے کہ قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا: "اَلَا لِيَقُمْ مَنِ اسْمُهٗ مُحَمَّدٌ فَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ كَرَامَةً لِاِسْمِهٖ ﷺ"

(وہ سب لوگ کھڑے ہو جائیں جن کا نام محمد ہے تو وہ سب اس نام پاک کی برکت سے جنت میں داخل ہو جائیں گے)۔

ہ ایک روایت میں یہی مضمون یوں وارد ہے کہ قیامت کے دن ندا دی جائے گی یا محمد! تو اس نام کے تمام اشخاص موقف میں کھڑے ہو جائیں گے "فَيَقُولُ اللّٰهُ عز وجل: اُشْهِدُكُمْ اَنِّي قد غفرتُ لِكُلِّ مَنِ اسْمُهٗ محمدٌ" (الشفا)۔

(پھر اللہ عزوجل فرمائے گا میں تم سب کو گواہ بناتا ہوں [illegible] ہر اس شخص کو

بخش دیا جس کا نام (میرے نبی) محمد کے نام پر ہے۔)

ㅇ حضرت ابوامامہ سے مرفوعاً روایت ہے:

مَنْ وُلِدَ لَهُ مَوْلُوْدٌ فَسَمَّاهُ مُحَمَّدًا تَبَرُّكًا كَانَ هُوَ وَمَوْلُوْدُهُ فِي الْجَنَّةِ.

رواہ صاحب الفردوس (زرقانی علی المواہب)

(جس کے یہاں کسی بچہ کی ولادت ہو اور وہ تبرکاً اس کا نام محمد رکھے تو وہ اور اس کا بیٹا دونوں بہشتی ہوں گے۔)

اس میں راز یہ ہے کہ کسی کے نام کو اپنانا، یا اپنے فرزند کا نام رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اس ذات سے والہانہ تعلق اور محبت ہے جس کا نام اس نے اپنے لیے یا اپنے فرزندِ ارجمند کے لیے چنا ہے، کبھی بھی کوئی شخص کسی ناپسندیدہ انسان کا نام انتخاب میں نہیں لاتا، لہٰذا محمد نام رکھنے کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ جس نے یہ نام رکھا اسے سرورِ دوجہاں ﷺ سے گہرا لگاؤ اور خاص عقیدت ہے اور اپنے فرزند کے لیے وہ تمنا رکھتا ہے کہ وہ سرکار کا مطیع و فرماں بردار ہو اور مومنانہ شان کے ساتھ اس دنیا میں اپنی زندگی گزارے، بلاشبہ یہ نیت انسانی مغفرت اور بخشش کے لیے کافی ہے۔

امام بوصیری اسی مضمون کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

وَإِنْ آتِ ذَنْبًا فَمَا عَهْدِيْ بِمُنْتَقِضٍ ۔۔۔ مِنَ النَّبِيِّ وَلَا حَبْلِيْ بِمُنْصَرِمِ

فَإِنَّ لِيْ ذِمَّةً مِّنْهُ بِتَسْمِيَتِيْ ۔۔۔ مُحَمَّدًا وَّهُوَ أَوْفَى الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

ترجمہ: (اگر مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو بھی سرکار سے میرا عہد ٹوٹنے والا نہیں اور میرا رشتہ منقطع ہونے والا نہیں۔ کیوں کہ میرا نام محمد ہونے کی وجہ سے سرکار سے مجھے ایک عہد و پیمان مل چکا ہے اور آپ ساری مخلوق سے بڑھ کر عہد و پیمان کو پورا فرمانے والے ہیں۔)

کما حقہ نعت گوئی ناممکن:

کما حقہٗ سرکار کی نعت گوئی اور ثنا خوانی انسان کے بس کی بات نہیں، کیوں کہ اولاً تو

سرکار کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں اور ثانیاً آپ کے فضائل وکمالات اور مدارج ومراتب کی حد متعین نہیں کہ انسان کسی پیمانہ سے ان کی پیائش کر سکے، آپ کے درجات ومراتب تو ہر آن ترقی پر ہیں، ارشاد ربانی ہے "وَلَلاٰخِرَۃُ خَیرٌ لَّکَ مِنَ الاُولیٰ "(آپ کی ہر آنے والی گھڑی پچھلی گھڑی سے بہتر ہے)۔

اسی لیے آپ کے مدح خوانوں نے اپنی عاجزی اور قصور کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ یوں گویا ہیں:

اے رضا خود صاحبِ قرآں ہے مداحِ حضور
تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

عاشق رسول شاعر حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ یوں عرض کرتے ہیں:

یَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَیَاسَیِّدَ الْبَشَرْ   مِنْ وَجْھِکَ الْمُنِیْرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَرْ
لاَ یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقَّہٗ   بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ترجمہ: (اے حسن وجمال کے پیکر! اور اے سارے انسانوں کے آقا ومولیٰ! آپ کے رخ انور سے ہی چاند کو روشنی اور تابانی ملی ہے۔ کما حقہٗ تو آپ کی مدح وثنا ممکن ہی نہیں، بس زیادہ سے زیادہ آپ کی شان میں جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے بعد ساری مخلوق سے افضل واعلیٰ اور برتر وبالا آپ ہی ہیں۔)

ساتویں صدی ہجری کے مشہور صوفی اور عربی شاعر حضرت عمر بن الفارض فرماتے ہیں:

اَریٰ کُلَّ مَدْحٍ فِي النَّبِيِّ مُقَصَّرًا   وَاِنْ بَالَغَ الْمُثْنِيْ عَلَیْہِ وَاَکْثَرَا
اِذِ اللّٰہُ اَثْنٰی بِالَّذِيْ ھُوَ اَھْلُہٗ   عَلَیْہِ فَمَا مِقْدَارُ مَا تَمْدَحُ الْوَریٰ

ترجمہ: (نبی اکرم ﷺ کی ہر مدح ونعت کو میں ناقص ونا تمام اور تشنہ ہی سمجھتا ہوں، اگرچہ نعت گو نے مبالغہ سے کام لیا ہو، جب اللہ تعالیٰ نے خود آپ کی شایانِ شان مدح وثنا بیان فرمائی ہے تو پھر مخلوق کی مدح وثنا کی کیا قدر وقیمت رہ جاتی ہے؟)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ یوں عرض کرتے ہیں:

فَمَا تَطَاوَلَ اٰمَالُ الْمَدِيْحِ اِلٰى مَا فِيْهِ مِنْ كَرَمِ الْاَخْلَاقِ وَالشِّيَمِ

ترجمہ: (کیوں کہ سرکار کے اخلاقِ رفیعہ اور خصائل حمیدہ تک مدح خواں کی آرزوؤں کی
رسائی ہی نہیں۔)

سرکار کا دستِ شفا:

سرورِ انبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے روحانی اور جسمانی ہر قسم کی لاعلاج
بیماریوں کا معالج وطبیبِ حاذق بنا کر مبعوث فرمایا، کفر وشرک اور فسق وفجور کی بیماریوں میں
مبتلا نہ معلوم کتنے مریضوں کو اپنی نگاہِ کرم سے آپ نے صاف وشفاف قلب وذہن
اور پاکیزہ فکر واعتقاد کا حامل بنا دیا، اسی طرح بارگاہِ رسالت میں جو لاعلاج مریض حاضر ہوا
حضور کی توجہ سے اسے بھی شفا نصیب ہوئی، بے شمار ایسے بیمار ہیں جو حاضر خدمت ہوئے
اور تندرست ہو کر لوٹے، ان سب کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

○ حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ جنگ اُحد میں شریک ہوئے، جنگ کے دوران آپ
کو تیر لگا، جس سے آپ کی آنکھ کا ڈھیلا بہ نکلا، آپ نے اس ڈھیلے کو اپنے ہاتھوں سے پکڑا،
بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، عرض کیا میری آنکھ پر نظرِ کرم فرمائیے، حضور نے فرمایا اگر تم
چاہو تو صبر کرو اور اس کے عوض تمہیں جنت ملے گی اور اگر تم چاہتے ہو تو میں اس آنکھ کو
درست کر دیتا ہوں، انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! بے شک جنت بڑی خوب صورت
جزا اور اللہ تعالیٰ کا گراں قدر عطیہ ہے، لیکن مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ میری بیوی جس سے مجھے بڑی
محبت ہے وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر دل برداشتہ اور متنفر نہ ہو جائے، حضور نے اس
ڈھیلے کو دستِ مبارک سے اس کے اصلی مقام پر رکھ دیا، پھر دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ اكْسِهٖ جَمَالًا.

(یا اللہ! اس کے چہرہ کو حسین وجمیل بنا دے)۔

سرکار کے دستِ مبارک کی برکت سے ان کی وہ ضائع شدہ آنکھ دوسری آنکھ سے

بھی زیادہ حسین وجمیل ہوگئی اوراس کی بینائی درست آنکھ سے بھی زیادہ تیز ہوگئی اورا سے کبھی آشوب چشم کا عارضہ نہ لاحق ہوتا تھا۔

۵ غزوۂ خیبر کا مشہور واقعہ ہے کہ جب بار بار کی کوشش کے باوجود قلعۂ خیبر فتح نہ ہوا تو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

لَأُعْطِيَنَّ رَايَةَ غَدًا لِرَجُلٍ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ.

(کل میں ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اوراس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ اوراس کے رسول بھی محبت کرتے ہیں، اس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ لشکر اسلام کو فتح عطا فرمائے گا)۔

پھر سرکار نے حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ الکریم کو بلا بھیجا، وہ آشوبِ چشم کی بیماری میں مبتلا تھے، آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو سرکار کی خدمت میں لایا گیا، رحمتِ عالم نے ان کے سر کو اپنی آغوشِ مبارک میں رکھ کر ان کی دونوں آنکھوں میں لعابِ دہن ڈالا، درد کا نام ونشان تک نہ رہا، آنکھوں کی سرخی غائب ہوگئی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو آشوب چشم کی کبھی شکایت ہوئی ہی نہ تھی۔

اسی طرح سرکار کی ظاہری حیاتِ طیبہ اور بعدِ وصال کے بہت سے واقعات ہیں جن سے یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار کو شفاے امراض کی غیر معمولی طاقت عطا فرمائی ہے۔ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ اسی معجزہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

كَمْ اَبْرَأَتْ وَصِبًا بِاللَّمْسِ رَاحَتُهٗ وَأَطْـ ـتْ اَرِبًا مِنْ رِبْقَةِ اللَّمَمِ

ترجمہ: (سرکار نے ہاتھ لگا کر کتنے بیماروں ـ ـ کو دیوانگی کی قید سے رہا کردیا۔)

نعت گوئی نجات کا بہترین

نعت گوئی اور نعت خوانی سرورِ کونین ﷺ ـ ـ ل کا ایک بہترین ذریعہ اور

آپ کے فضائل وکمالات کا چرچا کرنے کا ایک موثر اور دل نشیں طریقہ ہے، قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ○ (انشراح:۴)

(اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا)۔

نعت گوئی اور نعت خوانی سرکار کے ذکر اور آوازہ کو بلند کرنا ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ سرکار دو جہاں ﷺ کی حیاتِ ظاہری سے لے کر آج تک مختلف ملکوں، مختلف نسلوں، مختلف زبانوں کے شعرا وادبا آپ کی مدح وتوصیف میں مشغول ہیں اور قیامت تک مشغول رہیں گے بلکہ قیامت کے دن بھی جب اولین وآخرین کا مجمع ہوگا آپ کو "مقام محمود" عطا ہوگا، لواء الحمد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا اور ابتداے آفرینش سے قیامِ قیامت تک دنیا میں پیدا ہونے والے سارے افرادِ انسانی سرکار کی مدح وثنا اور تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہوں گے۔

سرکار کی ظاہری حیاتِ طیبہ میں بھی نعتِ رسول پر بھرپور توجہ دی جاتی تھی، سرکار کے چچا ابو طالب اور صحابۂ کرام میں حضرت حسان بن ثابت انصاری، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ، عبداللہ بن زِبَعریٰ، عباس بن مرداس اور کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہم عہدِ رسالت کے نعت گو شعرا کی فہرست میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، دورِ رسالت کے بعد عربی شعرا میں ابن جابر اندلسی (م ۷۸۰ھ)، شیخ شرف الدین محمد بن سعید بوصیری (م ۶۹۷ھ)، شیخ ابوبکر تقی الدین بن علی المعروف بابن حجہ حَموی شامی (م ۸۳۹ھ)، شیخ عبدالرحیم البُرعی الیمانی (م ۸۰۳ھ)، جمال الدین محمد بن محمد المعروف بابن نباتہ مصری (م ۷۶۸ھ) شہاب الدین محمود الحلبی، عمر بن الفارض (۶۳۲ھ)، شیخ جمال الدین الصرصری العراقی (م ۶۵۶ھ)، شیخ الاسلام شہاب الدین احمد بن علی المعروف بابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) شیخ عبداللہ شبراوی، محمود سامی باشا البارودی (م ۱۹۰۴ء)، احمد شوقی (م ۱۹۳۲ء)، حافظ ابراہیم (م ۱۹۳۲ء) اور فارسی شعرا میں مولانا جلال الدین رومی، شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی، ملا عبدالرحمٰن جامی، حافظ شیرازی، امیر خسرو دہلوی اور اردو شعرا

میں علامہ فضل رسول بدایونی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی، مولانا حسن رضا بریلوی، مولانا جمیل الرحمٰن بریلوی، مولانا سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی، مولانا کافی الٰہ آبادی، بیدم وارثی، محسن کاکوروی، امیر مینائی، آسی غازی پوری، مفتیِ اعظم مولانا مصطفیٰ رضا قادری بریلوی کے نام نعت گو شعرا کی فہرست میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

یہ سارے لوگ نعت گوئی کو نہ صرف اپنی سعادت بلکہ ذریعۂ مغفرت ونجات سمجھتے رہے، دنیا کا کوئی ملک جو اسلام کی دولت سے مشرف ہوا کسی دور میں بھی ایسے شعرا سے خالی نہیں رہا جنہوں۔ نے اپنی بہترین شاعرانہ صلاحیتیں اس بہترین موضوع پر اور اس محمود و ممدوح ذات کی مدح وتوصیف میں صرف نہ کی ہوں، اور اس سے دنیا میں اپنی کامیابی و سرخ روئی اور آخرت میں اپنی مغفرت اور بخشش کا سامان نہ کیا ہو۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ بھی نعتِ نبوی کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں، قصیدۂ بردہ میں فرماتے ہیں:

وَمُنْذُ اَلْزَمْتُ اَفْكَارِيْ مَدَائِحَهٗ وَجَدْتُهٗ لِخَلَاصِيْ خَيْرَ مُلْتَزَمِ

ترجمہ: (اور جب سے میں نے اپنے افکارِ سخن کو نعتِ نبوی لکھنے کا پابند بنالیا، اپنی نجات کے لیے سرکار کو بہترین کفیل پایا۔)

نزولِ بارانِ رحمت:

عہدِ رسالت میں جب جزیرۂ عرب کے باشندوں کو قحط کا سامنا ہوتا تو اس وقت رسولِ اکرم ﷺ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں حاضر ہوکر وہ اپنی پریشانی عرض کرتے اور قحط سالی سے ہونے والی جان و مال کی تباہی کی داستان سناتے اور اس سے نجات کے لیے سرکار کی بارگاہ میں دعا کی درخواست کرتے، رحمۃ للعالمین ﷺ بارگاہِ رب العالمین میں دستِ دعا دراز فرماتے، ہر طرف سے گھٹائیں امنڈتیں اور موسلا دھار بارش شروع ہوجاتی، اس قسم کے متعدد واقعات سندِ صحیح کے ساتھ کتبِ صحاح میں مذکور ہیں۔

○ حضرت انس ﷺ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ بخدا ایک روز مطلع صاف تھا، آسمان پر بادل تو کجا کوئی بادل کا ٹکڑا بھی نظر نہیں آ رہا تھا، جمعہ کا دن تھا، سرورِ دو عالم ﷺ نمازِ جمعہ سے پہلے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، ایک اعرابی مسجد نبوی شریف میں اس دروازے سے داخل ہوا جو منبر کے بالکل مقابل تھا، اس نے آتے ہی عرض کی: یا رسول اللہ! قحط اور خشک سالی سے مویشی بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو گئے ہیں، راستے بند ہو گئے ہیں اور ان پر مسافروں کی آمد و رفت رک گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا فرمائیں کہ وہ بارشِ رحمت نازل فرمائے، رحمتِ دو عالم ﷺ نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے بلند فرمائے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کی:

اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا ، اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا ، اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا.

(اے اللہ! ہمیں بارشِ رحمت سے سیراب فرما، اے اللہ! ہمیں بارشِ رحمت سے سیراب فرما، اے اللہ! ہمیں بارشِ رحمت سے سیراب فرما)۔

حضرت انس فرماتے ہیں اس وقت آسمان بالکل صاف تھا اور بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی آسمان پر کہیں نظر نہیں آتا تھا، اچانک مکانوں کے پیچھے سے ڈھال کے برابر ایک ٹکڑا نمودار ہوا، جب وہ آسمان کے وسط میں پہنچا تو چاروں طرف پھیل گیا، پھر بارش شروع ہوئی، حضرت انس فرماتے ہیں، اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، حضور نے ابھی دعا سے فراغت کے بعد ہاتھ نیچے بھی نہ کیے تھے کہ بادل پہاڑوں کی طرح گرجتا ہوا آ گیا اور حضور منبر سے اترے نہ تھے کہ بارش کے قطرے آپ کی ریش مبارک پر آ کر ٹپکنے لگے اور اس جمعہ سے آئندہ جمعہ تک لگاتار بارش ہوتی رہی، پھر آئندہ جمعہ کو وہی شخص یا کوئی اور شخص حاضرِ بارگاہ ہوا اور عرض کی:

تَھَدَّمَتِ الْبُیُوْتُ ، وَتَقَطَّعَتِ السُّبُلُ وَھَلَکَتِ الْمَوَاشِیْ ، فَادْعُ اللّٰہَ اَنْ یُّمْسِکَھَا.

(مکانات منہدم ہو گئے ہیں، راستے بند ہو گئے ہیں، مویشی ہلاک ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ بارش کا سلسلہ بند کر دے)۔

اس سائل کی عرض داشت سن کر سرکار مسکرائے اور بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا ، اَللّٰهُمَّ عَلَى الْاٰكَامِ وَالظِّرَابِ وَالْاَوْدِيَةِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ.

(اے اللہ! ہم پر بارش نہ برسا بلکہ ہمارے اردگرد جگہوں پر بارش نازل فرما، اے اللہ! ٹیلوں، چھوٹی پہاڑیوں، وادیوں اور درخت اگنے کی جگہوں پر بارش برسا)۔

چنانچہ جس طرف سرکار کی انگلی کا اشارہ ہوتا بادل پھٹتا جاتا، اور چند لمحوں میں مطلع صاف ہوگیا، اس بار اتنی بارش ہوئی کہ وادیِ قناۃ ایک ماہ تک بہتی رہی، اس عرصہ میں دور دراز علاقوں کے جتنے لوگ بھی آئے انہوں نے بھی یہی اطلاع دی کہ ہر جگہ موسلادھار بارش ہوئی۔ (شمائل الرسول لأبي الفداء ابن كثير، ص۱۶۹)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"هٰذِهٖ طُرُقٌ مُتَوَاتِرَةٌ عَنْ اَنَس بْنِ مَالِكٍ تُفِيْدُ الْقَطْعَ"

(یہ تمام طرقِ روایت حدّ تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں اور یقین کا فائدہ دیتے ہیں)۔

یعنی یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں۔

۵ امام بیہقی ایک دوسرے واقعے کے بارے میں حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ اعرابی نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کی:

اَتَيْنَاكَ وَالْعَذْرَاءُ يُدْمِيْ لِبَانُهَا وَقَدْ شُغِلَتْ اُمُّ الصَّبِيِّ عَنِ الطِّفْلِ

(یارسول اللہ! ہم آپ کی بارگاہ میں ایسے حال میں حاضر ہوئے ہیں کہ ہماری کنواری بچیوں کے سینے سے خون رس رہا ہے اور شیرخوار بچے کی ماں مارے بھوک کے اپنے بچے سے غافل ہوگئی ہے)۔

وَلَا شَيْءَ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ عِنْدَنَا سِوَى الْحَنْظَلِ الْعَامِيِّ وَالْعِلْهِزِ الْفَسْلِ

(ہمارے پاس کھانے کے لیے سوائے ردی قسم کے اندرائن کے اور ردی علہز کے کوئی شی نہیں)۔(۱)

(۱) علہز ایک کھانا ہے جو خون اور بال ملا کر بناتے تھے، خون کو اونٹ کے بالوں میں ملا کر آگ پر بھون لیتے اور قحط کے دنوں میں عرب لوگ اسے کھاتے تھے۔

وَلَیْسَ لَنَا اِلاَّ اِلَیْکَ فِرَارُنَا وَأَیْنَ فِرَارُ النَّاسِ اِلاَّ اِلَی الرُّسُلِ

(ہمارے لیے حضور کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں، اور لوگوں کے لیے رسولوں کے سوا اور کون سی پناہ گاہ ہو سکتی ہے)۔

اعرابی کی یہ درد بھری فریاد سن کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تیزی سے اٹھے اور چادرِ مبارک کھینچتے ہوئے منبر پر تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اپنے مبارک ہاتھ آسمان کی جانب اٹھائے اور بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَیْثًا مُغِیْثًا مَرِیْئًا مُرِیْعًا سَرِیْعًا غَدَقًا طَبَقًا عَاجِلاً غَیْرَ رَائِثٍ نَافِعًا غَیْرَ ضَارٍّ تَمْلَأُ بِهِ الضَّرْعَ، وَتُنْبِتُ بِهِ الزَّرْعَ، وَتُحْیِیْ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ کَذٰلِکَ تُخْرَجُوْنَ.

(اے اللہ ہمیں ایسے بادل سے سیراب کر جو خوش گوار، سرسبز و شاداب کرنے والا، تیز برسنے والا، سیراب کرنے والا، ہر جگہ برسنے والا، تاخیر نہ کرنے والا اور نفع بخش ہو، ضرر دینے والا نہ ہو جس سے مویشیوں کے تھن دودھ سے بھر جائیں اور کھیتیاں اُگ آئیں اور جس سے زمین کو بنجر ہونے کے بعد شاداب کر دے اور اسی طرح قیامت کے دن قبروں سے اٹھایا جائے گا)۔

حضرت انس فرماتے ہیں:

فَوَاللّٰہِ مَارَدَّ یَدَہٗ اِلٰی نَحْرِہٖ حَتّٰی اَلْقَتِ السَّمَاءُ بِأَرْوَاقِهَا. (ایضاً ص ۱۷۰)

(خدا کی قسم حضور نے اپنے دستِ مبارک اپنے چہرہ پر پھیرے بھی نہ تھے کہ آسمان سے گھڑوں پانی برسنے لگا)۔

امام بوصیری نے سرکارِ دو جہاں ﷺ کے اس معجزہ کو یوں نظم فرمایا ہے:

وَاَحْیَتِ السَّنَۃَ الشَّھْبَاءَ دَعْوَتُہٗ حَتّٰی حَکَتْ غُرَّۃً فِی الْاَعْصُرِ الدُّھُمِ

بِعَارِضٍ جَادَ اَوْ خِلْتَ الْبِطَاحَ بِھَا سَیْبٌ مِّنَ الْیَمِّ اَوْ سَیْلٌ مِّنَ الْعَرِمِ

ترجمہ: (بارہا آپ کی دعا نے قحط رسیدہ سال کو ایسی شادابی بخشی کہ وہ سرسبز زمانوں میں بے حد نمایاں ہو گیا۔ ایسے بادل کے ذریعہ جو اس قدر جھوم کے برسا کہ لگتا ہے کہ سنگلاخ وادیوں پر سمندر کا کوئی ریلا چلا آیا یا عرم کا سیلاب آ گیا۔)

عروضی پیمائش

یہ قصیدہ بحر بسیط میں ہے، اس کے ارکان درج ذیل ہیں:

مُسْتَفْعِلُنْ فَاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ فَاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ فَاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ فَاعِلُنْ

بحرِ بسیط کی چھ نوعیں ہیں، یہ قصیدہ پہلی نوع (عَروض وضربِ مخبون) میں ہے۔

پہلے مصرع کے آخری رکن کو "عَروض" اوردوسرے مصرع کے آخری رکن کو "ضَرب" کہتے ہیں، قصیدے کے مُسْتَفْعِلُنْ اور فَاعِلُنْ میں خَبْن اور طی زحاف ہوئے ہیں، اس لیے زحاف اور خَبْن وطی کو سمجھنا ضروری ہے۔

زحاف: وہ تغیر ہے جو سبب کے دوسرے حرف کے ساتھ خاص ہو اور لازم نہ ہو، یعنی ضروری نہیں کہ کسی قصیدہ میں ایک جگہ یہ تغیر ہو جائے تو ہر جگہ ہو، لیکن عروض یا ضرب میں جو زحاف ہوتا ہے وہ اکثر لازم ہو جاتا ہے، یعنی قصیدے کے اندر ہر شعر کے عروض وضرب میں وہ زحاف ضرور آتا ہے، ایسے زحاف کو "زحاف قائم مقام علت" کہا جاتا ہے، جیسے اس قصیدے کے عروض وضرب فَاعِلُنْ کی بجائے ہر جگہ فَعِلُنْ ہو کر آئے ہیں۔

خَبْن: اہل عروض کے نزدیک دوسرے ساکن کو حذف کرنے کا نام ہے، جیسے فَاعِلُنْ سے فَعِلُنْ، مُسْتَفْعِلُنْ سے مَفَاعِلُنْ۔

اس کی صورت یہ ہے کہ مُسْتَفْعِلُنْ سے دوسرا ساکن "س" حذف کیا تو "مُتَفْعِلُنْ" ہوا، پھر اسے مَفَاعِلُنْ بنالیا، کیوں کہ اہل عروض کا قاعدہ ہے کہ تغیر وتبدل سے جب کوئی جز نامانوس ہو جاتا ہے تو اسے مانوس بنالیتے ہیں، نیز وزنِ عروضی میں صرف حرکت کے مقابل حرکت اور ساکن کے مقابل ساکن رکھا جاتا ہے، زیر، زبر، پیش کا کوئی فرق معتبر نہیں ہوتا، اسی لیے فَعُوْلُنْ اور مَفَاعِلْ ہمیشہ ہم وزن شمار ہوتے ہیں۔

طی: چوتھے ساکن کو حذف کرنا، جیسے مُستَفعِلُن سے مُفتَعِلُن۔ مُستَفعِلُن میں چوتھا ساکن "ف" ہے، اسے حذف کیا تو "مُستَعِلُن" ہوا، اسے مانوس بنا کر "مُفتَعِلُن" کرلیا گیا۔

عروض وضرب کے علاوہ بحر کے بقیہ اجزا کو "حشو" کہا جاتا ہے، اس قصیدے میں دونوں مصرعوں کے اندر پہلے تینوں ارکان (مُستَفعِلُن فَاعِلُن مُستَفعِلُن) حشو ہیں، ان کے مُستَفعِلُن میں زحاف (خبن یا طی) اور فاعِلُن میں خبن کہیں آیا ہے اور کہیں نہیں آیا ہے، یعنی مُستَفعِلُن کہیں خبن کی وجہ سے مَفاعِلُن یا طی کی وجہ سے مُفتَعِلُن ہو کر آیا ہے اور کہیں بلکہ اکثر سالم آیا ہے، اسی طرح فاعِلُن کہیں خبن کی وجہ سے فَعِلُن ہو کر آیا ہے اور کہیں پورا فاعِلُن سالم آیا ہے۔

واضح رہے کہ فَاعِلُن حشو میں خبن حسن ہے اور پہلے دوسرے مصرع کے مُستَفعِلُن اول میں بھی خبن حسن ہے، دیگر میں صالح، اسی طرح اس میں طی بھی صالح ہے اور خبل (مُستَفعِلُن میں خبن وطی کو جمع کر کے مُتَعِلُن (مانوس فَعَلَتُن) لانا قبیح ہے۔

آسانی کے لیے ذیل میں چند اشعار کی تقطیع دی جا رہی ہے:

٥ أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِيْ سَلَمِ مَزَجْتَ دَمْعًا جَرٰى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

أَمِنْ تَذَکْ	کُرِ جِيْ	رَانِنْ بِذِيْ	سَلَمِيْ		مَزَجْتَ دَمْ	عَنْ جَرٰی	مِنْ مُقْلَتِنْ	بِدَمِيْ
مَفَاعِلُنْ	فَعِلُنْ	مُسْتَفْعِلُنْ	فَعِلُنْ		مَفَاعِلُنْ	فَاعِلُنْ	مُسْتَفْعِلُنْ	فَعِلُنْ

٥ أَمْ هَبَّتِ الرِّيْحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ وَأَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ إِضَمِ

أَمْ هَبْ بَتِ رْ	رِيْحُ مِنْ	تِلْقَاءِ كَا	ظِمَتِنْ		وَ أَوْمَضَ لْ	بَرْقُ فِظْ	ظَلْمَاءِ مِنْ	إِضَمِيْ
مُسْتَفْعِلُنْ	فَاعِلُنْ	مُسْتَفْعِلُنْ	فَعِلُنْ		مَفَاعِلُنْ	فَاعِلُنْ	مُسْتَفْعِلُنْ	فَعِلُنْ

٥ مَا رَنَّحَتْ عَذَبَاتِ الْبَانِ رِيْحُ صَبَا وَأَطْرَبَ الْعِيْسَ حَادِي الْعِيْسِ بِالنَّغَمِ

مَا رَنْنَحَتْ	عَذَبَا	تِ لْ بَانِ رِیْ	حُ صَبَا		وَأَطْرَبَ لْ	عِيْسَ حَا	دِ لْ عِيْسِ بِنْ	نَغَمِيْ
مُسْتَفْعِلُنْ	فَعِلُنْ	مُسْتَفْعِلُنْ	فَعِلُنْ		مَفَاعِلُنْ	فَاعِلُنْ	مُسْتَفْعِلُنْ	فَعِلُنْ

قصیدۂ بردہ کی بلاغی پیمائش

قصیدۂ بردہ کی بلاغی پیمائش سے پہلے بلاغت کے معنی ومفہوم کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بلاغت کا لغوی معنی ''پہنچنا'' ہے، بلاغت کے اصطلاحی مفہوم کے سلسلہ میں ماہرین ادب وبلاغت کے مختلف اقوال ہیں:

۱-بلاغت یہ ہے کہ کلام برجستہ ہو، خطا سے پاک ہو۔(صحار قیسی)(البیان والتبیین، ج۱،ص۹۴)

۲-کلام مختصر ہو اور خوب ہو۔ (ایک اعرابی)

۳-دور کا مضمون سامنے کردینا اور تھوڑے سے الفاظ میں بہت کچھ ادا کردینا۔(جعفر بن خالد برمکی) (العقد الفرید، ج۳،ص۲۳)

۴-الفاظ ضرورت سے زائد نہ ہوں، کلام برجستہ ہو، مضمون کچھ کا کچھ نہ ہو جائے اور کوئی لفظ نامانوس اور بازاری نہ ہو۔(خلیفہ مامون) (کتاب الصناعتین،ص۴۴۹)

۵-جس طرح تمہارے دل میں مضمون ہے اسی طرح مخاطب کے دل میں اتار دو اور اس کے الفاظ مقبول عام ہوں اور تعبیر خوب صورت ہو۔(ابوالہلال عسکری)(کتاب الصناعتین،ص۸)

۶-مجاز اور استعارے لطیف ہوں، تمثیل اور کنایے دل کش ہوں، کلام حسب موقع ہو اور الفاظ کی نشست خوب جمی ہو، بندش چست ہو۔(علامہ جرجانی)

۷-الفاظ سلیس ہوں، جنچے تلے ہوں، رواں ڈھلے ہوں، بندش سلجھی ہو، مضمون میں الجھاؤ نہ ہو اور کلام موقع ومحل کے مطابق ہو۔(علمائے معانی)(عام کتب بلاغت)

اصل میں بلاغت کے مختلف پہلو ہیں اور اس کی ادائیں نہ جانے کتنی ہیں، پھر جس

کو جو ادا بھا گئی اسی کو کلام کا زیور اور بیان کا جوہر سمجھ لیا، نظر اپنی اپنی، پسند اپنی اپنی، یہ سب اپنا اپنا ذوق و رجحان ہے اور اسی کا اظہار و بیان ہے، حقیقت میں بلاغت نام ہے دل نشینی کا، مضمون اور الفاظ کی دل نشینی، بندش اور طرز ادا کی دل نشینی۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جو خود لفظ ''بلاغت'' میں موجود ہے، کیوں کہ بلاغت کے معنی ہیں پہنچنا، اب کلام کی بلاغت کیا ہے؟ کلام کا دل میں پہنچنا اور دل میں اتر جانا۔

کلام بلیغ یا دل نشیں اس وقت ہوتا ہے جب تمام اجزاے کلام دل نشیں ہوں، یعنی مضمون، الفاظ، بندش اور طرزِ ادا دل نشیں ہوں تو کلام میں خود دل نشینی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کا نام بلاغت ہے، اگر کلام کے ان چاروں عناصر (مضمون، الفاظ، بندش اور طرز ادا) میں سے ایک عنصر بھی دل نشینی کے جوہر سے محروم ہوا تو بلاغت آ ہی نہیں سکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کلام کے بلیغ ہونے کا دار و مدار درج ذیل بنیادی عناصر پر ہے:
۱- مضمون کی دل نشینی۔ ۲- الفاظ کی دل آویزی۔ ۳- بندش کی خوب صورتی یا حسن بندش۔
۴- اندازِ بیان کی دل کشی یا حسنِ ادا۔

ہر باذوق ذی علم جانتا ہے کہ مجاز و استعارہ، تشبیہ اور صنائع و بدائع سے کلام کی دل نشینی دوبالا ہو جاتی ہے اور اس کی تاثیر میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے اور کلام سامعین کے کانوں میں رس گھولتا ہوا دلوں کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ سننے والے بے خود ہو کر لاشعوری طور پر متکلم کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں، ان کے افکار و خیالات، متکلم کے افکار و خیالات کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں، سحر انگیزی، اثر آفرینی اور دل آویزی کا عنصر کلام میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ تکلف و تصنع اور آورد سے پاک ہو۔

اہل علم اور اصحاب فن جانتے ہیں کہ ایک فصیح و بلیغ انسان کے لیے اس کی زبان و بیان کی خوبیاں اس کے نطق کا ایک ملکہ بن جاتی ہیں اور وہ کسی موضوع کے تحت جو کچھ کہتا ہے اس میں یہ خوبیاں خود بہ خود نمایاں ہو جاتی ہیں، اس کے لیے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بعض لوگوں نے محاسن بلاغت اور صنائع وبدائع سے مزین ہر شعر کو مصنوعی شاعری کہہ کر اور استعارہ کو دائرۂ کذب میں داخل کر کے کلامِ احسن سے خارج کر دیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نثر ہو یا نظم، کلام کا حسن وجمال وجوہِ بلاغت اور صنائع وبدائع سے دوبالا ہو جاتا ہے، اسی لیے قرآن کریم اور احادیث نبویہ اور اُدَبا کے کلام میں بلاتکلف ان کا استعمال ملتا ہے، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اعجازِ قرآنی اور اعجازِ کلام رسالت میں اس کا بڑا دخل ہے، اس لیے بغیر کسی تفصیل کے مطلقاً یہ فیصلہ داغ دینا سراسر ناانصافی ہے، ہاں اگر اصل مقصود کو دل نشیں انداز میں بیان کرنے سے زیادہ صنائع وبدائع کی کثرت دکھانے کے لیے تصنع اور تکلف سے کام لیا گیا ہو تو یہ ضرور عیب ہے، لیکن کلام کی سلاست وروانی اور مقصد کی دل پذیر ادائگی کے ساتھ بے تکلف استعارات وصنائع ہرگز عیب نہیں۔

ذیل میں محاسنِ بیان اور صنائع بدائع کے لحاظ سے ''قصیدۂ بردہ'' کا جائزہ پیش ہے، جس میں اس مقبول بارگاہِ رسالت قصیدے کے ادبی حسن وجمال اور بلاغی دل آویزی ودل کشی کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

تشبیہ :

یہ ہے کہ ایک چیز کو کسی وصف میں دوسری چیز کے مثل بتایا جائے، جس کو مثل قرار دیں وہ ''مشبہ'' ہے اور جس کے مثل قرار دیں وہ ''مشبہ بہ'' اور جس وصف میں مشابہ قرار دیں وہ ''وجہِ شبہ'' اور جو لفظ تشبیہ ومماثلت کا معنی بتائے وہ ''اداتِ تشبیہ'' کہلاتا ہے، مثلاً ہم کہیں کہ ''حضرت عثمان غنی ﷺ جود وسخا میں دریا کی مانند ہیں'' تو ''عثمان غنی'' مشبہ، ''دریا'' مشبہ بہ، ''جود وسخا'' وجہِ شبہ، اور ''مانند'' اداتِ تشبیہ ہے۔

کلام میں وجہِ شبہ کبھی مذکور ہوتی ہے اور کبھی محذوف، پہلی قسم کو تشبیہِ مفصل اور دوسری صورت کو تشبیہِ مجمل کہتے ہیں۔

تشبیہ مفصل:

امام بوصیری کے کلام میں تشبیہ کی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں، تشبیہ مفصل کا استعمال بھی متعدد اشعار میں موجود ہے۔

(۱) سرکار دو عالم ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كَالزَّهْرِ فِيْ تَرَفٍ، وَالْبَدْرِ فِيْ شَرَفٍ وَالْبَحْرِ فِيْ كَرَمٍ، وَالدَّهْرِ فِيْ هِمَمِ

ترجمہ: (آپ تازگی میں کلی کی مانند، اوج و رفعت میں مہِ کامل کی طرح، جود و سخا میں دریا کے مثل اور ہمت و پامردی میں زمانہ کی طرح ہیں۔)

اس شعر میں چار تشبیہات ہیں اور سبھی تشبیہِ مفصل ہیں۔

(۲) قرآنی آیات کے اوصاف کے ضمن میں تشبیہ مفصل کی ایک بہار اور ملاحظہ کیجئے:

لَهَا مَعَانٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ فِيْ مَدَدٍ وَفَوْقَ جَوْهَرِهٖ فِي الْحُسْنِ وَالْقِيَمِ

ترجمہ: (ان کے معانی زیادتی اور کثرت میں سمندر کی لہروں کی طرح ہیں اور حسن و جمال اور قدر و قیمت میں موتیوں سے بڑھ کر ہیں۔)

تشبیہ مجمل:

وجہِ شبہ محذوف ہو تو تشبیہ مجمل ہوتی ہے۔

جیسے ''عمر کی نیکیاں ستاروں کی طرح ہیں'' ''نیکیاں'' مشبہ، ''ستارے'' مشبہ بہ، ''طرح'' اداتِ تشبیہ ہے، وجہِ شبہ مذکور نہیں

قصیدۂ بردہ میں تشبیہِ مجمل کی متعدد مثالیں ہیں:

(۱) انسانی نفس کو شیر خوار بچے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

والنفس كالطفل ان تهمله شب على حب الرضاع وان تفطمه ينفطم

ترجمہ: (نفس تو بچے کی طرح ہے جس کا دودھ چھڑا دیں تو چھوڑ دے گا ورنہ جوان ہو کر بھی

دودھ پینے کا رسیا رہے گا۔)

(۲) و کالصراط و کالمیزان معدلة فالقسط من غیرها فی الناس لم یقم

ترجمہ: (یہ استقامت میں پل صراط اور عدل میں میزان عمل کی طرح ہیں، ان کے سوا کسی اور سے عدل لوگوں میں قائم نہ رہا)۔

اس شعر میں دو تشبیہ ہیں، پہلی تشبیہ میں قرآنی آیات کو استقامت میں صراط کے مثل بتایا گیا ہے اور وجہِ شبہ ''استقامت'' محذوف ہے، جب کہ دوسری تشبیہ میں وجہِ شبہ ''عدل'' مذکور ہے، اس لیے وہ تشبیہ مفصل ہے۔

اداتِ تشبیہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) اداتِ تشبیہ مذکور ہو۔ (۲) اداتِ تشبیہ محذوف ہو۔ پہلی قسم کو تشبیہِ مرسل اور دوسری قسم کو تشبیہِ مؤکد کہا جاتا ہے۔

(۱) تشبیہ مرسل:

امام احمد رضا قادری بریلوی لکھتے ہیں:

دل عبث خوف سے پتے سا اڑا جاتا ہے پلّہ ہلکا سہی بھاری ہے بھروسا تیرا

تشبیہِ مجمل اور تشبیہِ مفصل کے تحت قصیدۂ بردہ سے پیش کردہ مذکورہ مثالیں تشبیہِ مرسل کی ہیں، کچھ اور مثالیں ضیافتِ طبع کے لیے حاضر ہیں۔

(۱) من لی برد جماح من غوایتها کما یردّ جماح الخیل باللجم

ترجمہ: (کون ہے جو میرے نفس سرکش کو شرارت اور سرکشی سے باز رکھے، جیسے لگام سے گھوڑوں کو سرکشی سے باز رکھا جاتا ہے۔)

(۲) اعیی الوریٰ فهم معناه فلیس یریٰ للقرب والبعد فیه غیرُ منفحم

کالشمس تظهر للعینین من بعد صغیرة و تکل الطرف من أمم

ترجمہ: (آپ کی حقیقت کے ادراک نے ساری خلقت کو عاجز کر دیا تو دور و نزدیک کہیں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو عاجز نہ ہو، جیسے سورج دور سے آنکھوں کو چھوٹا نظر آتا ہے اور قریب

سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

(۴) حضور اقدس ﷺ کی بعثت سے پہلے شیاطین چھپ کر فرشتوں کی باتیں سننے کے لیے بلا روک ٹوک آسمان پر آتے جاتے تھے اور زمین پر آ کر کاہنوں کو رنگ آمیزیوں کے ساتھ بتایا کرتے تھے، سرکار کی ولادتِ طیبہ ہوتے ہی انہیں آسمان پر جانے سے روک دیا گیا اور ان میں سے جس کو بھی اس کی کوشش کرتے دیکھا گیا اسے آگ کے شعلہ سے مارا گیا، جس سے بے تحاشا وہ وہاں سے بھاگے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، شیاطین کے بے تحاشا بھاگنے کا نقشہ تشبیہِ مرسل کے ذریعہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

كأنهم هربا أبطالُ أبرهة أو عسكرٌ بالحصىٰ مِن راحتيه رُمِي

ترجمہ: (بھاگنے میں وہ کعبہ پر حملہ آور ابرہہ کے سپاہیوں کی طرح تھے یا اس لشکر کی طرح جس پر سرکار نے جنگ میں اپنے ہاتھ سے کنکریاں پھینکیں۔)

تشبیہ مؤکد:

تشبیہ کی اس قسم میں اداتِ تشبیہ کے محذوف ہونے کی بنا پر مشبہ اور مشبہ بہ کی مماثلت کا دعویٰ پختہ، مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے، جس سے مضمون کی تاثیر بڑھ جاتی ہے، مثلاً: ہوا سے شاخیں لچکتی ہیں اور پھولوں میں خود بہ خود جنبش پیدا ہو جاتی ہے، اس منظر کو امیر مینائی نے تشبیہِ مؤکد کے ذریعہ اتنا دلکش بنا دیا ہے کہ جواب نہیں، فرماتے ہیں:

لچک ہے شاخ میں، جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

امام بوصیری نے قصیدۂ بردہ میں تشبیہِ مؤکد کا بھی استعمال کیا ہے، چند مثالیں حاضرِ خدمت ہیں:

(۱) رسول اکرم ﷺ فضل و کمال کے خورشیدِ تاباں اور مہرِ درخشاں ہیں، جب کہ دیگر رسولانِ کرام ستارے ہیں، اس مضمون کو باندھنے میں امام بوصیری نے دو تشبیہوں کا

پہلی تشبیہ میں سرکار کو فضل وکمال میں آفتاب کے مشابہ قرار دیا ہے، جو کہ تشبیہ سہارالیا ہے اور دوسری تشبیہ میں دیگر رسولانِ عظام کو ستاروں کے مثل کہا ہے جو کہ تشبیہِ بلیغ مؤکد ہے۔ فرماتے ہیں:

وکلُّ ایٍ اتی الرسل الکرامُ بها فانما اتصلت من نوره بِهِم

فانه شمسُ فضلٍ هم کواکبُها یظهرن أنوارها للناس فی الظُّلَم

ترجمہ: (تمام رسولان عظام سے جن معجزوں کا ظہور ہوا وہ آپ ہی کے نور سے ان کو ملے ہیں۔ کیوں کہ آپ آفتابِ فضل وکمال ہیں اور انبیاے کرام تارے ہیں جو اسی آفتاب کی روشنی تاریکیوں میں انسانوں کو دکھاتے رہے ہیں۔)

تشبیہ بلیغ:

جس تشبیہ میں وجہِ تشبیہ اور اداتِ تشبیہ دونوں محذوف ہوں وہ بہت بلیغ ہوتی ہے اسی لیے اس کو تشبیہِ بلیغ کہتے ہیں۔

٥ ڈاکٹر اقبال نے ''جگنو'' پر ایک نظم لکھی ہے، اس میں بعض تشبیہیں اتنی دل کش اور بلیغ ہیں کہ شاید ہی اتنی بلیغ تشبیہات اس مضمون پر ہوں، مثلاً:

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

٥ بعض باتیں بہ جاے خود بڑی انسانیت آموز ہوتی ہیں، لیکن اگر انہیں عام اندازِ بیان میں پیش کیا جائے تو دل ودماغ پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑتا، حالاں کہ ضرورت ہے کہ دلوں پر ان کا اثر اس طرح جما دیا جائے کہ ان کے تقاضے سے کبھی غفلت نہ ہو، مثلاً ''احباب کی دل شکنی نہ کرو''، کتنی انسانیت آموز تعلیم ہے، لیکن دل ودماغ پر اس کا اثر کتنا ہے، اچھا یہی بات اس شعر میں دیکھو جس میں میر انیسؔ نے تشبیہِ بلیغ کا سہارا لے کر اس مضمون کو باندھا اور کلام کو پر اثر بنانے میں کمال کر دیا ہے، کہتے ہیں:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس میں دوستوں کے دلوں کو آبگینوں (شیشوں) سے تشبیہ دی ہے، وجہ تشبیہ اور اداتِ تشبیہ دونوں محذوف ہیں۔

o امام احمد رضا قادری بریلوی چودھویں صدی ہجری میں صنفِ نعت کے سب سے باکمال شاعر ہیں، ان کے دیوان ''حدائق بخشش'' میں تشبیہِ بلیغ کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، ایک حدیثِ پاک کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اہل سنت کا ہے بیڑا پار اصحابِ حضور نجم ہیں اور ناؤ ہے عترت رسول اللہ کی

o حضور اکرم ﷺ اپنے بالوں میں تیل بہ کثرت استعمال فرماتے، کبھی کبھی تیل کی بوندیں بالوں سے ٹپک کر رخسار مبارک پر آجاتیں، امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ نے اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے رخسار مبارک کو صبح سے اور تیل کی بوندوں کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے، جو تشبیہِ بلیغ کی نہایت عمدہ مثال ہے، فرماتے ہیں:

تیل کی بوندیں ٹپکتی نہیں بالوں سے رضاؔ صبحِ عارض پہ لٹاتے ہیں ستارے گیسو

قصیدۂ بردہ میں امام بوصیری نے مضمون کو بیان کرنے اور مخاطب کے ذہن میں بٹھانے کے لیے جابجا ''تشبیہِ بلیغ'' کا سہارا لیا ہے، ذیل میں اس کی چند مثالیں قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) قدیم شرفائے عرب کا دستور تھا کہ جب وہ کوئی دعوت کرتے تو اس زمانہ میں جس طرح دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں یا زبانی پیغام دیا جاتا ہے یا عمومی دعوت ہو تو اشتہار و اعلان سے کام لیا جاتا ہے، اُس زمانہ میں لوگ ایسا کرتے تھے کہ رات میں پہاڑ پر کچھ خشک پتے اور لکڑیاں جلا دیتے، اس کے شعلے اٹھتے، ان سے روشنی ہوتی تو لوگ سمجھ لیتے کہ آج اس پہاڑی کے دامن میں کوئی اونٹ ذبح کیا گیا ہے اور سب کے لیے دعوت کا اعلان و اہتمام ہے، امام بوصیری رسول اکرم ﷺ کے روشن معجزات کو زمانۂ جاہلیت میں پہاڑی پر

روشن کی جانے والی اسی آگ سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

دعنی ووصفی ایات له ظهرت ظهورنا رالقری لیلاً علی علم

ترجمہ: مجھے سرکار اقدس ﷺ کے معجزات وآیات کو بیان کرنے دو جورات میں پہاڑی پر جلائی جانے والی آگ کی طرح واضح اور روشن ہیں۔

(۲) جب بھی کسی نے قرآن کی حرمت پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور اس کی کسی سورت یا آیت کا مقابلہ کرنا چاہا تو قرآنی بلاغت نے اس کی ہمت پست کردی اور اسے اپنے مقصد میں ناکام ونامراد بنادیا، اس مضمون کو امام بوصیری نے تشبیہِ بلیغ کے ذریعہ یوں باندھا ہے:

رَدَّتْ بَلاغَتُهَا دَعْوىٰ مُعَارِضِهَا رَدَّ الْغَيُوْرِ يَدَ الْجَانِیْ عَنِ الْحُرَمِ

ترجمہ: (ان آیات کریمہ کی بلاغت نے مقابلہ کرنے والوں کو اس طرح نامراد واپس کیا جیسے کوئی غیرت مند انسان اپنے گھر کی حرمت پر حملہ کرنے والے بدکردار کے ہاتھ کو روکتا اور پسپا کرتا ہے۔)

(۳) صحابۂ کرام کے عظیم الشان لشکر کو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

یجرُّ بحرَ خمیسٍ فوقَ سابحةٍ یَرمِی بموجٍ من الأبطالِ مُلتطم

ترجمہ: (یہ اپنے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر بہادر جیالوں کی فوج کا ایک ایسا سمندر کھینچ کر لاتا ہے جس کے بہادروں اور سورماؤں کی موج ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہے۔)

(۴) بہادرانِ اسلام کو استقامت اور ثابت قدمی میں پہاڑ سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کی بہادری کے جوہر یوں بیان کرتے ہیں:

هُمُ الجبالُ فَسَلْ عنهم مُصادمَهُم ماذا رأی منهم فی کل مُصْطَدَم

ترجمہ: (یہ حضرات پہاڑ ہیں تو ان کے بارے میں ان سے ٹکرانے والوں سے پوچھ لو کہ انہوں نے ہر معرکہ میں ان سے کیا کیا (بہادری کے جوہر) دیکھے۔)

(۵) ’’رسول اقدس ﷺ پر اللہ تعالیٰ ہمیشہ رحمت نازل فرماتا رہے‘‘ اس مضمون کو بیان کرنے کے لیے امام بوصیری نے تشبیہ بلیغ کی صورت کس مہارت، چابک دستی اور فن کاری کے ساتھ اختیار کی، اس کا صحیح اندازہ درج ذیل شعر سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے ’’صلوٰۃ‘‘ (رحمت) کو ’’سُحب‘‘ (بادلوں) سے تشبیہ دی ہے، بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں:

وَأْذَن لسحبِ صلاةٍ منك دائمةٍ   على النبيِ بمُنْهلٍ ومُنْسَجِم

ترجمہ: (اے اللہ! تو اپنی رحمت کے بادلوں کو حکم دے کہ سدا نبی کریم ﷺ پر موسلا دھار لگا تار رحمت کی بھرن برساتے رہیں۔)

تشبیہِ مقلوب:

یہ ہے کہ مشبہ بہ کو مشبہ اور مشبہ کو مشبہ بہ قرار دیا جائے، یعنی تشبیہ کو الٹ دیا جائے۔
اس کو یوں سمجھئے کہ عموماً تشبیہ کا فائدہ مشبہ سے متعلق ہوتا ہے، مگر کبھی تشبیہ کا فائدہ مشبہ بہ سے متعلق ہو جاتا ہے، کہ مشبہ بہ کی صفت بڑھا چڑھا کے دکھائی جاتی ہے، تفصیل یہ ہے کہ اصولاً وجہِ شبہ، مشبہ کی بہ نسبت مشبہ بہ میں اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے، لہٰذا کسی چیز کو مشبہ بہ قرار دینے کا یہی مطلب ہے کہ اس میں وجہِ شبہ نسبتاً اعلیٰ اور اکمل ہے، اب دو چیزوں میں جو شے نسبتاً اعلیٰ نہیں اسے مشبہ بہ قرار دیا جائے تو یہ دکھانا مقصود ہے کہ متکلم کی نگاہ میں یہی اعلیٰ ہے، جبھی تو اسے مشبہ بہ قرار دیا ہے، اصطلاح میں اسی قسم کی تشبیہ کو ’’تشبیہِ مقلوب‘‘ کہتے ہیں۔
عہدِ عباسی کا ایک عربی شاعر محمد بن وہب حمیری اپنے ممدوح کی تعریف کرتا ہوا کہتا ہے:

بَدَاالصَّبَاحُ كَأَنَّ غُـرَّتَـهُ   وَجْهُ الْخَلِيْفَةِ حِيْنَ يُمْتَدَحُ

ترجمہ: (صبح اس طرح نمودار ہوئی جیسے اس کی سپیدی مدح وستائش کے وقت خلیفہ کا (چمکتا دمکتا) چہرہ ہو۔)

عام رواج یہی ہے کہ کسی کے چہرہ کی آب وتاب بتانے کے لیے اسے سپیدۂ سحر سے تشبیہ دیتے ہیں، مگر شاعر نے یہاں اس کے برعکس کر کے یہ بتانا چاہا ہے کہ اپنی مدح وستائش

سننے کے وقت خلیفہ کے چہرہ کی آب وتاب اتنی بڑھ جاتی ہے کہ صبح کی سپیدی اور روشنی اس کے سامنے مات کھا جاتی ہے، اب وہ اس درجہ اکمل ہے کہ سپیدیِ سحر کو اس سے تشبیہ دی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''تشبیہ مقلوب'' کا استعمال وہیں ہوتا ہے جہاں مبالغہ مقصود ہو۔

قصیدہ بردہ میں بھی تشبیہِ مقلوب کے نمونے موجود ہیں، کچھ آپ بھی دیکھیں اور محظوظ ہوں:

(۱) سرکارِ اقدس ﷺ کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کانما اللؤلؤ المکنون فی صدف ‏ ‏ ‏ ‏ من معدنی منطق منه ومبتسم

ترجمہ: (ایسا لگتا ہے کہ سیپ میں پوشیدہ موتی آپ کے تکلم وتبسم کی کانوں سے ہیں۔)

دانتوں کے حسن وجمال اور ان کے آب دار ہونے کو بتانے کے لیے انہیں سیپ میں پوشیدہ موتیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے، مگر امام بوصیری نے یہاں تشبیہ الٹ دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپ کے دندانِ آب دار میں جو حسن وجمال اور آب وتاب ہے وہ سیپ کے آغوش میں چھپے ہوئے موتیوں میں کہاں؟ اس لیے یہ تشبیہ مقلوب ہے۔

(۲) صحابہ کرام اور بہادرانِ اسلام کی میدان جنگ میں شکل وصورت اور پوشاک کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

تُهدِی الیک ریاحُ النصر نشرَهم ‏ ‏ ‏ ‏ فتحسبُ الزهرَ فی الأکمامِ کلَّ کمی

ترجمہ: (فتح ونصرت کی ہوائیں ان کی خوشبو کا تحفہ تیرے پاس بھیجتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلاف میں لپٹی ہوئی کلی ان میں کا ہر ہتھیار بند ہو۔)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے یہ جیالے جو خود وزرہ پہنے ہوئے ہیں ایسے لگتے ہیں جیسے ناشگفتہ کلیاں ہوں، کلیاں پھولوں سے زیادہ حسین ہوتی ہیں، مگر امام بوصیری نے یہاں یہ نہیں کہا کہ زرہ پوش بہادرانِ اسلام ناشگفتہ کلیوں کی طرح ہیں، بلکہ تشبیہِ مقلوب اختیار کی کہ غلاف میں لپٹی ہوئی کلیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے اسلام کے زرہ پوش سپاہی۔

تشبیہ ضمنی :

وہ تشبیہ ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ تشبیہ کی معروف ومشہور صورتوں میں سے کسی صورت میں نہ ہو، بلکہ ترکیب میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے، اس تشبیہ کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ مشبہ کی طرف جس چیز کی نسبت کی گئی ہے وہ ممکن ہے، گویا وہ اس کے ممکن ہونے پر دلیل ہوتی ہے، اس میں باریکی اور لطافت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے، اسی لیے اس میں بلاغت، دل آویزی اور اثر انگیزی زیادہ ہوتی ہے، باریکی سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ نہایت ادق اور مغلق ہوتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور کائنات کے عمیق مشاہدے کا نتیجہ ہوتی ہے، کسی عامیانہ اور سطحی مضمون پر مشتمل نہیں ہوتی، باریکی اور لطافت بڑی عمیق نگاہی سے آتی ہے اور اس سے کلام عام سطح سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔

دور عباسی کا مشہور شاعر ابوالطیب متنبّی امیر اور اس کے شہزادے کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَاَصْبَحَ شِعْرِیْ مِنْهُمَافِیْ مَکَانِهٖ وَ فِیْ عُنُقِ الْحَسْنَاءِ یُسْتَحْسَنُ الْعِقْدُ

ترجمہ: (ان دونوں کے سلسلے میں میری شاعری مناسب اور برمحل ہے اور حسینہ کے گلے میں ہار اچھا اور خوب صورت لگتا ہی ہے۔)

اس شعر میں متنبّی نے ممدوحین کے سلسلے میں اپنی شاعری کے مناسب اور برمحل ہونے کو حسینہ کے گلے میں ہار کے خوب صورت اور برمحل ہونے سے تشبیہ دی ہے، لیکن یہ تشبیہ کی معروف صورتوں میں سے کسی صورت میں نہیں ہے، بلکہ اشارہ کی زبان میں تشبیہ کا یہ مضمون باندھا گیا ہے۔

متنبّی اپنے ایک اور ممدوح کی عام انسانوں پر فوقیت کا اظہار تشبیہ ضمنی کی صورت میں یوں کرتا ہے:

فَاِنْ تَفُقِ الْاَنَامَ وَ اَنْتَ مِنْهُمْ فَاِنَّ الْمِسْکَ بَعْضُ دَمِ الْغَزَالِ

ترجمہ: (اگر آپ لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں جب کہ آپ ان ہی میں سے ایک فرد ہیں تو اس میں کوئی حیرت وتعجب کی بات نہیں، کیوں کہ مُشک ہرن کے خون کا ہی حصہ ہوتی ہے۔)

امام بوصیری نے قصیدۂ بردہ میں تشبیہِ ضمنی کے استعمال سے مضمون کی تاثیر اور دل کشی کو یوں دوبالا کیا ہے:

وَلَنْ يَّفُوْتَ الْغِنىٰ مِنْهُ يَدا تَرِبَتْ اِنَّ الْحَيَا يُنْبِتُ الْاَزْهَارَ فِي الْاَكَمِ

ترجمہ: (آپ کی عطاوبخشش کسی محتاج کے ہاتھ کو خالی نہ چھوڑے گی، کیوں کہ بارش پہاڑیوں پر بھی پھول اگادیتی ہے۔)

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی بھی محتاج آپ کے دربار سے تہی دست نہیں جاتا، کیوں کہ تیز بارش ہوتی ہے تو صرف ہموار اور زرخیز زمین ہی پھول پودے نہیں اگاتی بلکہ کوہستان اور پتھریلی زمینوں پر بھی سبزہ اگنے لگتا ہے، لہذا اگر اعمال کے لحاظ سے ہمارا وجود پہاڑی پتھروں کی طرح سخت اور ناقابل روئیدگی ہے جب بھی آپ کے بارانِ جود وعطا کی کثرت اس کو فیضان سے محروم نہیں رکھے گی۔

اس شعر میں حضور اقدس ﷺ کی عطاوبخشش اور فیضان کے عموم کو بارش کے فیضانِ عمومی سے تشبیہ دی گئی ہے، کہ جیسے بارش کے فیضانِ عام سے سبھی مستفیض ہوتے ہیں یہاں تک کہ ٹیلے اور پہاڑیاں بھی اس سے وافر حصہ پاتی ہیں اسی طرح سرکار اقدس ﷺ کا فیضان عام ہے، کوئی محتاج، ضرورت مند، اس سے محروم نہیں رہ سکتا، مگر یہاں تشبیہ اپنی واضح صورتوں ومشہور قسموں میں سے کسی صورت میں نہیں ہے بلکہ ضمناً ہے۔

استعارہ:

کسی لفظ کو اس طرح مجازی معنی میں استعمال کرنا کہ حقیقی معنی مراد نہ لیے جاسکیں اور اس مجازی اور حقیقی معنی میں تشبیہ کا علاقہ ہو، مثلاً رأیتُ اسداً یرمی (میں نے ایک شیر کو تیر چلاتے ہوئے دیکھا) اس میں لفظ ''اسد'' میں استعارہ ہے، اور ''یرمی'' قرینہ ہے

جو یہ بتا رہا ہے کہ اس لفظ کے حقیقی معنی (یعنی مخصوص درندہ جانور) یہاں مراد نہیں۔

اس کو ذرا تفصیل سے یوں سمجھئے کہ ہم اگر کسی بہادر کی تعریف میں یہ کہیں کہ "وہ بڑا بہادر ہے" تو یہ معمولی اندازِ بیان ہے، اور اگر اسی بات کو یوں کہیں کہ "وہ شیر کے مثل ہے" تو یہ تشبیہ ہے اور اس سے کلام کا زور بڑھ جاتا ہے اور اگر کہا جائے کہ "وہ شیر ہے" (یعنی کلمۂ تشبیہ نکال دیں) تو کلام اور زیادہ زوردار ہو جائے گا اور اب بھی اسے تشبیہ ہی کہیں گے۔

لیکن اگر شخص کا مطلق ذکر نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ "میں نے ایک شیر دیکھا" اور مراد وہی شخص ہو تو یہ استعارہ ہے، اس مطلب کو ادا کرنے کا ایک اور طریقہ ہے کہ شیر کا بھی نام نہ لیا جائے بلکہ شیر کے کچھ خصوصیات اس شخص کے لیے استعمال کیے جائیں مثلاً یوں کہا جائے کہ "جب وہ میدان جنگ میں دہاڑتا ہوا نکلا تو ہلچل پڑ گئی" (دہاڑنا شیر کی آواز کو کہتے ہیں) یہ اندازِ بیان پہلے سے زیادہ زوردار، طاقت ور اور لطیف ہے اور یہ بھی استعارہ ہے۔

درحقیقت استعارہ، تشبیہ کی ایک مختصر صورت ہے، چنانچہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مذکور ہوتے ہیں اور استعارہ میں ان میں سے صرف ایک۔ ساتھ ہی استعارہ میں کلمۂ تشبیہ بھی مذکور نہیں ہوتا۔

استعارہ کبھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ مشبہ بہ مذکور ہوتا ہے اور مشبہ محذوف، اس کو استعارہ تصریحیہ یا استعارۂ مُصَرَّحہ کہتے ہیں، جیسے مذکورہ بالا مثال "میں نے ایک شیر دیکھا" اور اس سے مراد بہادر آدمی ہے، اور کبھی اس طرح کا ہوتا ہے کہ مشبہ بہ مذکور نہیں ہوتا لیکن اس کے کچھ خصوصیات مذکور ہوتے ہیں، اوپر کی اس عبارت میں کہ "جب وہ میدان جنگ میں دہاڑتا ہوا نکلا تو ہلچل پڑ گئی" ایسا ہی استعارہ ہے، اسے "استعارہ بالکنایہ" یا "استعارہ مکنیہ" کہتے ہیں، یہ بہت زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

استعارۂ تصریحیہ:

جیسا کہ اوپر گزرا کہ استعارۂ تصریحیہ میں مشبہ بہ کی صراحت ہوتی ہے اور مشبہ

محذوف ہوتا ہے، مثلاً اولاد کے بارے میں میر انیس کہتے ہیں:

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر　　راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر　　نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

مذکورہ بالا مثالوں میں ''آرام جگر''، ''پاکیزہ ثمر''، ''گل تر'' سے بطور استعارۂ تصریحیہ اولاد مراد ہے۔

اس موقع پر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قادری بریلوی کے نعتیہ کلام سے بھی محظوظ ہوتے چلیں اور استعارۂ تصریحیہ کا بے تکلف اور بے محابا استعمال دیکھتے چلیں، فرماتے ہیں:

واللہ جو مل جائے مرے گل کا پسینہ　　مانگے نہ کبھی عطر نہ پھر چاہے دلہن پھول
کیا بات رضا اس چمنستانِ کرم کی　　زہرا ہے کلی جس میں حسین اور حسن پھول
رہا جو قانع یک نانِ سوختہ دن بھر　　ملی حضور سے کانِ گہر جزائے فلک
لے طوقِ الم سے اب آزاد ہوائے قمری　　چٹھی لیے بخشش کی وہ سروِ رواں آیا

پہلے شعر میں ''گل'' سے مراد رسول اکرم ﷺ کی ذات، دوسرے شعر میں ''چمنستانِ کرم'' سے خانوادۂ نبوت، تیسرے شعر میں ''نانِ سوختہ'' سے سورج اور ''کانِ گہر'' سے ستاروں کی انجمن اور چوتھے شعر میں ''قمری'' سے گناہ گار عاشقِ سرکار اور ''سروِ رواں'' سے حضور شافع یوم النشور ﷺ مراد ہیں اور یہ سبھی استعارے استعارۂ تصریحیہ ہیں، جن سے مضمون کی تاثیر کے دوبالا ہونے کے ساتھ شاعر کا فنی کمال آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قصیدۂ بردہ میں استعارۂ مصرحہ کا جا بجا بے تکلف استعمال فرمایا ہے اور مضمون کی دل کشی اور رعنائی کو اوج ثریا تک پہنچا دیا ہے، اب ذرا قلب و ذہن کے دریچے کھول لیے اور سراپا توجہ بن کر مثالیں سماعت کیجیے اور ان کی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کیجیے:

(۱) نفس کی فریب کاریوں سے بچنے اور اس کے ہر داؤں پیچ سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَرَاعِهَا وَهْيَ فِي الْاَعْمَالِ سَائِمَةٌ   وَاِنْ هِيَ اسْتَحْلَتِ الْمَرْعیٰ فَلَا تُسِمِ

ترجمہ: (نفس اگر نوافل کے میدان میں چر رہا ہو تو اس وقت بھی اس کی نگرانی کر اور اگر یہ چارہ اسے میٹھا لگے تو چرنے سے روک دے۔)

اس شعر میں "سائمہ" استعمال کیا ہے، جس کے معنی چرنے والا ہے، جو دراصل جانوروں کی صفت ہے، اور یہاں اعمال نافلہ میں مصروفیت کو "میدان میں چرنے" سے تشبیہ دی ہے اور مشبہ بہ عبارت میں ذکر کر دیا ہے، لہذا یہ استعارۂ تصریحیہ ہے۔

(۲) رسول اکرم ﷺ کے علم و کرم کا یہ حال ہے کہ سارے انبیاے کرام اور رسولانِ عظام آپ کے در پہ سوال کرتے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

وَكُلُّهُمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ   غَرْفاً مِنَ الْبَحْرِ اَوْ رَشْفاً مِنَ الدِّيَمِ

ترجمہ: (وہ سب آپ کے دریاے علم و معرفت سے ایک چلو یا آپ کے بارانِ رحمت سے ایک گھونٹ کے طلب گار ہیں۔)

اس شعر میں امام بوصیری نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و معرفت کو "بحر" (سمندر) اور "دیم" (مسلسل بارش) سے تشبیہ دی ہے اور مشبہ بہ کو عبارت میں برقرار رکھا ہے، لہذا یہ دونوں استعارے استعارۂ تصریحیہ ہیں اور بحر کی مناسبت سے "غرف" (چلو) اور "دیم" کی مناسبت سے "رشف" (گھونٹ) کا ذکر ترشیح ہے۔

(۳) سرکار اقدس ﷺ کا مشہور معجزہ ہے کہ بعض اوقات بادل کا ٹکڑا آپ پر سایہ فگن رہتا، جو آفتاب کی تمازت سے آپ کو بچاتا، اس معجزہ کو بیان کرتے ہوئے آپ نے سورج کو "وطیس" (دہکتا ہوا تنور) سے تشبیہ دے کر استعارۂ تصریحیہ کے استعمال کی اعلیٰ مثال قائم فرمائی ہے، فرماتے ہیں

مِثْلُ الْغَمَامَةِ اَنّٰی سَارَ سَائِرَةٌ تَقِیْهِ حَرَّ وَطِیْسٍ لِلْهَجِیْرِ حَمِیْ

ترجمہ: (جس طرح ابر کا ٹکڑا جہاں آپ تشریف لے جاتے ہم راہ جاتا اور دوپہر کے تپتے ہوئے تنور کی گرمی سے آپ کو بچاتا۔)

(۴) استعارۂ تصریحیہ کے استعمال کا یہ انداز بھی کتنا دل فریب اور دل آویز ہے ملاحظہ کیجیے، آیات قرآنی کے تعلق سے فضیلتوں اور برکتوں کا تسلسل قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قَرَّتْ بِهَا عَیْنُ قَارِیْهَا فَقُلْتُ لَهٗ لَقَدْ ظَفِرْتَ بِحَبْلِ اللّٰهِ فَاعْتَصِمِ

ترجمہ: (تلاوت کرنے والے کی آنکھیں ان سے ٹھنڈی ہوئیں تو میں نے اس سے کہا: تو نے اللہ کی رسی پالی تو مضبوطی سے اسے پکڑے رہنا۔)

اس شعر میں قرآن کریم کو "حبل" (رسّی) سے تشبیہ دی اور مشبہ بہ کو صراحتاً ذکر کر کے استعارۂ تصریحیہ کی صورت میں مضمون کی ادائیگی فرمائی، پھر "اعتصام" (پکڑنا) لا کر اس استعارہ کو تصریحیہ کے ساتھ ترشیحیہ بھی بنا دیا اور کلام کی تاثیر اور معنوی ندرت کو ہم دوش ثریا کر دیا۔

درج بالا اشعار میں استعارۂ تصریحیہ کا کمال اہل علم و ادب پر مخفی نہیں، اختصار کے پیش نظر اس طرح کے سارے اشعار میں استعارہ کا اجرا نہ کرا کے صرف اشعار اور ان کے ترجمہ پر اکتفا کرتا ہوں، اہل ذوق حضرات خط کشیدہ الفاظ پر غور کر کے اسے محسوس کر سکتے ہیں:

(۵) بُشْرٰی لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا مِنَ الْعِنَایَةِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْهَدِمِ

ترجمہ: (ہم مسلمانوں کی یہ انتہائی خوش بختی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہمیں ایک ستون میسر آ گیا ہے جو کبھی زمیں بوس نہیں ہو سکتا۔)

اس شعر میں "رکن" (ستون) سے بطور استعارہ شریعت اسلامیہ مراد ہے اور "غیر منہدم" (ناقابل انہدام) کا ذکر ترشیح ہے۔

(۶) یَجُرُّ بَحْرَ خَمِیْسٍ فَوْقَ سَابِحَةٍ یَرْمِیْ بِمَوْجٍ مِنَ الْاَبْطَالِ مُلْتَطِمِ

ترجمہ: (یہ اپنے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر بہادر جیالوں کی فوج کا ایسا دریا کھینچ کر لاتا ہے

جو بہادروں کی کثرت سے موج زن ہے۔)

(۷) حتّٰی غدَتْ مِلَّةُ الْإِسْلامِ وهْيَ بِهِمْ مِنْ بَعْدِ غُرْبَتِهَا مَوْصُوْلَةَ الرَّحِمِ

ترجمہ: (یہاں تک کہ ملت اسلام بے گانہ واجنبی ہونے کے بعد ان دلاوروں سے تعلق کے باعث رشتہ وقرابت والی ہوگئی۔)

(۸) طَارَتْ قُلُوْبُ الْعِدَا مِنْ بَأْسِهِمْ فَرَقاً فَمَا تُفَرِّقُ بَيْنَ الْبَهْمِ وَالْبُهَمِ

ترجمہ: (ان کے رعب ودہشت سے دشمنوں کے ہوش اس طرح اڑ گئے کہ وہ بھیڑ بکریوں کے بچوں اور بہادر جیالوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔)

(۹) فَيَا خَسَارَةَ نَفْسِيْ فِيْ تِجَارَتِهَا لَمْ تَشْتَرِ الدِّيْنَ بِالدُّنْيَا وَلَمْ تَسُمِ

ترجمہ: (تو ہائے افسوس! میرا نفس تجارت میں کس قدر نقصان سے دوچار ہوا کہ اس نے نہ دنیا کے بدلے دین خریدا اور نہ ہی اس کا مول بھاؤ کیا۔)

(۱۰) وَإِنْ آتِ ذَنْباً فَمَا عَهْدِيْ بِمُنْتَقِضٍ مِنَ النَّبِيِّ وَلَا حَبْلِيْ بِمُنْصَرِمِ

ترجمہ: (اگر مجھ سے کوئی گناہ ہوجائے تو بھی سرکار سے میرا عہد ٹوٹنے والا اور میرا رشتہ منقطع ہونے والا نہیں۔)

استعارۂ مکنیہ:

وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ عبارت میں مذکور نہ ہو بلکہ اس کے خصوصیات میں سے کسی کو ذکر کر دیا جائے، جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا۔

تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو جو عظمت ورفعت حاصل ہے وہ کسی بھی مخلوق کو حاصل نہیں۔ یہاں تک کہ ان کی چوکھٹ اتنی باعظمت ہے کہ آسمان جو بلندی بتانے کے لیے ضرب المثل ہے اس کو بھی وہ رفعت وعظمت حاصل نہیں۔ یہ عظمت ورفعت حاصل ہونا تو بہت دور کی بات ہے حقیقت تو یہ ہے کہ عظمت آستان رسالت کی جہاں سے ابتدا ہوتی ہے وہاں آسمان کی عظمت ورفعت کی انتہا ہوجاتی ہے۔ اس مضمون کو

بیان کرنے کے لیے امام احمد رضا قادری بریلوی نے استعارہ مکنیہ کا بہار کی استعمال کیا ہے، فرماتے ہیں:

سر فلک نہ کبھی تا بہ آستاں پہنچا　　　　کہ ابتدائے بلندی تھی انتہائے فلک

اس شعر میں "فلک" کو ایک انسان سے تشبیہ دی، پھر مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کی خصوصیات میں سے "سر" کا ذکر کر دیا۔

اسی طرح درج ذیل شعر کے خط کشیدہ الفاظ میں استعارہ مکنیہ کی دل کشی ملاحظہ کیجیے، ساتھ ہی حسنِ تعلیل اور تشبیہ کی ندرت بھی دیکھیے:

اگرچہ چھالے ستاروں سے پڑ گئے لاکھوں　　　　مگر تمہاری طلب میں تھکے نہ پائے فلک

ابوالعتاہیہ نے خلیفہ مہدی عباسی کو خلیفہ بننے پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا:

اَتَتْهُ الْخِلافَةُ مُنْقادَةً　　　　اِلَيْهِ تُجَرِّرُ اَذْيالَها

ترجمہ: (خلافت تابع دار بن کر اپنے دامن کھینچتے ہوئے اس کے پاس حاضر ہوئی۔)

قصیدۂ بردۃ المدیح میں استعارہ مکنیہ کی بہت سے مثالیں موجود ہیں چند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

(۱) نفس کی نگرانی کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَرَاعِهَا وَهِيَ فِي الْاَعْمَالِ سَائِمَةٌ　　　　وَاِنْ هِيَ اسْتَحْلَتِ الْمَرْعَىٰ فَلَا تُسِمِ

ترجمہ: (نفس کی نگرانی اس وقت (بھی) کرتا رہ جب کہ وہ اعمال صالحہ کی انجام دہی میں مصروف ہو اور اگر یہ چارہ اسے میٹھا لگے تو چرنے سے روک دے۔)

اس شعر میں نفس کو ایک جانور سے تشبیہ دی ہے پھر مشبہ بہ (جانور) کو حذف کر کے اس کے خصائص میں سے ایک خصوصیت "سائمہ" (چرنے والا) ذکر کر دیا ہے، تو یہ استعارہ بالکنایہ ہوا۔

(۲) معجزات رسالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَاَحْيَتِ السَّنَةَ الشَّهْبَاءَ دَعْوَتُهُ   حَتّٰى حَكَتْ غُرَّةً فِي الْاَعْصُرِ الدُّهُمِ

ترجمہ: (بارہا آپ کی دعا نے قحط رسیدہ سال کو ایسی شادابی بخشی کہ وہ سرسبز و شاداب زمانوں میں بے حد نمایاں ہوگیا۔)

یہاں امام بوصیری نے ''السَّنة'' (سال) کو گھوڑے سے تشبیہ دی ہے پھر مشبہ بہ (گھوڑا) حذف کر کے اس کی ایک خصوصیت ''الشَّهبَاء'' (سفید) کو ذکر کر دیا، اسی طرح لفظ ''الأعصُر'' (زمانے) میں استعارۂ مکنیہ ہے۔

ان دونوں استعارات میں امام بوصیری کا فنی اور بلاغی کمال اور علمی و ادبی مہارت اور قادر الکلامی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فرما نظر آتی ہے جسے کما حقہٗ اس میدان کے شہ سوار ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

درج ذیل اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کر کے استعارۂ مکنیہ کی چاشنی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

(۳) قرآنی آیات کے فضائل و مناقب کے بیان میں لکھتے ہیں:

انْ تَتْلُهَا خِيفَةً مِنْ حَرِّ نَارِ لَظَى   اطْفَأتَ نَارَ لَظَى مِنْ وِرْدِهَا الشَّبِمِ

ترجمہ: (اگر آتش جہنم کے خوف سے تو ان کی تلاوت کرتا ہے تو ان کے ورد کی ٹھنڈک سے تو آتش جہنم کو بجھا دے گا۔)

(۴) يَجُرُّ بَحْرَ خَمِيسٍ فَوْقَ سَابِحَةٍ   يَرْمِي بِمَوْجٍ مِنَ الْابْطَالِ مُلْتَطِمِ

([illegible]یا اپنے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر بہادر جیالوں کی فوج کا ایسا دریا کھینچ کر لاتا ہے [illegible] کی کثرت سے موجزن ہے۔)

[illegible] امام کی انتھک کوششوں اور غزوات و سرایا میں داد شجاعت دینے اور جرأت [illegible] بہادری کے جوہر دکھانے سے اسلام کو جس شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی حفاظت کا جیسا سامان ہوا، امام بوصیری کے الفاظ میں سنیے:

حَتّٰی غَدَتْ مِلَّةُ الْاِسْلَامِ وَهِیَ بِهِمْ مِنْ بَعْدِ غُرْبَتِهَا مَوْصُوْلَةَ الرَّحِمِ

مَكْفُوْلَةً اَبَدًا مِنْهُمْ بِخَیْرِ اَبٍ وَّ بِخَیْرِ بَعْلٍ فَلَمْ تَیْتَمْ وَلَمْ تَئِمِ

ترجمہ: (یہاں تک کہ ملتِ اسلام بے گانہ واجنبی ہونے کے بعد ان دلاوروں سے تعلق کی بناپر رشتہ وقرابت والی ہوگئی اور یہ ملت حقہ اب یتیم و بیوہ کی طرح نہ رہی بلکہ سرکار اور ان کے نائبین کی بہ دولت گویا ایک بہترین باپ اور بہترین خاوند کی کفالت میں آچکی ہے۔)

یہ سچ ہے کہ استعارے خصوصاً استعارہ بالکنایہ بیان کا زیور اور زبان کا جوہر ہیں، ان سے ایک آدھ لفظ میں وہ سب کچھ ادا ہو جاتا ہے جو کئی جملوں میں بھی اس خوبی سے ادا نہیں ہو سکتا، اسی لیے ان سے خود بہ خود (۱) کلام میں اختصار، (۲) بیان میں زور اور تاثیر، (۳) اور مضمون میں وسعت آجاتی ہے، جیسا کہ درج بالا مثالوں کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہے اور اسی کے ساتھ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا شاعرانہ کمال، ادیبانہ جلال اور فنی حسن و جمال بھی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ عیاں ہے۔

استعارۂ اصلیہ و تبعیہ:

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ استعارہ اصل میں تشبیہ کی ایک مختصر صورت ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ میں سے کوئی ایک مذکور ہوتا ہے، تو جس طرح تشبیہ کے چار ارکان ہوتے ہیں اسی طرح استعارہ کے ارکان بھی چار ہوتے ہیں۔

(۱) مُستعار لہٗ: یہ مشبہ ہے۔ (۲) مُستعار منہ: یہ مشبہ بہ ہے۔ (۳) مُستعار: یہ وہ لفظ ہے جو استعارہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (۴) جامع: یہ وجہِ شبہ ہے۔

مُستعار کے اعتبار سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں، (۱) استعارہ اصلیہ، (۲) استعارہ تبعیہ، اگر لفظ مُستعار اسم جنس یا مصدر ہو تو استعارہ اصلیہ ہے اور اگر لفظِ مُستعار فعل یا اسم فعل یا اسم مشتق یا حرف یا اسم مبہم ہو تو استعارہ تبعیہ ہے۔

استعارۂ اصلیہ :

اس استعارہ میں مُستعار اسم جنس یا مصدر ہوتا ہے، مثلاً بہادر کا استعارہ شیر سے کریں جو کہ اسم جنس ہے، ''یا سخت مار'' کا استعارہ قتل سے کریں جو کہ مصدر ہے، درج ذیل اشعار میں بھی استعارہ اصلیہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہوجائے (اصغر)
کلی کی آنکھ کھل جائے، چمن بیدار ہوجائے

جدھر بھی مستیِ دریا نے رخ کیا اپنا (جگر)
تڑپ کے موج اٹھی ، جھوم کے حباب اٹھا

جس میں کہ ترے جلوے خود تیرتے پھرتے ہیں (جگر)
اس خون کا ہر قطرہ کونین کا حاصل ہے

نہ ہوگا کچھ انحصار کعبہ، نہ دیر کا کچھ وقار ہوگا (بیدم وارثی)
وہیں پہ سجدے برس پڑیں گے جہاں مکیں حسن یار ہوگا

قصیدۂ بردہ میں استعارۂ اصلیہ کے انوار وتجلیات جا بجا جگمگاتے نظر آتے ہیں جو اہل فن اور اربابِ ذوق کے لیے تسکین کا سامان ہیں، نمونہ کے طور پر چند مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں:

(۱) بُشْریٰ لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا مِنَ الْعِنَایَۃِ رُکْناً غَیْرَ مُنْهَدِمِ

ترجمہ: (ہم مسلمانوں کی یہ انتہائی خوش بختی ہے کہ عنایت خداوندی سے ہمیں ایک ایسا ستون میسر آگیا ہے جو کبھی زمیں بوس ہونے والا نہیں۔)

اس شعر کے اندر ''رُکنا'' میں استعارہ جاری ہوا ہے جو کہ اسم جنس ہے، اس طرح اس میں استعارۂ اصلیہ ہے۔

(۲) وَالنَّارُ خَامِدَۃُ الْاَنْفَاسِ مِنْ اَسَفٍ عَلَیْهِ وَالنَّهْرُ سَاهِی الْعَیْنِ مِنْ سَدَمِ

ترجمہ: اس کے غم میں آتش کدہ کے شعلے سرد پڑ گئے اور رنج والم کے باعث دریائے فرات

کشف بردہ

کا سر چشمہ بہنے کی بجائے ٹھہر گیا۔

(۴) مِثْلُ الْغَمَامَةِ اَنّٰی سَارَ سَائِرَةٌ　　　تَقِیْهِ حَرَّ وَطِیْسٍ لِلْهَجِیْرِ حَمِیْ

ترجمہ: (جس طرح ابر کا ٹکڑا جہاں آپ تشریف لے جاتے ہم راہ جاتا اور دو پہر کو آفتاب کی سخت تمازت سے آپ کو بچاتا۔)

ان مثالوں کے سوا استعارۂ تصریحیہ کی مثالوں میں سے نمبر ۲، ۴، ۱۰ میں بھی استعارۂ اصلیہ پایا جاتا ہے، اگر پورے قصیدہ میں اس حیثیت سے غور کیا جائے تو ایک طویل دفتر تیار ہو جائے گا، مگر ہمارے پیش نظر قصیدہ میں محاسن بلاغت اور وجوہِ بیان کی چند جھلکیاں دکھانا ہے، سب کا احاطہ مقصود نہیں، اس لیے اسی پر قلم روکتا ہوں۔

استعارۂ تبعیہ:

استعارۂ تبعیہ میں مستعار فعل، اسم فعل، اسم مشتق، اسم مبہم یا حرف ہوتا ہے، جیسے:

مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا بجلی میں
آنکھ سی کوہ و بیاباں کی جھپک جاتی ہے　　(جوشؔ)

اس مثال میں "مسکراتی ہے" سے بطور استعارہ تبعیہ "چمکتی ہے" مراد ہے۔

زور سے صیاد نے بلبل کے پر جب کس دیے
اپنا اپنا دل ہے، شبنم روئی، غنچے ہنس دیے　　(آرزوؔ)

بحر سائل کا ہوں سائل، نہ کنویں کا پیاسا
خود بجھا جائے کلیجا مرا چھینٹا تیرا　　(رضاؔ بریلوی)

قصیدۂ بردۃ المدیح کے دامن میں بھی استعارۂ تبعیہ کے نہ جانے کتنے گلہائے خوش رنگ اپنی خوشبو لٹا رہے ہیں، قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لیے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

(۱) وَرَاعِهَا وَهِیَ فِی الْاَعْمَالِ سَائِمَةٌ　　　وَاِنْ هِیَ اسْتَحْلَتِ الْمَرْعٰی فَلَا تُسِمِ

ترجمہ: (نفس کی نگرانی اس وقت (بھی) کرتا رہ جب کہ وہ اعمال صالحہ کی
مصروف ہواور اگر یہ چارہ اسے میٹھا لگے تو اسے چرنے سے روک دے۔)

(۲) وَاَحْيَتِ السَّنَةَ الشَّهْبَآءَ دَعْوَتُهٗ حَتّٰى حَكَتْ غُرَّةً فِى الْاَعْصُرِ الدُّهُمِ

ترجمہ: بارہا آپ کی دعا نے قحط رسیدہ سال کو ایسی شادابی بخشی کہ وہ سر سبز و شاداب
میں بے حد نمایاں ہو گیا۔

(۳) طَارَتْ قُلُوْبُ الْعِدَا مِنْ بَاْسِهِمْ فَرَقاً فَمَا تُفَرِّقُ بَيْنَ الْبُهْمِ وَالْبُهَمِ

ترجمہ: (ان کے رعب و دہشت سے دشمنوں کے ہوش اس طرح اڑ گئے کہ وہ بھیڑ بکریوں
کے بچوں اور بہادر جیالوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔)

(۴) فَيَا خَسَارَةَ نَفْسِىْ فِىْ تِجَارَتِهَا لَمْ تَشْتَرِ الدِّيْنَ بِالدُّنْيَا وَ لَمْ تَسُمِ

ترجمہ: (تو ہائے افسوس! میرا نفس تجارت میں کس قدر نقصان سے دوچار ہوا کہ اس نے نہ
دنیا کے بدلے دین خریدا اور نہ ہی اس کا مول بھاؤ کیا۔)

مجاز مرسل :

یہ ہے کہ لفظ کو اس طرح مجازی معنی میں استعمال کیا جائے کہ حقیقی معنی مراد نہ لے سکیں اور اس مجازی اور حقیقی معنی میں تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ کوئی اور علاقہ ہو۔

مجاز مرسل میں معنیٰ حقیقی اور مجازی کے درمیان متعدد قسم کے علاقے ہوتے ہیں، مثلاً:
۱۔کلیت، ۲۔جزئیت، ۳۔لازمیت، ۴۔ملزومیت، ۵۔سببیت، ۶۔مسببیت، ۷۔آلیت، ۸۔حالیت، ۹۔محلّیت، ۱۰۔بدلیت، ۱۱۔مبدلیت، ۱۲۔اطلاق، ۱۳۔تقیید، ۱۴۔عموم، ۱۵۔خصوص، ۱۶۔اعتبار حالت ماضیہ، ۱۷۔اعتبار حالت مستقبلیہ، ۱۸۔تعلق اشتقاقی، مثلاً اسم فاعل کا صیغہ بول کر اسم مفعول کا معنیٰ مراد لینا اور اسم مفعول کا صیغہ بول کر اسم فاعل کا معنیٰ مراد لینا وغیرہ، تفصیل کے لیے اس فن کی مطولات کا مطالعہ کریں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مجاز مرسل عروسِ شعر کا زیور ہے، جس طرح تشبیہ اور استعارہ

سے شعر میں حسن اور کلام میں جان پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح مجاز مرسل سے کلام میں بلندی اور رفعت بھی پیدا ہوتی ہے اور پیرایۂ ادا میں بانکپن بھی، بہر حال مجاز مرسل بھی تشبیہ و استعارہ اور کنایہ کی طرح سے آرائش کلام اور ندرتِ مضمون کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے برمحل استعمال سے کلام بلیغ ہو جاتا ہے، یا اس کی بلاغت نقطۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے، شاعر کبھی ارادی اور کبھی غیر ارادی طور پر مجاز کے ان قرینوں کا استعمال کرتا ہے جس کے لیے بڑے سلیقے اور قرینے کی ضرورت ہوتی ہے بالخصوص نعتیہ شاعری میں۔

قصیدۂ بردہ میں مجاز مرسل کی جلوہ ریزیاں پورے شباب پر ہیں جس سے اہلِ ذوق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، ان کی کچھ جھلکیاں آپ بھی دیکھیں اور لذت فکر ونظر کا سامان کریں، فرماتے ہیں:

(۱) وَسَاءَ سَاوَةَ اَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُهَا   وَرُدَّ وَارِدُهَا بِالْغَيْظِ حِيْنَ ظَمِيْ

ترجمہ: (اور اہل ساوہ کو یہ غم پہنچا کہ ان کی جھیل خشک ہو گئی اور اس پر آنے والے پیاسے کو غم وغصہ کے ساتھ واپس ہونا پڑا۔)

''ساوہ''، ہمدان اور رَے کے درمیان ایک بستی کا نام ہے، مگر یہاں مراد اس بستی کے باشندے ہیں، تو ظرف بول کر مظروف مراد لیا گیا ہے جیسے قرآن کریم میں ہے، ''وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِىْ كُنَّا فِيْهَا ''(یوسف: ۸۲)(اس بستی سے پوچھ لیجیے جس میں ہم تھے) ہر ذی شعور جانتا ہے کہ یہاں بستی سے مراد اس بستی کے باشندے ہیں، کیوں کہ بستی کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی، جواب تو بستی کے باشندے دیتے ہیں۔

(۲) فَالصِّدْقُ فِى الْغَارِ وَالصِّدِّيْقُ لَمْ يَرِمَا   وَهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا بِالْغَارِ مِنْ اَرِمِ

ترجمہ: (تو پیکر صداقت اور صدیق امت دونوں غار ثور ہی میں تھے جب کہ کفار کہتے رہے کہ غار میں تو کوئی شخص نہیں۔)

اس شعر میں ''صدق'' مصدر بول کر ''صادق'' اسم فاعل کا معنی مراد لیا گیا ہے، معنی

حقیقی اور مجازی کے درمیان علاقہ ''تعلق اشتقاقی'' ہے۔

(۳) كَاَنَّهَا الْحَوْضُ تَبِيْضُ الْوُجُوْهُ بِهٖ مِنَ الْعُصَاةِ وَقَدْ جَاؤُهُ كَالْحُمَمِ

ترجمہ: (گویا یہ قرآنی آیات حوض ہیں جن سے گنہ گاروں کے چہرے روشن ہو جائیں گے جب کہ وہ کوئلوں کی طرح سیاہ ہو کر وہاں آئیں گے۔)

اس شعر میں ''حوض'' سے مراد حوض کا پانی ہے، تو یہاں ظرف بول کر مظروف مراد لیا گیا ہے، جو مجاز مرسل کی ایک صورت ہے۔

(۴) وَمَا حَوَى الْغَارُ مِنْ خَيْرٍ وَّ مِنْ كَرَمٍ وَ كُلُّ طَرْفٍ مِنَ الْكُفَّارِ عَنْهُ عَمِىْ

ترجمہ: (اور غار ثور نے جس سراپا خیر اور مجسم کرم کو اپنی آغوش میں لیا جب کہ تمام کفار کی آنکھیں ان سے اندھی ہو گئی تھیں۔)

کنایہ :

کنایہ، یہ ہے لفظ کے مجازی معنی مراد لیے جائیں اور حقیقی و مجازی معنی کے درمیان لزوم پایا جاتا ہو، لیکن بشرط گنجائش اصلی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہوں، مثلاً پاک دامن کہیں اور پاکیزہ کردار کا آدمی مراد لیں، ساتھ ہی یہ بھی مراد لے سکتے ہوں کہ اس کا لباس اور دامن صاف ستھرا رہتا ہے، بشرطے کہ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ لباس پہنتا ہو۔

کنایہ بڑا حسین و بلیغ اندازِ بیان اور دل کش طرز تعبیر ہے، اس سے بہت سے مضامین کے نہایت خوب صورت اور بلیغ پہلو نکل آتے ہیں، مثلاً:

(الف) بعض اوقات ادیب اور شاعر کو اس قسم کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے کہ مضمون کا پیش کرنا تو ضروری ہے، لیکن اس کے واسطے جو الفاظ مقرر ہیں اگر انہیں الفاظ میں اسے پیش کر دیا جائے تو کلام ہلکا یا بے اثر معلوم ہوتا ہے، ایسے موقع پر کنایہ سے کام لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ دقت دور ہو جاتی ہے، بلکہ مضمون کی ادائیگی کا نہایت بلیغ اور انوکھا اسلوب بھی [illegible] قسم کے کنایے ہر زبان میں ہیں اور بہ کثرت ہیں۔

(ب) بعض اوقات مخاطب کے احترام کا تقاضا ہوتا ہے کہ مضمون کو کھلے الفاظ میں بیان نہ کیا جائے، ایسے موقع پر بھی کنایہ سے نہایت بلیغ پیرایۂ بیان پیدا ہو جاتا ہے، اس کی بڑی دل چسپ اور دماغ افروز مثال تاریخ کا یہ واقعہ ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے ایک شخص کے ہاتھ میں بید کا بنڈل دیکھا، عربی زبان میں بید کو ''خیزران'' کہتے ہیں اور عرب اس کے نیزے بھی بناتے ہیں، یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خیزران ہارون رشید کی والدہ کا نام بھی ہے۔ ہارون اسے دیکھتے ہی اپنے وزیر ''ربیع'' سے پوچھتا ہے:

ماھٰذا؟ (یعنی یہ کیا ہے؟)

اس کا عربی جواب تو یہی ہے کہ:

خیزران یا أمیر المومنین (یعنی، امیر المومنین! یہ خیزران (بید) ہے)۔

لیکن بیدار مغز اور ہوش مند وزیر یہ نہیں کہتا، کیوں کہ خیزران خلیفہ کی والدہ کا نام ہے، بلکہ جواب دیتا ہے: عروق الرماح یا أمیر المومنین! (یعنی، امیر المومنین! یہ نیزے کی رگیں ہیں)۔

غور کرو، اگر وزیر یہ کہتا کہ: ''خیزرانُ یا أمیر المومنین!'' تو کیسی نازک اور خطرہ والی صورت پیدا ہو جاتی، بیدار مغز وزیر اس نکتہ سے بہ خوبی واقف تھا کہ مخاطب خلیفۂ وقت ہے، اس کی عظمت وجلالت کا تقاضا کیا ہے؟ اور کھلے الفاظ میں جواب دینے سے کیا صورت پیدا ہو سکتی ہے؟ ایسے نازک موقع پر وہ کنایہ سے کام لیتا ہے اور اس طرح معاملہ کی نزاکت پر قابو پالیتا ہے، یہی نہیں کہ نزاکت پر قابو پالیا، بلکہ اس موقع سے نہایت بلیغ اور دل آویز اسلوبِ بیان بھی پیدا ہو گیا ہے جو اپنی خوبیوں میں ایک ادبی شاہ کار ہے۔

(ج) بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ دل مضمون پیش کرنے کے لیے بے چین ہے لیکن ابہام بھی ناگزیر ہے، ایسی صورت میں یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ کھلے الفاظ میں مضمون پیش کیا جائے، بس اس موقع پر کنایہ ہی سے کا[illegible] مناسب ہے [illegible]

نہایت ہی بلیغ اسلوبِ بیان ہے، مثلاً:

لیتے نہیں بزم میں مرا نام کہتے ہیں خیال ہے کسی کا (داغ)

"کسی" کے لفظ میں بڑا لطیف کنایہ ہے، اس کے اصلی معنی تو ظاہر ہیں اور مجازی معنی ہیں چاہنے والا، اس کنایہ نے ایک طرف مضمون ادا کیا ہے دوسری طرف نہایت لطیف ابہام پیدا کر دیا ہے، جس سے کلام کی دل کشی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

"کسی" کے لفظ سے کنایہ کا ایک اور شعر سنئے:

کمبخت وہی داغ نہ ہو دیکھو تو کوئی
بے چین کیے دیتی ہے فریاد کسی کی (داغ)

ذیل میں کنایہ کی کچھ اور مثالیں ضیافتِ طبع کے لیے حاضر ہیں:

شباب میکش، جمال میکش، خیال میکش، نگاہ میکش
خبر وہ رکھیں گے کیا کسی کی، انہیں خود اپنی خبر نہیں ہے (جگر)

دیکھنے آئے ہیں وہ جب نزع کا ہنگام ہے
میری جانب سے کوئی کہہ دو کہ اب آرام ہے (نیر اکبرآبادی)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے قصیدۂ بردہ میں جا بہ جا مضمون کی ادائیگی اور وارداتِ قلب کو بیان کرنے میں کنایہ کا سہارا لیا ہے اور کلام کو دل آویزی اور تاثیر کے ذروۂ کمال تک پہنچا دیا ہے، لیجیے خود اپنی آنکھوں سے اس کا نظارہ کیجیے، فرماتے ہیں:

(۱) وَاسْتَفْرِغِ الدَّمْعَ مِنْ عَيْنٍ قَدِ امْتَلَأَتْ مِنَ الْمَحَارِمِ وَالْزَمْ حِمْيَةَ النَّدَمِ

ترجمہ: (حرام سے لبریز آنکھ کا علاج آنسوؤں کے استفراغ اور اشک باری سے کر، پھر ہمیشہ ندامت کا پرہیز اختیار کر۔)

"حرام سے لبریز آنکھ" سے بطور کنایہ وہ آنکھ مراد ہے جو بکثرت ناجائز اور حرام چیزوں کو دیکھتی ہو، اس شعر میں امام بوصیری نے کنایہ کے ساتھ علم طب کی اصطلاح

''استفراغ''اور''حمیہ''(پرہیز)استعمال فرما کر مضمون شعر کو ہم دوش ثریا کر دیا ہے جسے پڑھ کر اہل ذوق پھڑک اٹھتے ہیں اور ان کے قلب وذہن میں آپ کے شاعرانہ کمال اور فنی جاہ وجلال کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

(۲) ظَلَمْتُ سُنَّةَ مَنْ اَحْیی الظَّلَامَ اِلیٰ اِنِ اشْتَکَتْ قَدَمَاهُ الضُّرَّ مِنْ وَّرَمٖ

ترجمہ:(میں نے ان کی سنت کا حق ادا نہ کیا جواتنی زیادہ عبادت وشب بیداری کرتے کہ قدموں میں ورم کی شکایت ہو جاتی۔)

اس شعر میں ''اشتکاء القدمین'' سے بطور کنایہ درد والم کی شدت کا اظہار مراد ہے جو کثرتِ قیام سے پیدا ہوتی تھی۔

(۳) وَاَنْتَ تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ بِهِمْ فِیْ مَوْکِبٍ کُنْتَ فِیْهِ صَاحِبَ الْعَلَمِ

ترجمہ: آپ ساتوں آسمانوں کا سفر پیغمبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے ملائکہ کے جلوس میں کر رہے تھے،جس کے سردار علم بردار آپ ہی تھے۔

یہاں ''صَاحِب العَلَم ''(علم بردار) سے بطور کنایہ سردار مراد ہے یا نمایاں حیثیت کا مالک، کیوں کہ جس کے ہاتھوں میں جھنڈا ہوتا ہے وہ ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔

(۴) اَلْمُصْدِرِي الْبِیْضِ بَعْدَ مَاوَرَدَتْ مِنَ الْعِدیٰ کُلَّ مُسْوَدٍّ مِّنَ اللِّمَمِ

ترجمہ: وہ صحابۂ کرام اپنی سفید تلواریں دشمنوں کے سیاہ بالوں پر آزما کر سرخ بنا کر واپس لاتے۔

اس شعر میں امام بوصیری نے سیاہ بال والے دشمنوں سے بطور کنایہ یہ بتایا ہے کہ صحابۂ کرام اپنی چمکتی تلواروں کا وار جن دشمنوں پر کرتے تھے وہ جوان ہوتے تھے، بوڑھے اور ضعیف نہیں۔

(۵) اِنْ لَمْ یَکُنْ فِیْ مَعَادِیْ آخِذًا بِیَدِیْ فَضْلًا وَاِلَّا فَقُلْ یَازَلَّةَ الْقَدَمِ

ترجمہ: اگر حضور نے اپنے فضل وکرم سے آخرت میں میری دستگیری نہ فرمائی تو مجھے کہنا چاہئے، ہائے لغزش قدم!۔

اس شعر میں ''زَلَّةُ الـقَـدَمِ'' (لغزشِ قدم) سے بطور کنایہ پریشاں حالی، بدحالی اور ہلاکت مراد ہے، یہاں اختصار کے ساتھ معنی ومفہوم کو کس حسین پیرائے اور لطیف کنایہ میں ادا کیا ہے کہ ادب وبلاغت کے رمز آشنا جھوم اٹھیں اور فصاحت وبیان کے شناور دادِ تحسین دیے بغیر نہ رہ سکیں۔

حسنِ تعلیل :

کسی کی ایسی علت بیان کرنا جو حقیقت میں اس کی علت تو نہیں لیکن نہایت لطیف توجیہ ہے، مثلاً:

ہلال کیسے نہ بنتا کہ ماہِ کامل کو
سلام ابروے شہ میں خمیدہ ہونا تھا (رضا بریلوی)

پہلے چاند کے خمیدہ نظر آنے کی علّت یہ ہوتی ہے کہ سورج کی شعاع قمر پر اس انداز سے پڑتی ہے کہ اس کا ایک خاص رقبہ ہی روشن ہوتا ہے جو زمین سے بشکل خمیدہ ہلال نظر آتا ہے، مگر شعر میں اس سے ہٹ کر اس کی ایک ایسی لطیف وجہ بیان کی گئی ہے جس سے حضور اکرم ﷺ کے عشاق کی دنیا عالم وجد میں آجاتی ہے، اس شعر میں دقت آفرینی کے ساتھ بلندیِ خیال لائق صد تحسین ہے۔

حسن تعلیل کی دوسری مثال قصیدۂ نور کا یہ شعر ہے:

سبزہ گردوں جھکا تھا بہر پابوس براق
پھر نہ سیدھا ہوسکا کھایا وہ کوڑا نور کا (رضا بریلوی)

ہر دیکھنے والے کو آسمان گنبد نما معلوم ہوتا ہے، آپ دنیا کے کونے کونے کی سیر کرلیں اور اس کا چپہ چپہ چھان ڈالیں مگر ہر جگہ آسمان اسی حال میں نظر آئے گا، امام احمد رضا قادری بریلوی حسن تعلیل کے طور پر اس خمیدگی کی علت یہ بیان فرماتے ہیں کہ شب معراج جب سرورِ کونین ﷺ براق پر سوار ہوکر سبزۂ گردوں سے گزرے تو سبزۂ گردوں

(آسمان) نہایت ادب سے براقِ برق رفتار کی قدم بوسی کے لیے جھکا، اس روز سے آج تک جھکا ہی ہوا ہے اور قیامت تک جھکا ہی رہے گا، اس اسپِ فلک نے ایسا نورانی کوڑا کھایا کہ جھکا تو پھر سیدھا نہ ہوسکا، آسمان کی محسوس شکل کے لیے حقیقتاً یہ علت نہیں ہے بلکہ حسنِ تعلیل کے طور پر یہ ایک نادر تخیل ہے۔

قصیدۂ بردۃ المدیح کا مطالعہ کیجیے تو اس میں بھی آپ کو صنعتِ حسنِ تعلیل کے جلوے نظر آئیں گے، مثلاً:

(۱) حضور اقدس ﷺ کی ولادتِ طیبہ کے وقت بہت سے خوارق ظہور پذیر ہوئے، انہیں میں سے ایک یہ تھا کہ آتش کدۂ فارس جو ہزار برس سے جل رہا تھا ایک آن کے لیے بھی بجھا نہ تھا وہ اسی رات بجھ گیا اور اس کے شعلے سرد پڑ گئے اور دریائے فرات خشک ہوگیا، اس کا حقیقی سبب یہ تھا کہ قدرت نے ولادتِ طیبہ کے سبب حق کی سطوت، کفر وشرک کے زوال اور کفار کی نکبت وہزیمت کے اعلان کے لیے یہ خوارق ظاہر فرمائے، لیکن امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ حسنِ تعلیل کے طور پر اس کی علت یہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار کی ولادتِ طیبہ سے آتش کدۂ فارس کو غم لاحق ہوا کہ آتش پرستی کا خاتمہ کرنے والا آگیا، اب میری پوجا نہ ہوسکے گی، اس غم وافسوس میں اس کے شعلے ٹھنڈے ہوگئے اور دریائے فرات جس پر ایرانی مجوسیوں اور آتش پرستوں کی معیشت اور گزر بسر موقوف تھی وہ مارے رنج وغم کے اپنا راستہ بھول گیا اور بادیۂ ساوہ میں جا پڑا جو دِمشق اور عراق کے بیچ میں واقع ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس کی حقیقی علت نہیں بلکہ حسنِ تعلیل کے طور پر ایک انوکھا تخیل ہے، بلند خیالی، بلند پروازی، معنی آفرینی اور نکتہ سنجی کا اعلیٰ نمونہ ہے، فرماتے ہیں:

وَالنَّارُ خَامِدَةُ الْاَنْفَاسِ مِنْ اَسَفٍ عَلَیْهِ وَالنَّهْرُ سَاهِی الْعَیْنِ مِنْ سَدَمِ

ترجمہ: اس کے غم میں آتش کدہ کے شعلے سرد پڑ گئے اور رنج والم کے باعث دریائے فرات کا سرچشمہ بہنے کی بجائے ٹھہر گیا۔

(۲) اور آپ کی ولادتِ طیبہ کے وقت ایک حیرت انگیز واقعہ یہ بھی رونما ہوا کہ بحیرۂ ساوہ خشک ہوگیا، جو کہ کئی میل لمبا چوڑا تھا اور جس کے کنارے بہت گرجا گھر اور آتش پرستوں کے عبادت خانے اور آتش لدے تھے اور پورے علاقہ میں انسانوں کی زندگی اسی کے پانی پر منحصر تھی۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ حسن تعلیل کے طور پر اس کی علت یہ بیان فرماتے ہیں کہ گویا غم واندوہ کے باعث آگ میں پانی کی خاصیت (سردی) پیدا ہوگئی اور پانی میں آگ کی خاصیت (سوزش) پیدا ہوگئی، ہر ذی شعور جانتا ہے کہ اس کی حقیقی علت آگ اور پانی کا غم واندوہ اور رنج والم نہ تھا، بلکہ حسن تعلیل کے طور پر یہ ایک نادر تخیل، دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی اور علت بیانی ہے، فرماتے ہیں:

وَسَاءَ سَاوَةَ اَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُها   وَ رُدَّ وَارِدُها بالْغَيْظ حِيْنَ ظَمِیْ

كَاَنَّ بِالنَّارِ مَا بِالْمَاءِ مِنْ بلـــل   حُزنًا و بِالْماء ما بالنّار مِنْ ضرم

ترجمہ: اور اہل ساوہ کو یہ غم پہنچا کہ ان کی جھیل خشک ہوگئی، اور اس پر آنے والے پیاسے کو غم وغصہ کے ساتھ واپس جانا پڑا۔ گویا غم واندوہ کے باعث آگ میں پانی کی سی تری آگئی اور پانی میں آگ جیسی سوزش پیدا ہوگئی۔

صنعتِ طباق:

ایک ہی کلام میں دو متضاد چیزیں ذکر کی جائیں، خواہ دونوں اسم ہوں، یا فعل، حرف، ذیل میں طباق کی کچھ مثالیں ملاحظہ کریں۔

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
برائی دیکھی، بھلائی دیکھی، عذاب دیکھا، ثواب دیکھا   (داغ)

ماں باپ کی آسائش وراحت ہے پسر سے
تنگی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے   (میر انیس)

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب العلیٰ کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح (//)

ذرہ کی چمک مہر منور سے ملادوں
کانٹے کو نزاکت میں گلِ تر سے ملادوں (//)

ہزاروں ہیں موجیں مرے آب وگل میں
سمندر ملا مجھ کو قطرہ کے دل میں (فاخرسہرامی)

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے (غالبؔ)

سر فلک نہ کبھی تا بہ آسماں پہنچا
کہ ابتدائے بلندی تھی انتہائے فلک (رضؔابریلوی)

ہوں مسلماں گرچہ ناقص ہی سہی اے کاملو!
ماہیت پانی کی آخر یم سے نم میں کم نہیں (رضؔابریلوی)

قصیدۂ بردہ میں بھی صنعتِ طباق کا بکثرت استعمال ملتاہے اوروہ بھی پوری شاعرانہ مہارت اورادیبانہ کمال کے ساتھ جس سے کلام کی قدروقیمت میں بے پناہ اضافہ ہوجاتاہے اور پڑھنے والا اشعار کومزے لے لے کر پڑھتاہے اورامام بوصیری کے فنی کمال کوسلامِ عقیدت اورخراجِ تحسین پیش کرتاہے، کچھ نمونے آپ بھی ملاحظہ کرلیں:

(۱) وَاخشَ الدَّسَائِسَ مِنْ جُوْعٍ وَّ مِنْ شِبَعٍ فَـرُبَّ مَخْمَـصَـةٍ شَرٌّ مِّنَ التُّخَمِ

ترجمہ: بھوک اورسیری دونوں صورتوں میں نفس کی پُرفریب چالوں سے ڈرتارہ، کیوں کہ کبھی فاقہ کی کیفیت بدہضمی سے زیادہ بُری ثابت ہوتی ہے۔

اس مثال میں ’’جُوع‘‘ (بھوک) اور ’’شِبَع‘‘ (شکم سیری) کے درمیان یوں ہی ’’مخمصۃ‘‘ (فاقہ) اور ’’تُخَم‘‘ (بدہضمی کی حدتک شکم سیری) کے درمیان صنعتِ طباق ہے۔

(۲) وَاسْتَفْرِغِ الدَّمْعَ مِنْ عَيْنٍ قَدِ امْتَلَأَتْ مِنَ الْمَحَارِمِ وَالْزَمْ حِمْيَةَ النَّدَمِ

ترجمہ: حرام سے لبریز آنکھ کا علاج آنسوؤں کے استفراغ اور اشک باری سے کر، پھر ہمیشہ ندامت وشرمساری کا پرہیز اختیار کر۔

اس شعر میں ''استفراغ'' (خالی کرنا) اور ''امتلاء'' (بھرنا) کے درمیان طباق ہے اور یہاں طب کی اصطلاح ''استفراغ'' (جو کہ ایک طریقۂ علاج ہے) اور ''حمیہ'' (پرہیز) استعمال فرما کر امام بوصیری نے شعر وادب اور فصاحت وبلاغت کی دنیا میں اپنی نمایاں حیثیت کا ایک روشن ثبوت فراہم کردیا ہے، اور کلام کی چاشنی میں وہ اضافہ فرمادیا ہے کہ پڑھتے جایئے اور عش عش کرتے جایئے، اور ہر بار ایک نیا لطف محسوس کیجیے۔

(۳) وَلَا تُطِعْ مِنْهُمَا خَصْماً وَلَا حَكَماً فَأَنْتَ تَعْرِفُ كَيْدَ الْخَصْمِ وَالْحَكَمِ

ترجمہ: نفس اور شیطان میں سے ایک تیرا فریق ہو اور دوسرا فیصل، تو بھی کسی کی بات نہ مان، کیوں کہ تو خوب جانتا ہے کہ ایسے فریق اور ایسے فیصل کی چال کیا ہوگی۔

(۴) كَأَنَّ بِالنَّارِ مَا بِالْمَاءِ مِنْ بَلَلٍ حُزْناً وَ بِالْمَاءِ مَا بِالنَّارِ مِنْ ضَرَمِ

ترجمہ: گویا غم واندوہ کے باعث آگ میں پانی کی سی تری آگئی اور پانی میں آگ جیسی سوزش پیدا ہوگئی۔

اس شعر میں ''بلل'' (تری) اور ''ضرم'' (سوزش) کے درمیان طباق ہے۔

(۵) اٰيَاتُ حَقٍّ مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثَةٌ قَدِيْمَةٌ صِفَةُ الْمَوْصُوْفِ بِالْقِدَمِ

ترجمہ: یہ رحمٰن کی سچی آیات ہیں جو واجب تعالیٰ کی ذات قدیم کی صفت ہیں، اور ظہور میں جدید اور تازہ ہیں۔

اس شعر میں ''محدثۃ'' (حادث) اور ''قدیمۃ'' کے درمیان صنعت طباق ہے۔

(۶) وَمَنْ يَبِعْ اٰجِلاً مِنْهُ بِعَاجِلِهِ يَبِنْ لَهُ الْغَبْنُ فِيْ بَيْعٍ وَفِيْ سَلَمِ

ترجمہ: (اور جو اپنی عاجل دنیا کے بدلے آجل عقبیٰ کو بیچ دے تو اس بیع سلم میں اس کا

نقصان عیاں ہے۔)

اس مثال میں "آجل" (دیر سے حاصل ہونے والی چیز یعنی آخرت اور "عاجل" (جلد حاصل ہونے والی چیز یعنی دنیا) کے درمیان صنعت طباق ہے، اور اس سے کلام کی ادبی و بلاغی قدر و قیمت کس حد تک پہنچ چکی ہے اس کا صحیح اندازہ ادب و بلاغت کے رمز آشناؤں کو ہی ہوسکتا ہے اور وہی بھرپور انداز میں اس کی فنی حلاوت اور چاشنی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں کیوں کہ: ع قدرِ زر، زرگر داند، وقدرِ جوہر، جوہری

صنعت مقابلہ:

مقابلہ یہ ہے کہ پہلے کچھ باہم موافق چیزیں مذکور ہوں پھر اسی ترتیب سے ان کے مقابل کی چیزیں ذکر کی جائیں، جیسے

○ امام احمد رضا قادری بریلوی "قصیدۂ نوریہ" میں لکھتے ہیں:

آئی بدعت، چھائی ظلمت، رنگ بدلا نور کا

مہرِ سنت، ماہِ طلعت، لے لے بدلا نور کا

○ مفتی اعظم ہند مولانا مصطفےٰ رضا نوری بریلوی لکھتے ہیں:

قربِ و بقا و وصل میں وہ　　　بعد و فراق و فصل میں وہ

پہلے شعر میں بدعت اور ظلمت کا استعمال ہوا ہے، پھر علی الترتیب ان کے متقابل "سنت" اور "طلعت" کو ذکر کیا گیا اور دوسرے شعر میں پہلے تو "قرب" و "بقا" اور "وصل" کو نظم کیا، پھر ان کے متقابل "بعد" و "فراق" اور "فصل" کو اسی ترتیب سے نظم کیا گیا۔

○ صنعت مقابلہ کی درج ذیل مثال دیدنی ہے:

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں

سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب　　(رضا بریلوی)

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں ایک ایک لفظ ایک دوسرے کے مقابلے میں ایسا

ہے جہاں فن اپنے پورے کمال کے ساتھ جلوہ افروز ہے، غور کریں (۱) وہاں ''حسن'' یہاں ''نام'' (۲) وہاں ''کٹنا'' جو عدم قصد پر دلالت کرتا ہے، یہاں ''کٹانا'' جو قصد وارادہ بتاتا ہے، (۳) وہاں ''مصر'' کہ اس کی ثقافت، معاشرت، علم، تہذیب، شائستگی، شرافت، متانت ضرب المثل، اور یہاں ''عرب'' کہ زمانۂ جاہلیت میں اس کی جہالت وسرکشی، خباثت وکج روی، تمرّد وخودسری کا چاردانگ عالم میں شہرہ تھا۔ (۴) وہاں ''انگلی'' ہے اور یہاں ''سر''، (۵) وہاں سبک خرام، نازک اندام، پیکر ناز وادا ''عورتیں'' اور یہاں جنگجو قبائل کے سخت دل، سخت جان، بہادر مرد، کہاں ''زنان مصر'' اور کہاں ''مردان عرب''، (۶) وہاں انگلیاں ''کٹیں'' جو اس کام کے ایک بار ہونے کو بتاتا ہے اور یہاں ''کٹاتے ہیں'' جو دوام واستمرار کو بتاتا ہے، (۷) وہاں یوسف، یہاں حبیب جن سے ''ترے'' کے ذریعہ عرض کلام ہے۔ اردو ادب کے ذخیرہ میں صنعت مقابلہ کی اس سے عمدہ مثال شاید ہی ہو۔

قصیدۂ بردہ میں بھی صنعت مقابلہ کی جلوہ سامانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں:

(۱) وَلَنْ تَرىٰ مِنْ وَّلِيٍّ غَيْرَ مُنْتَصِرٍ ۔۔۔ بِهٖ وَ لاَ مِنْ عَـدُوٍّ غَيْرَ مُنْقَصِـمِ

ترجمہ: تو سرکار کے کسی دوست کو ایسا نہیں پائے گا کہ آپ کی مدد سے وہ فاتح ومنصور نہ ہو اور آپ کا کوئی دشمن ایسا نہ ملے گا جو شکست خوردہ اور مغلوب نہ ہو۔

اس شعر کے پہلے مصرع میں ''ولی'' (دوست) اور ''منتصر'' (فاتح ومنصور) کو لایا گیا، پھر دوسرے مصرع میں اسی ترتیب سے ان کے مقابل ''عدو'' (دشمن) اور ''منقصم'' (شکست خوردہ اور مغلوب) کو ذکر کیا گیا، جس میں بیان مشاہدہ اور تطہیر فکر وعقیدہ کے ساتھ فن کے ماہرانہ کمال کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

تدبیج :

یہ ہے کہ کلام میں رنگوں کے معانی پر دلالت کرنے والے الفاظ کا تقابل لایا جائے، جیسے عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

تَرَدّٰی ثِیَابَ الْمَوْتِ حُمْرًا فَمَا اَتٰی لَهَا اللَّیْلُ اِلَّا وَهْیَ مِنْ سُنْدُسٍ خُضْر

ترجمہ: اس نے موت کے سرخ کپڑے پہنے (یعنی شہید ہوگیا) تو رات آتے ہی یہ سبز ریشم کے ہوگئے۔ (یعنی وہ جنت میں داخل ہوگیا اور جنتیوں کالباس زیب تن کرلیا جو سبز ریشم کا ہوتا ہے)

اس شعر میں ''حُمر'' (سرخ) اور ''خُضر'' (سبز) کے درمیان تقابل ہے جو کہ رنگوں پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ صنعت طباق ہی کی ایک خاص صورت ہے اور اس سے کلام میں حسن معنوی پیدا ہوجاتا ہے، قصیدۃ البردہ میں امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے کس کمال مہارت کے ساتھ اس صنعت کو جگہ دی ہے ملاحظہ فرمائیں، صحابہ کرام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اَلْمُصْدِرِي الْبِیْضِ حُمْرًا بَعْدَ مَاوَرَدَتْ مِنَ الْعِدٰی کُلَّ مُسْوَدٍّ مِّنَ اللِّمَمِ

ترجمہ: وہ اپنی سفید تلواریں دشمنوں کے سیاہ بالوں پر آزما کر سرخ بنا کر واپس لاتے۔

اس شعر میں ''بِیض'' (سفید) ''حُمر'' (سرخ) اور ''مُسودّ'' (سیاہ) کے درمیان تقابل سے صنعت تدبیج کا ظہور ہوا اور اس سے صحابہ کرام کی شجاعت و بہادری کے اظہار کے ساتھ فنی کمال اور بلاغی مہارت کا اظہار ہوگیا اور کلام حسن معنوی کا ایک مرقع بن گیا۔

صنعتِ لف ونشر:

یہ ہے کہ چند چیزیں ذکر کر کے ان کے مناسب چیزیں ذکر کردی جائیں، لیکن معین نہ کیا جائے کہ یہ فلاں سے متعلق ہے اور وہ فلاں سے، بلکہ مخاطب پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود معین کرلے گا۔

لف ونشر کی دو قسمیں ہیں، ۱-مرتّب ،۲-غیر مرتّب۔

لف ونشر مرتب:

یہ ہے کہ جس ترتیب سے چیزیں ذکر کی گئی ہیں اسی ترتیب سے ان کے مناسب

اشیاذکر کی جائیں، مثلاً: ''وَمِنْ رَحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ'' (القصص:۷۳)

اس آیت کریمہ میں پہلے ''لیل'' اور ''نہار'' کا ذکر کیا گیا پھر ''لیل'' (رات) کی مناسبت سے اس کا متعلق ''سکون'' اور ''نہار'' (دن) کی مناسبت سے اس کا متعلق ''ابتغاء فضل اللہ'' (رزق الٰہی کی تلاش) ذکر کیا گیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

دل بستہ ، بے قرار ، جگر چاک ، اشک بار
غنچہ ہوں، گل ہوں، برق تپاں ہوں، سحاب ہوں

اس شعر کے پہلے مصرع میں ''دل بستہ''، بے قرار، جگر چاک اور اشک بار چار چیزوں کو ذکر کیا گیا، پھر دوسرے مصرع میں دل بستہ کی مناسبت سے غنچہ، بے قرار کی مناسبت سے برق تپاں، جگر چاک کی مناسبت سے گل اور اشک بار کی مناسبت سے سحاب استعمال کیا گیا۔

٥ سرکار دو جہاں ﷺ کے دندان مبارک ایسے آب دار تھے کہ عدن کے موتیوں میں وہ آب و تاب نہیں، آپ کے لبِ لعلیں ایسے سرخ اور حسین و جمیل تھے کہ لعل یمن ان کے مقابلہ میں ہیچ تھے، آپ کی زلفِ پاک ایسی مُعَنبر اور خوشبودار تھی کہ ختن کی مشک اس کے بالمقابل بے وقعت تھی اور آپ کا رخ انور ایسا تروتازہ اور خوب صورت تھا کہ اس کے مقابلہ میں پھول کی کوئی حیثیت نہ تھی، اس مضمون کو امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ نے لف و نشر مرتب کے طور پر یوں باندھا ہے:

دندان ولب وزلف ورخ شہ کے فدائی
ہیں دُرِّ عدن، لعلِ یمن، مشکِ خُتن، پھول

اس شعر میں دندان کی مناسبت سے دُرِّ عدن، لب کی مناسبت سے لعل یمن، زلف کی مناسبت سے مشک ختن، اور رخ کی مناسبت سے پھول کا استعمال کیا ہے جو اپنی

نشر مرتب کی بے نظیر مثال ہے۔

کچھ اور مثالیں درج ذیل ہیں:

خوار و بیمار و خطاوار و گنہ گار ہوں میں
رافع و نافع و شافع لقب آقا تیرا (رضا بریلوی)

ہم ہیں جتنے خاطی مخطی آپ ہیں اس سے زائد معطی
عفو و صفح و عنایت والے تم پہ لاکھوں سلام (نوری بریلوی)

زلفِ حضور، عارضِ پُر نور پر نثار
کیا نور بار شام ہے، کیا جلوہ بار صبح (حسن بریلوی)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے قصیدۂ بردہ میں اس صنعت پر بھی طبع آزمائی فرمائی ہے۔

(۱) حضور اقدس ﷺ اور ان کے نائبین کی مدح کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

مَكْفُوْلَةً اَبَدًا مِنْهُمْ بِخَيْرِ اَبٍ وَ بِخَيْرِ بَعْلٍ فَلَمْ تَيْتَمْ وَلَمْ تَئِمِ

ترجمہ: یہ ملت حقہ اب یتیم و بیوہ کی طرح نہ رہی بلکہ سرکار اور ان کے نائبین کی بدولت گویا ایک بہترین باپ اور بہترین خاوند کی کفالت میں آچکی ہے۔

اس شعر میں پہلے دو چیزیں "اب" اور "بعل" کا ذکر کیا پھر "اب" (باپ) کی مناسبت سے "لم تیتم" (یتیم نہیں ہوئی) اور "بعل" (شوہر) کی مناسبت سے "لم تئم" (بیوہ نہیں ہوئی) کو ذکر کیا، لہٰذا یہ صنعت لف و نشر مرتب کی بہترین مثال ہوگئی۔

لف و نشر غیر مرتب:

یہ ہے کہ جس ترتیب سے چیزیں ذکر کی گئی ہیں اس ترتیب سے ان کی مناسب اشیا مذکور نہ ہوں مثلاً:

وَ لَحْظُهُ وَ مُحَيَّاهُ وَ قَامَتُهُ بَدْرُ الدُّجٰى وَ قَضِيْبُ الْبَانِ وَ الرَّاحُ

ترجمہ: اس کا گوشۂ چشم سے دیکھنا اور اس کا ۔۔۔ اس کی قامت زیبا تاریک راتوں کا مہ

کامل اور بان کی شاخ اور شراب ہے۔
اس شعر کے پہلے مصرع میں تین چیزیں ذکر کی گئی ہیں، (۱) "لحظہ" (اس کا دیکھنا) (۲) "محیاہ" (اس کا چہرہ)، (۳) "قامتہ" (اس کا قد و قامت)، پھر دوسرے مصرع میں ان کے مناسبات اور متعلقات کو بے ترتیب بیان کیا گیا، "لحظہ" کا مناسب "الراح" (شراب) ہے، "محیاہ" کا مناسب "بدر الدجیٰ" ہے اور "قامتہ" کا مناسب "قضیب البان" (درختِ بان کی شاخ) ہے، اب شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ اس کا کنکھیوں سے دیکھنا مثل شراب کے نشیلا ہے اور اس کا حسین و جمیل چہرہ مہِ کامل کی مانند ہے اور اس کی قامتِ زیبا درختِ بان کی طرح متناسب اور خوب صورت ہے۔

دیکھو قرآں میں شبِ قدر سے تا مطلعِ فجر
یعنی نزدیک ہیں عارض کے وہ پیارے گیسو (رضا)

اس شعر کے پہلے مصرع میں دو چیزیں مذکور ہوئیں، (۱) شب، (۲) فجر (صبح)، پھر دوسرے مصرع میں ان کے مناسبات کو ذکر کرنے میں ترتیب بدل دی گئی، شب کا مناسب "گیسو" موخر اور فجر کا مناسب "عارض" (رخسار) مقدم کر دیا گیا۔

قصیدۂ بردہ میں صنعتِ لف و نشر غیر مرتب کی کارفرمائی مختلف صورتوں میں مختلف اشعار کے اندر موجود ہے۔

(۱) وَ اَثْبَتَ الْوَجْدُ خَطَّیْ عَبْرَۃٍ وَ ضَنیً مِثْلَ الْبَھَارِ عَلٰی خَدَّیْکَ وَ الْعَنَمِ

ترجمہ: اور محبت و شیفتگی نے تیرے رخساروں پر عنم کی طرح آنسو کی سرخ اور بہار پھول کی طرح لاغری کی زرد دو لکیریں بنا دی ہیں۔

اس شعر میں پہلے "عبرۃ" اور "ضنیٰ" دو چیزیں ذکر کی گئیں، پھر "عبرۃ" کے مناسب "عنم" اور "ضنیٰ" کے مناسب "بہار" کو ذکر کیا گیا، مگر ترتیب بدل دی گئی، مقدم کے مناسب کو موخر اور موخر کے مناسب کو مقدم کر دیا گیا۔

(۲) رسول اکرم ﷺ کے حسن صورت وسیرت کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں

فاق النبیین فی خلقٍ و فی خُلقٍ و لم یدانوہ فی علمٍ و لا کرم

ترجمہ: آپ حسن صورت وحسن سیرت دونوں میں سارے انبیائے کرام پر فائق ہیں اور وہ علم ودانش اور عطاو بخشش میں آپ کے قریب بھی نہیں پہنچے ہیں۔

پھر دو اشعار کے بعد صنعت لف ونشر غیر مرتب کے واسطے سے سرکار کے جمال صوری ومعنوی کا مضمون یوں باندھتے ہیں:

فَھوَ الّذِیْ تَمّ مَعْنَاہُ وَ صُوْرَتُہٗ ثُمّ اصطفاہُ حبِیباً بارِئُ النّسم

ترجمہ: تو آپ وہ ہیں جن کی سیرت وصورت کامل ہوگئی، پھر خالق کائنات نے آپ کو اپنا حبیب بنایا۔

اس مثال میں پہلے شعر کے اندر ''خلق'' (صورت ظاہری) اور ''خُلق'' (سیرت معنوی) کو ذکر کیا، پھر ان کے متعلقات اور مناسبات ''معنی'' (باطن) اور ''صورۃ'' (ظاہر) کو دوسرے شعر میں ذکر کیا مگر سابقہ ترتیب برقرار نہ رکھی۔

(۳) عَمُوْا وَ صَمُّوْا فَاِعْلَانُ الْبَشَائِرِ لَمْ تُسْمَعْ وبارِقۃُ الْاِنْذارِ لَمْ تُشَمِ

ترجمہ: منکرینِ حق اندھے اور بہرے ہوگئے تو خوش خبریوں کے اعلان انہیں سنائی نہ دیے اور ڈرانے والی بجلیاں انہیں نظر نہ آئیں۔

اس مثال میں پہلے ''عموا'' (اندھے ہوگئے) اور ''صموا'' (بہرے ہوگئے) کو شاعر نے ذکر کیا پھر پہلے کی مناسبت سے ''لم تشم'' (دکھائی نہ دیں) اور دوسرے کی مناسبت سے ''لم تسمع'' (سنائی نہ دیں) کو ذکر کیا، مگر متعلقات کے ذکر میں ترتیب بدل دی۔

(۴) وَ الْجِنُّ تَھْتِفُ وَالْاَنْوَارُ سَاطِعَۃٌ وَ الْحَقُّ یَظْھَرُ مِنْ مَّعْنًی وَمِنْ کَلِمِ

ترجمہ: اور اس دن جن چیخ رہے تھے اور انوار چمک رہے تھے اور حق معنی اور لفظ دونوں سے آشکارا ہو رہا تھا۔

اس شعر کے پہلے مصرع میں دو چیزیں ذکر کی گئی ہیں، (۱) جنوں کا چیخنا (۲) انوار کا چمکنا، پھر دوسرے مصرع میں ان کے متعلقات ''معنی'' اور ''لفظ'' کو ذکر کیا گیا مگر اس میں ترتیب بدل دی۔

(۵) ظَنُّوْا الْحَمَامَ وَ ظَنُّوا الْعَنْكَبُوْتَ عَلٰی خَيْرِ الْبَرِيَّةِ لَمْ تَنْسُجْ وَ لَمْ تَحُمِ

ترجمہ: ان کا خیال تھا کہ اگر غار میں اشرف الخلق صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو کبوتروں کی گردش اور مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔

اس شعر میں پہلے ''الحمام'' (کبوتر) اور ''العنکبوت'' (مکڑی) کا ذکر ہے، پھر ان کے متعلقات کا ذکر ان کی ترتیب کے برخلاف ہوا ہے، چنانچہ ''الحمام'' کے متعلق ''لم تحم'' کو موخر اور ''العنکبوت'' کے متعلق ''لم تنسج'' کو مقدم ذکر کیا گیا ہے، اس صنعت میں ایک طرح سے مخاطب کی بیدار مغزی، دانش مندی اور سخن فہمی کا امتحان بھی ہو جاتا ہے اور چوں کہ اسے کچھ غور وفکر سے بھی کام لینا پڑتا ہے اس لیے بات اس کے ذہن و دماغ میں اچھی طرح جا گزیں ہو جاتی ہے اور دیر پا رہتی ہے اور یہی اس کی بلاغت کا راز ہے۔

صنعت تنسیق الصفات:

کسی کا تذکرہ متعدد صفتوں کے ساتھ کیا جائے خواہ وہ صفات مدح ہوں یا صفات ذم، مثلاً:

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ. (الحشر: ۲۳)

اصالت کل، امامت کل، سیادت کل، امارت کل
حکومت کل، ولایت کل، خدا کے یہاں تمہارے لیے (رضا بریلوی)

فارق حق و باطل، امام الہدیٰ تیغ مسلول شدت پہ لاکھوں سلام
اصدق الصادقیں، سید المتقیں چشم و گوش وزارت پہ لاکھوں سلام (رر)

قصیدۂ بردہ میں بھی اس صنعت معنوی کا استعمال قابل دید ہے:

(۱) آیات قرآنی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے امام بوصیری یوں گویا ہیں:

اٰيَاتُ حَقٍّ مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثَةٌ قَدِيْمَةٌ صِفَةُ الْمَوْصُوْفِ بِالْقِدَمِ

ترجمہ: یہ رحمٰن کی سچی قدیم آیات ہیں جو واجب تعالیٰ کی قدیم ذات کی صفت ہیں اور ظہور میں جدید اور تازہ ہیں۔

(۲) نَبِيُّنَا الْاٰمِرُ النَّاهِيْ فَلَا اَحَدٌ اَبَرَّ فِيْ قَوْلِ لَا مِنْهُ وَ لَا نَعَمِ

ترجمہ: ہمارے نبی بھلائی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے ہیں، تو ہاں یا نہیں کہنے میں ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔

صنعت جمع وتفریق:

چند چیزیں ایک حکم کے ماتحت رکھی جائیں پھر اس حکم میں ان چیزوں کا فرق دکھایا جائے، مثلاً خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ٥ (الاعراف:۱۲) اس میں ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام اور اپنی ذات کو حکم تخلیق کے ماتحت رکھا پھر یوں تفریق کی کہ میری تخلیق کا منبع آگ ہے اور آدم کی تخلیق کا سرچشمہ مٹی ہے۔

قصیدۂ بردہ میں بھی اس صنعت کا استعمال موجود ہے:

٥ آیات قرآنی کی مدح وستائش میں امام بوصیری کا اشہبِ قلم یوں رواں دواں ہوتا ہے:

لَهَا مَعَانٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ فِيْ مَدَدٍ وَفَوْقَ جَوْهَرِهٖ فِي الْحُسْنِ وَ الْقِيَمِ

ترجمہ: ان کے معانی زیادتی اور کثرت میں سمندر کی لہروں کی طرح ہیں اور قدر و قیمت اور حسن و جمال میں دریا کے موتیوں سے بڑھ کر ہیں۔

اس شعر میں پہلے تو معانیِ آیات اور سمندر کو زیادتی اور کثرت کے حکم کے تحت داخل کیا پھر دونوں کے درمیان یوں تفریق کی کہ معانیِ آیاتِ قرآنیہ کی قدر و قیمت اور حسن و جمال سمندر کے موتیوں کے حسن و جمال اور قدر و قیمت سے بڑھ کر ہے، یہ

صنعتِ جمع مع تفریق کی عمدہ مثال ہوئی، اس سے کلام کی قدر و قیمت اور اثر انگیزی میں کیا اضافہ ہوا اس کو کچھ اہلِ ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

مراعاۃ النظیر:

یہ ہے کہ چند متناسب چیزیں ذکر کی جائیں جن میں باہم تضاد نہ ہو، مثلاً:

"اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ" (الرحمٰن: ۵)

○ اِذَا صَدَقَ الْجَدُّ افْتَرَى الْعَمُّ لِلْفَتَى ۔۔۔ مَكَارِمَ لَا تُحْصَى وَاِنْ كَذَبَ الْخَالُ

اس شعر میں "جد"، "عم" اور "خال" کو یک جا ذکر کیا گیا جو باہم متناسب ہیں، متضاد نہیں، کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

بزمِ ثنائے زلف میں میری عروسِ فکر کو
ساری بہارِ ہشت خلد چھوٹا سا عطر دان ہے (رضا بریلوی)

وہی جلوہ شہر بہ شہر ہے، وہی اصلِ عالم و دہر ہے
وہی بحر ہے، وہی لہر ہے، وہی پاٹ ہے، وہی دھار ہے (رضا بریلوی)

نظر اک چمن سے دو چار ہے نہ چمن، چمن بھی نثار ہے
عجب اس کے گل کی بہار ہے کہ بہار بلبلِ زار ہے (رضا بریلوی)

یہ سمن یہ سوسن و یاسمن، یہ بنفشہ سنبل و نسترن
گل و سرو لالہ بھرا چمن، وہی ایک جلوہ ہزار ہے (رضا بریلوی)

محیط و مرکز میں فرق مشکل، رہے نہ فاصل خطوط واصل
کمانیں حیرت میں سر جھکائے، عجیب چکر میں دائرے تھے (رضا بریلوی)

سراغِ این و متی کہاں تھا، نشانِ کیف و الیٰ کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی، نہ سنگِ منزل نہ مرحلے تھے (رضا بریلوی)

قصیدۂ بردۃ المدیح میں اس صنعت کا حسن و جمال جا بجا دیکھنے میں آتا ہے جو

قاری کے قلب وذہن کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کی رغبت اور چاؤ میں اضافہ کرتا ہے، اس کی کچھ جلوہ سامانیاں آپ کے سامنے بھی آرہی ہیں، جن سے خود آپ اس معنوی کیفیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

(۱) وَ النَّفسُ کَالطِّفلِ اِنْ تُھمِلْہُ شَبَّ عَلیٰ		حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تَفطِمْہُ یَنفَطِمِ

ترجمہ: نفس تو بچے کی طرح ہے جس کا دودھ چھڑا دیں تو چھوڑ دے گا، ورنہ جوان ہو کر بھی دودھ پینے کا رسیا رہے گا۔

اس شعر میں ''الطفل'' (بچہ) ''الرضاع'' (دودھ پینا) ''تفطمه'' (دودھ چھڑانا) اور ''ینفطم'' (دودھ چھوڑ دینا) کو یک جا ذکر کیا گیا جو باہم متناسب ہیں، متضاد نہیں۔

(۲) وَلَا تَزَوَّدْتُ قَبْلَ الْمَوْتِ نَافِلَةً		وَ لَمْ اُصَلِّ سِوٰی فَرْضٍ وَلَمْ اَصُمِ

ترجمہ: اور نہ سفر موت سے پہلے میں نے نوافل کا توشہ لیا اور بجز فرض کے نماز روزے بھی ادا نہ کیے۔

اس شعر میں ''نافلة'' اور ''فرض'' کے ذکر میں مراعاۃ النظیر ہے، یوں ہی ''صلوٰۃ'' اور ''صوم'' کا ذکر بھی اسی صنعت کے زمرہ میں داخل ہے۔

(۳) وَکَیفَ یُدرِکُ فِی الدُّنیَا حَقِیقَتَہٗ		قَومٌ نِیَامٌ تَسَلَّوْا عَنہُ بِالْحُلُمِ

ترجمہ: (وہ خوابیدہ افراد آپ کی حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں، جنہوں نے خواب ہی میں آپ کو دیکھ کر تسلی حاصل کر لی ہے)۔

اس مثال میں ''نیام'' (سونے والے) اور ''الحلم'' (خواب) کا یک جا ذکر مراعاۃ النظیر ہے کیوں کہ یہ دونوں باہم متناسب ہیں۔

(۴) فَاِنَّہٗ شَمسُ فَضلٍ ھُم کَوَاکِبُھَا		یُظْھِرْنَ اَنوَارَھَا لِلنَّاسِ فِی الظُّلَمِ

ترجمہ: (کیوں کہ حضور اقدس ﷺ وہ آفتابِ فضل وکمال ہیں کہ انبیاے کرام جس کے تارے ہیں جو اسی آفتاب کی روشنی تاریکیوں میں انسانوں کو دکھاتے رہے ہیں)۔

اس شعر میں "شمس" (سورج) "کواکب" (ستارے) "انوار" (روشنی) کا اجتماع صنعت مراعاۃ النظیر کا دل کش نمونہ ہے، جس سے قاری کا قلب وجگر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ذیل میں اس صنعت کی کچھ اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں اختصار کے پیش نظر صرف متناسب امور پر خط کھینچ دیے گئے ہیں، تفصیلی اجرا نہیں کیا گیا ہے۔

(۵) لَاطِيبَ يَعْدِلُ تُرْبًا ضَمَّ اَعْظُمَهُ طُوبىٰ لِمُنْتَشِقٍ مِنْهُ وَمُلْتَثِمِ

ترجمہ: (کوئی خوشبو اس مہکتی خاک کی ہم سر نہیں جو سرکار کے جسم اطہر کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، مودہ ہے اس کے لیے جسے اس کا سونگھنا یا چومنا نصیب ہو۔)

(۶) كَاَنَّهَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِمَا كَتَبَتْ فُرُوعُهَا مِنْ بَدِيعِ الْخَطِّ فِي اللَّقَمِ

ترجمہ: (گویا ان درختوں نے بیچ راستے میں اس انوکھی تحریر کی ایک سطر کھینچ دی جس کو ان کی شاخوں نے لکھ دیا تھا۔)

(۷) لَا تُنْكِرِ الْوَحْيَ مِنْ رُؤْيَاهُ اِنَّ لَهُ قَلْبًا اِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ لَمْ يَنَمِ

ترجمہ: (سرکار کے خوابوں کے وحی ہونے سے انکار نہ کر، کیوں کہ ان کا قلب مبارک اس وقت بھی بیدار رہتا ہے جب کہ آنکھیں سو رہی ہوں۔)

(۸) وَ ذَاكَ حِينَ بُلُوغٍ مِنْ نُبُوَّتِهِ فَلَيْسَ يُنْكَرُ فِيهِ حَالُ مُحْتَلِمِ

ترجمہ: -(اور یہ تو آپ کی نبوت کے بلوغ کا وقت تھا تو ایسی حالت میں خوابوں کی آمد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔)

(۹) خَفَضْتَ كُلَّ مَقَامٍ بِالْاِضَافَةِ اِذْ نُودِيتَ بِالرَّفْعِ مِثْلَ الْمُفْرَدِ الْعَلَمِ

ترجمہ: (تو آپ نے اپنے مقام بلند کے لحاظ سے ہر مقام کو پست کر دیا جب کہ آپ سر برآوردہ و یگانہ کی حیثیت سے بلندی پر بلائے گئے۔)

(۱۰) وَ الْكَاتِبِينَ بِسُمْرِ الْخَطِّ مَا تَرَكَتْ اَقْلَامُهُمْ حَرْفَ جِسْمٍ غَيْرَ مُنْعَجِمِ

ترجمہ: (وہ گندم گوں خطی نیزوں سے ایسی تحریر لکھتے کہ ان کے قلم دشمنوں کے جسم کے کسی

حرف (عضو) کو بغیر نقطہ (زخم) نہ چھوڑتے۔)

(۱۱) اَحَلَّ اُمَّتَهٗ فِیْ حِرْزِ مِلَّتِهٖ کَاللَّیْثِ حَلَّ مَعَ الْاَشْبَالِ فِیْ اَجَمٖ

ترجمہ: (سرکار نے اپنی امت کو دین کے مضبوط قلعہ میں اتار دیا، جیسے شیر اپنے بچوں کے ساتھ جھاڑی میں محفوظ ہو۔)

(۱۲) فَیَا خَسَارَةَ نَفْسٍ فِیْ تِجَارَتِهَا لَمْ تَشْتَرِ الدِّیْنَ بِالدُّنْیَا وَ لَمْ تَسُمٖ

ترجمہ: (تو ہائے افسوس! میرا نفس تجارت میں کس قدر نقصان سے دوچار ہوا کہ اس نے نہ دنیا کے بدلے دین خریدا اور نہ ہی اس کا مول بھاؤ کیا۔)

(۱۳) وَمَنْ یَّبِعْ اٰجِلاً مِنْهُ بِعَاجِلِهٖ یَبِنْ لَهُ الْغَبْنُ فِیْ بَیْعٍ وَّ فِیْ سَلَمٖ

ترجمہ: (اور جو اپنی عاجل (دنیا) کے بدلے آجل (عقبیٰ) کو بیچ دے تو اس بیع سلم میں اس کا نقصان عیاں ہے)۔

(۱۴) یَا نَفْسِ لَا تَقْنَطِیْ مِنْ زَلَّةٍ عَظُمَتْ اِنَّ الْکَبَائِرَ فِی الْغُفْرَانِ کَاللَّمَمٖ

ترجمہ: (اے نفس! کسی بڑے گناہ کی وجہ سے مایوس نہ ہو، کیوں کہ مغفرت کے معاملہ میں کبائر بھی صغائر ہی کی طرح ہو جاتے ہیں۔)

(۱۵) وَاْذَنْ لِسُحْبِ صَلٰوةٍ مِّنْکَ دَائِمَةٍ عَلَی النَّبِیِّ بِمُنْهَلٍّ وَّ مُنْسَجِمٖ

مَا رَنَّحَتْ عَذَبَاتِ الْبَانِ رِیْحُ صَبًا وَ اَطْرَبَ الْعِیْسَ حَادِی الْعِیْسِ بِالنَّغَمٖ

ترجمہ: (اور (اے خدا!) تو اپنی رحمت کے بادلوں کو حکم دے کہ سدا نبی کریم ﷺ پر موسلا دھار اور لگاتار رحمت کی بھرن برساتے رہیں۔

جب تک بادِ صبا سے درخت بان کی شاخیں جھومتی رہیں اور جب تک حدی خواں اپنے پرکیف نغموں سے اونٹوں کو مست اور تیز گام کرتے رہیں۔)

صنعتِ تلمیح :

یہ ہے کہ کلام میں کسی آیت قرآنی، حدیث نبوی، مشہور شعر، مشہور کہاوت یا کسی

واقعہ کی جانب اشارہ ہو، جیسے:

اشارے سے چاند چیر دیا، چھپے ہوئے خور کو پھیر لیا
گئے ہوئے دن کو عصر کیا، یہ تاب وتواں تمہارے لیے

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

غنچے مَا اَوْحٰی کے جو چٹکے دَنٰی کے باغ میں
بلبلِ سدرہ تک ان کی بو سے بھی محرم نہیں

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شان رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ دیکھے　　(اقبال)

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے　　(اقبال)

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟
اور پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟　　(اقبال)

جب آپ قصیدۂ بردہ کا مطالعہ کریں گے تو محسوس ہوگا کہ اس قصیدہ کے متعدد اشعار میں صنعتِ تلمیح اپنے تمام تر حسن و جمال اور جاہ وجلال کے ساتھ جلوہ بار ہے، جو قارئین وسامعین کو مدحِ رسالت پناہ کی لذتوں سے ہم کنار کرنے کے ساتھ ہی کبھی انہیں تاریخ کے دریچوں سے ماضی کے واقعات کی سیر کراتی ہے، کبھی احادیث نبویہ کے گلدستوں کی خوشبو سے ان کے مشام جاں کو معطر کرتی ہے اور کبھی آیات قرآنی کی ضیا پاشیوں سے ان کے قلوب کو بقعۂ نور بنا دیتی ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کی گوناگوں لذتوں سے وہ ایسے مسرور وشادکام ہوتے ہیں کہ قلب کی گہرائیوں سے امام بوصیری رحمۃ

اللہ علیہ کی فنی مہارت، شاعرانہ کمال اور علمی جاہ وجلال کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں، ذیل کے اشعار سے میرے دعویٰ کی کچھ تصدیق ہو سکتی ہے، فرماتے ہیں:

(۱) ظَلَمْتُ سُنَّۃَ مَنْ اَحْیی الظَّلَامَ اِلیٰ اَنِ اشْتَکَتْ قَدَمَاہُ الضُّرَّ مِنْ وَّرَم

(ترجمہ: میں نے ان کی سنت کا حق ادا نہ کیا جو اتنی عبادت وشب بیداری کرتے کہ قدموں میں ورم ہو جاتا۔)

جب سورہ مزمل نازل ہوئی اور اس میں حکم ہوا "یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا o نِصْفَہٗ اَوِانْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا o اَوْزِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا o (المزمل:۱-۴) تو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام راتوں کو جاگ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے، آپ کا قیام اتنا طویل ہوتا کہ آپ کے پائے مبارک میں ورم آ جاتا، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان کان النبی ﷺ لَیَقُوم او لَیُصَلّي حتی تَرِمَ قدماہ أو سَاقَاہُ ،فیقال لہ ، فیقول: افلا اکونُ عبدًا شکورًا. (صحیح بخاری، کتاب التھجد، باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل، ج۱،ص۱۵۲)

نبی اکرم ﷺ اتنی دیر قیام فرماتے تھے (یا) نماز پڑھتے تھے کہ حضور کے دونوں پائے مبارک (یا) دونوں پنڈلیاں ورم کر آتی تھیں، خدمت اقدس میں عرض کیا جاتا تو فرماتے، کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں۔

مذکورہ بالا شعر میں اسی حدیث کی جانب تلمیح ہے:

(۲) وَشَدَّ مِنْ سَغَبٍ اَحْشَاءَہٗ وَطَویٰ تَحْتَ الْحِجَارَۃِ کَشْحاً مُتْرَفَ الْاَدَمِ

ترجمہ: اور بھوک سے شکم مبارک باندھ لیتے اور پتھروں کے نیچے نازک ومبارک کمر کو تہ کر لیتے۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

جئتُ رسولَ اللہ ﷺ یوما فوجدتُہ جالسًا مع اصحابِہ یُحدِّثُھم وقد

عصبَ بطنَہ بعصابۃ فقالوا: من الجوع.

ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور اپنے صحابہ سے بیٹھے گفتگو فرما رہے ہیں اور شکم مبارک کو ایک پٹکے سے باندھ رکھا ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ بھوک کی وجہ سے ہے۔

اس شعر میں اسی واقعہ کی جانب اشارہ ہے:

(۳) وَرَاوَدَتْہُ الْجِبَالُ الشُّمُّ مِنْ ذَھَبٍ عَنْ نَّفْسِہٖ فَاَرَاھَا اَیَّمَا شَمَمِ

ترجمہ: (اور سونے کے بلند و بالا پہاڑوں نے آپ کو لبھانا چاہا تو ان کے سامنے کیسی بے نیازی اور بلندی کا مظاہرہ فرمایا۔)

اس شعر میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

ان اللّٰہ یُقرِئُک السلامَ ویقول لک أتُحِبُّ أن أجعلَ ھٰذہ الجبالَ ذھبا وتکون معک حیثُما کنتَ؟

(اللہ تعالیٰ آپ کو سلام فرماتا ہے اور کہتا ہے: کیا آپ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ میں ان پہاڑوں کو سونا بنادوں اور جدھر آپ تشریف لے جائیں یہ آپ کے ساتھ جائیں؟)

یہ سن کر کچھ دیر کے لیے حضور ﷺ نے سر مبارک جھکالیا اور غور وفکر کرنے لگے کہ اس خداوندی پیش کش کا کیا جواب دوں، تھوڑی دیر بعد سر مبارک اٹھایا اور فرمایا:

یاجبرئیل! ان الدنیا دارُ من لا دار لہٗ و مَالُ من لا مال لہٗ، قد یجمعھا من لاعقلَ لہٗ.

(اے جبرئیل! دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا اور کوئی گھر نہ ہو اور یہ اس کا مال ہے جس کے پاس کوئی اور مال نہ ہو، اس کو وہی جمع کرتا ہے جو عقل و دانش سے محروم ہو۔)

سرورِ عالم ﷺ کا یہ جواب سن کر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی:

ثبتک اللّٰہ یا محمد بالقول الثابت. (عصیدۃ الشھدۃ شرح قصیدۃ البردۃ، ص۲۸)

(اے اللہ کے محبوب! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ حق بات پر ثابت قدم رکھے)۔

(۴) دَعَا اِلَی اللّٰہِ فَالْمُسْتَمْسِکُوْنَ بِہٖ مُسْتَمْسِکُوْنَ بِحَبْلٍ غَیْرِ مُنْفَصِمِ

ترجمہ: (آپ نے خداے برتر کی جانب بلایا تو آپ کے دامن کو تھامنے والے ایسی رسی کو پکڑے ہوئے ہیں جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔)

اس شعر میں درج ذیل آیتِ کریمہ کی طرف تلمیح ہے:

"فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا"۔ (البقرہ:۲۵۶)

(۵) وَبَاتَ اِیْوَانُ کِسْرٰی وَھُوَ مُنْصَدِعٌ کَشَمْلِ اَصْحَابِ کِسْرٰی غَیْرَ مُلْتَئِمِ

ترجمہ: (اور نوشیرواں کا محل اس کے اعوان وانصار کے شیرازہ کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا جسے پھر جوڑا نہ جاسکا۔)

اس شعر سے لے کر شعر ۸۸ تک اکثر اشعار صنعت تلمیح پر مشتمل ہیں، جن میں سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادتِ طیبہ سے لے کر بعد تک ظہور میں آنے والے معجزات اور خوارق عادات کی طرف تلمیحات ہیں:

(۶) قَرَّتْ بِھَا عَیْنُ قَارِیْھَا فَقُلْتُ لَہٗ لَقَدْ ظَفِرْتَ بِحَبْلِ اللّٰہِ فَاعْتَصِمِ

ترجمہ: (تلاوت کرنے والے کی آنکھیں ان سے ٹھنڈی ہوئیں تو میں نے اس سے کہا کہ تو نے اللہ کی رسی پالی تو اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔)

اس شعر میں آیت کریمہ "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً" (آل عمران:۱۰۳) کی طرف تلمیح ہے:

اس کے علاوہ درج ذیل اشعار میں بھی صنعت تلمیح پائی جاتی ہے:

(۷) کَاَنَّھَا الْحَوْضُ تَبْیَضُّ الْوُجُوْہُ بِہٖ مِنَ الْعُصَاۃِ وَقَدْ جَاؤُوْہُ کَالْحُمَمِ

(۸) وبتَّ تَرْقٰی اِلٰی اَنْ نِلْتَ مَنْزِلَۃً مِنْ قَابَ قَوْسَیْنِ لَمْ تُدْرَکْ وَلَمْ تُرَمِ

(۹) حَتّٰی غَدَتْ مِلَّةُ الْإِسْلَامِ وَهِيَ بِهِمْ — مِنْ بَعْدِ غُرْبَتِهَا مَوْصُولَةَ الرَّحِمِ
(۱۰) وَمَنْ تَكُنْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ نُصْرَتُهُ — اِنْ تَلْقَهُ الْأُسْدُ فِيْ آجَامِهَا تَجِمِ
(۱۱) فَاِنَّ لِيْ ذِمَّةً مِنْهُ بِتَسْمِيَتِيْ — مُحَمَّداً وَهُوَ أَوْفَى الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ
(۱۲) يَا نَفْسِ لَا تَقْنَطِيْ مِنْ زَلَّةٍ عَظُمَتْ — اِنَّ الْكَبَائِرَ فِي الْغُفْرَانِ كَاللَّمَمِ

اب تک صنائعِ معنویہ کی مختلف اقسام کے سلسلہ میں گفتگو چل رہی تھی، اب صنائع لفظیہ کی بعض اقسام پر گفتگو کا آغاز ہوتا ہے، محسنات لفظیہ میں سے ایک ردالعجز علی الصدر ہے۔

رد العجز علی الصدر :

(الف) یہ نثر میں اس طرح ہوتا ہے کہ دو مکرر یا متجانس یا مشتق یا شبہ مشتق الفاظ اس طرح لائے جائیں کہ ایک لفظ فقرہ کے شروع میں ہو اور ایک فقرہ کے آخر میں، مثلاً:

(۱) وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ (الاحزاب: ۳۷)۔

(۲) سائلُ اللئیم یرجعُ و دمعهُ سائل۔

(ب) یہ نظم میں اس طرح ہوتا ہے کہ دو مکرر یا متجانس یا مشتق یا شبہ مشتق الفاظ اس طرح لائے جائیں کہ ایک تو شعر کے آخر میں ہو اور ایک مصرعِ اول کے شروع میں یا حشو میں یا آخر میں، یا دوسرے مصرع کے شروع میں، مثلاً:

تَمَتَّعْ مِنْ شَمِيْمِ عَرَارِ نَجْدٍ — فَمَا بَعْدَ الْعَشِيَّةِ مِنْ عَرَارِ
سَرِيْعٌ اِلَى ابْنِ الْعَمِّ يَلْطِمُ وَجْهَهُ — وَلَيْسَ اِلٰى دَاعِ النَّدٰى بِسَرِيْعِ
وَمَنْ كَانَ بِالْبِيْضِ الْكَوَاعِبِ مُغْرَمًا — فَمَا زِلْتُ بِالْبِيْضِ الْقَوَاضِبِ مُغْرَمَا
وَاِنْ لَمْ يَكُنْ اِلَّا مُعَرَّجُ سَاعَةٍ — قَلِيْلًا فَاِنِّيْ نَافِعٌ لِيْ قَلِيْلُهَا

نظم کے ردالعجز علی الصدر کی سولہ قسمیں ہیں، کیوں کہ اس میں دونوں الفاظ کی چار صورتیں ہیں، (۱) دونوں مکرر ہوں (۲) دونوں متجانس ہوں (۳) دونوں میں اشتقاق ہو یعنی دونوں کا مشتق منہ ایک ہو (۴) دونوں میں شبہ اشتقاق ہو یعنی دونوں کے مشتق ایک تو نہ

ہوں مگر باہم مشابہ ہوں۔

اور الفاظ کے وقوع کے لحاظ سے ہر ایک کی چار صورتیں ہیں، کہ ایک لفظ تو شعر کے آخر میں ہو اور ایک (۱) مصرع اول کے شروع میں (۲) یا اس کے حشو میں (۳) یا اس کے آخر میں (۴) یا دوسرے مصرع کے شروع میں، اب چار کو چار میں ضرب دینے سے کل سولہ قسمیں ہوئیں، مذکورہ بالا مثالوں میں دونوں الفاظ مکرر ہیں، بقیہ بارہ قسموں کی مثالیں بہ نظر اختصار ترک کرتا ہوں، تفصیل کے لیے اس فن کی مطولات کی طرف رجوع کریں۔

اب اردو زبان میں بھی اس صنعت کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

ہے کلامِ الٰہی میں شمس وضحیٰ، ترے چہرۂ نورفزا کی قسم
قسم شبِ تار میں راز یہ تھا، کہ حبیب کی زلفِ دوتا کی قسم

محمد برائے جناب الٰہی جناب الٰہی برائے محمد
محمد کا دم خاص بہر خدا ہے سوائے محمد برائے محمد

شاخ قامت شہ میں، زلف وچشم ورخسار ولب میں
سنبل، نرگس، گل، پنکھڑیاں، قدرت کی کیا پھولی شاخ

بخدا، خدا کا یہی ہے در، نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آکے ہو، جو یہاں نہیں تو، وہاں نہیں

نہیں اس کے رنگ کا کوئی دوسرا، نہ تو ہو کوئی نہ کوئی ہوا
کہو اس کو گل کہے کیا کوئی، کہ گلوں کا ڈھیر کہاں نہیں

(اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی)

امام بوصیری کے کلام میں یہ صنعت قابل دید ہے، کچھ آپ بھی اس گلشن کی سیر کرلیں۔

(۱) نفس اور شیطان کی حکم عدولی کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمَا خَصْمًا وَلَا حَكَمًا فَأَنْتَ تَعْرِفُ كَيْدَ الْخَصْمِ وَالْحَكَمِ

ترجمہ: ان دونوں میں سے ایک تیرا فریق ہو اور دوسرا فیصل تو بھی کسی کی نہ سن، کیوں کہ تو خوب جانتا ہے کہ ایسے فریق اور ایسے حکم کی چال کیا ہوگی۔

اس شعر میں ''حکم'' کو اس طور پر مکرر لایا گیا ہے کہ ایک مصرعۂ اولیٰ کے آخر میں اور دوسرا مصرعۂ ثانیہ کے آخر میں ہے، یہ ردالعجز علی الصدر کی سولہ قسموں میں سے ایک قسم ہے۔

(۲) هُمُ الْجِبَالُ فَسَلْ عَنْهُمْ مُصَادِمَهُمْ   مَاذَا رَاٰی مِنْهُمْ فِیْ کُلِّ مُصْطَدَمِ

ترجمہ: (یہ جیالے گویا پہاڑ تھے، تو ان کے بارے میں ان سے ٹکرانے والوں سے پوچھ، کہ انہوں نے ہر معرکہ میں ان سے کیا کیا (بہادری کے جوہر) دیکھے۔)

اس شعر کے مصرعۂ اولیٰ کے آخر میں ''مُصَادِم'' اور مصرعۂ ثانیہ کے آخر میں ''مُصْطَدَم'' کو استعمال کیا گیا اور ان دونوں کلمات کے درمیان اشتقاق پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ بھی صنعت ردالعجز علی الصدر کی ایک صورت ہوئی۔

(۳) صنعت ردالعجز علی الصدر کا یہ انداز بھی نرالا ہے، فرماتے ہیں:

خَدَمْتُهٗ بِمَدِیْحٍ اَسْتَقِیْلُ بِهٖ   ذُنُوْبَ عُمْرٍ مَضٰی فِی الشِّعْرِ وَالْخِدَمِ

ترجمہ: اس نعت کے ذریعہ سرکار اقدس ﷺ کی خدمت کر کے اپنی اس عمر کے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں جو اُمرا کی خدمت میں اور شعر و شاعری میں گزری۔

اس شعر میں ''خَدَمْتُ'' مصرعۂ اولیٰ کے آغاز اور ''خِدَم'' مصرعۂ ثانیہ کے اخیر میں استعمال ہوا جو اسی صنعتِ لفظیہ کی ایک شکل ہے۔

(۴) درج ذیل شعر میں بھی اس صنعتِ لفظیہ کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

فَاِنَّ لِیْ ذِمَّةً مِنْهُ بِتَسْمِیَتِیْ   مُحَمَّدًا وَهُوَ اَوْفَی الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

ترجمہ: کیوں کہ میرا نام ''محمد'' ہونے کی وجہ سے سرکار سے مجھے ایک عہد و پیمان مل چکا ہے اور آپ ساری مخلوق سے بڑھ کر عہد و پیمان کو پورا فرمانے والے ہیں۔

اس صنعت کی کچھ اور مثالیں ضیافت طبع کے لیے پیش ہیں

(۵) فَمَا لِعَيْنَيْكَ اِنْ قُلْتَ اكْفُفَا هَمَتَا وَمَا لِقَلْبِكَ اِنْ قُلْتَ اسْتَفِقْ يَهِمِ
(۶) حَتّٰى غَدَا عَنْ طَرِيْقِ الْوَحْيِ مُنْهَزِمٌ مِنَ الشَّيَاطِيْنِ يَقْفُوْا اِثْرَ مُنْهَزِمِ
(۷) اَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ الْمُنْشَقِّ اِنَّ لَهٗ مِنْ قَلْبِهٖ نِسْبَةً مَبْرُوْرَةَ الْقَسَمِ
(۸) مَاسَامَنِي الدَّهْرُ ضَيْمًا وَاسْتَجَرْتُ بِهٖ اِلَّا وَنِلْتُ جِوَارًا مِنْهُ لَمْ يُضَمِ
(۹) مُحَكَّمَاتٌ فَمَا يُبْقِيْنَ مِنْ شُبَهٍ لِذِيْ شِقَاقٍ وَّلَا يَبْغِيْنَ مِنْ حَكَمِ

صنعتِ موازنہ:

یہ ہے کہ دونوں فقروں کے آخری کلمات ہم وزن تو ہوں مگر ہم قافیہ نہ ہوں، جیسے قرآن کریم میں ہے: وَنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ○ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ○ (الغاشیۃ:۱۵)، اس مثال میں "مَصْفُوْفَة" اور "مَبْثُوْثَةٌ" ہم وزن ہیں لیکن ہم قافیہ نہیں۔

قصیدۂ بردۃ المدیح میں اس صنعتِ لفظی نے ایک شعر کے اندر بے پناہ لفظی حسن پیدا کر دیا جس کو اہل ذوق اور نکتہ دانِ فن ہی محسوس کر سکتے ہیں، امام بوصیری بارگاہِ رسالت میں یوں عرض کرتے ہیں:

○ وَمَنْ هُوَ الْاٰيَةُ الْكُبْرٰى لِمُعْتَبِرٍ وَمَنْ هُوَ النِّعْمَةُ الْعُظْمٰى لِمُغْتَنِمِ

ترجمہ: اور اے وہ ذات جو عبرت پکڑنے والے کے لیے عظیم ترین نشانی اور غنیمت پانے والے کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے۔

اس شعر کے پہلے فقرہ کے آخر میں "معتبر" اور دوسرے فقرہ کے آخر میں "مغتنم" لایا گیا ہے، یہ دونوں کلمات ہم وزن ہیں گو کہ ہم قافیہ نہیں، اس لیے یہ صنعتِ موازنہ ہوئی جو محسناتِ لفظیہ کی ایک شاندار قسم اور ایک حسین شکل ہے۔

صنعتِ مماثلہ:

یہ ہے کہ ایک فقرے کے تمام یا اکثر الفاظ دوسرے فقرے کے ان الفاظ کے ہم

وزن ہوں جوان کے مقابلہ میں آئے ہیں، جیسے:

وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ٥ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ٥ (الصافات: ۱۱۷-۱۱۸)

اس آیت کے دونوں فقروں میں پانچ پانچ کلمات استعمال ہوئے ہیں، (۱) فعل (۲) ضمیر فاعل، (۳) ضمیر مفعول اول (۴) ضمیر مفعول ثانی (۵) اس کی صفت، ان میں دونوں فعلوں کو چھوڑ کر سارے کلمات اپنے مقابل میں آنے والے کلمات کے ہم وزن ہیں، یہ نثر کی مثال ہے، نظم میں اس کی مثال یہ ہے:

مَهَا الْوُحُوْشِ اِلَّا اَنَّ هَاتَا اَوَانِسُ ‏ قَنَا الْحَظِّ اِلَّا اَنَّ تِلْكَ ذَوَابِلُ (ابوتمام)

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں "ھاتا" اور "تلک" ہم وزن نہیں ہیں بقیہ سارے کلمات اپنے مقابل کے ہم وزن ہیں، یہ اس صنعتِ مماثلت کی مثالیں ہیں جس میں دونوں فقروں کے اکثر کلمات ہم وزن ہوتے ہیں، ذیل میں اس مماثلت کی مثال پیش ہے جس کے دونوں مصرعوں کے سبھی کلمات اپنے مقابل کے ہم وزن ہوتے ہیں:

فَاَحْجَمَ لَمَّا لَمْ يَجِدْ فِيْكَ مَطْعَماً ‏ وَاَقْدَمَ لَمَّا لَمْ يَجِدْ عَنْكَ مَهْرَباً (ابوتمام)

شعرائے عجم میں ابوالفرج رومی کے اکثر قصائد صنعتِ مماثلت سے مالا مال ہیں، فارسی شعرا میں انوری نے اس صنعت کو استعمال کرنے میں اس کی اقتدا کی ہے، اسی لیے انوری کے کلام میں بھی اس صنعت کا کثرت سے استعمال ملتا ہے۔

قصیدۂ بردہ کے متعدد اشعار میں اس صنعت کی کارفرمائی نظر آتی ہے، ذیل کی مثالوں سے میرے دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے:

(۱) فَانْسُبْ اِلٰى ذَاتِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ ‏ وَانْسُبْ اِلٰى قَدْرِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمٍ

ترجمہ: آپ کی ذات کی طرف جس شرف و عزت کو چاہے منسوب کر اور آپ کے رتبۂ بلند کی جانب جو عظمت تو چاہے منسوب کر۔

اس میں مصرعہ اولیٰ کے سارے کلمات علی الترتیب مصرعہ ثانیہ کے کلمات کے ہم وزن ہیں، درج ذیل شعر میں تو اس صنعت کا رنگ ہی کچھ نرالا ہے، سرکار اقدس ﷺ کی بارگاہ والا تبار میں یوں عرض کرتے ہیں:

(۲) فَحُزْتَ کُلَّ فَخَارٍ غَیْرَ مُشْتَرَکٍ وَجُزْتَ کُلَّ مَقَامٍ غَیْرَ مُزْدَحَم

ترجمہ: تو آپ نے ہر قابل فخر کمال اپنی ذات میں اس طرح سمیٹ لیا کہ اس میں آپ کا کوئی شریک و سہیم نہیں اور ہر منزل آپ نے تنِ تنہا طے کی جس میں کوئی آپ کا مزاحم نہیں۔

(۳) وَجَلَّ مِقْدَارُ مَاوُلِّیتَ مِنْ رُتَبٍ وَعَزَّ اِدْرَاکُ مَا اُوْلِیْتَ مِنْ نِعَم

ترجمہ: (اور جو رتبے آپ کو عطا کیے گئے بڑے جلیل القدر ہیں اور جن نعمتوں سے آپ سرفراز کیے گئے ان کا حصول مشکل ہے)۔

تجنیس:

یہ ہے کہ دو لفظ تلفظ میں متفق ہوں اور معنی میں مختلف۔
تجنیس کی متعدد قسمیں ہیں: (۱) تجنیس تام۔ (۲) تجنیس غیر تام۔

تجنیس تام:

یہ ہے کہ دو الفاظ معنی میں مختلف ہوں اور درج ذیل چار چیزوں میں متفق ہوں:
(۱) حروف کی جنس میں (۲) تعداد میں (۳) ہیئت یعنی حرکات وسکنات میں (۴) ترتیب حروف میں، مثلاً عباس بن فضل بن ربیع کی تعریف میں ابونواس کا یہ شعر:

عباسٌ عباسٌ اذا احتدم الوغیٰ وَالفضلُ فضلٌ وَ الربیعُ ربیعُ

اور اردو زبان میں درج ذیل اشعار تجنیسِ تام کی اعلیٰ مثال ہیں:

بحرِ سائل کا ہوں سائل نہ کنویں کا پیاسا
خود بجھا جائے کلیجا مرا چھینٹا تیرا

جو گدا دیکھو لیے جاتا ہے توڑا نور کا
نور کی سرکار ہے، کیا اس میں توڑا نور کا
نہ دلِ بشر ہی فگار ہے کہ ملک بھی اس کا شکار ہے
یہ جہاں کہ ہژدہ ہزار ہے، جسے دیکھو اس کا ہزار ہے
انبیا کو بھی اجل آنی ہے مگر ایسی کہ فقط آنی ہے
(رضا بریلوی)

تجنیسِ غیرِ تام:

وہ ہے جس کے دونوں الفاظ مذکورہ بالا چاروں چیزوں میں سے کسی ایک میں مختلف ہوں، اس کی متعدد قسمیں ہیں، جن کا بیان آگے آرہا ہے۔

تجنیسِ مُحَرَّف:

یہ ہے کہ تجنیس کے الفاظ میں یا تو (۱) حرکت کا اختلاف ہو (۲) یا حرکت وسکون کا، مثالیں علی الترتیب یہ ہیں:

(۱) جُبَّةُ الْبُرْدِ جُنَّةُ الْبَرْدِ (۲) اَلْبِدْعَةُ شَرَكُ الشِّرْكِ (۳) اَلجَاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ

اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ والرضوان کے درج ذیل اشعار تجنیسِ محرف کی بلند پایہ مثالیں ہیں:

جلا دے دیں، جَلا دے کفر والحاد
کہ تو مُحیی ہے تو قاتل ہے یا غوث
غایت وعلت سبب، بہرِ جہاں تم ہو سب
تم سے بَنا تم بِنا، تم پہ کروروں درود

اب قصیدۂ بردۃ المدیح میں اس صنعت کے کرشمے اہلِ فن کی نگاہوں سے ملاحظہ کیجیے
(۱) امام بوصیری نفس کی گمرہی اور سرکشی کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مَنْ لِیْ بِرَدِّ جِمَاحٍ مِنْ غَوَایَتِهَا　　　كَمَا يُرَدُّ جِمَاحُ الْخَيْلِ بِاللُّجُمِ

ترجمہ: کون ہے جو میرے نفسِ سرکش کو شرارت اور سرکشی سے باز رکھے، جیسے لگام سے گھوڑوں کو سرکشی سے باز رکھا جاتا ہے۔

اس مثال میں ''مَنْ'' اور ''مِنْ'' کے درمیان تجنیس محرَّف ہے، کیوں کہ دونوں الفاظ میں حرکت کا اختلاف ہے۔

(۲)　فَاصْرِفْ هَوَاهَا وَحَاذِرْ اَنْ تُوَلِّيَهُ　　　اِنَّ الْهَوٰى مَاتَوَلّٰى يُصْمِ اَوْ يَصِمِ

ترجمہ: تو خواہشِ نفس پر قدغن لگا اور چوکنا رہ کہ وہ کہیں تجھ پر غالب نہ آجائے، کیوں کہ جب وہ غالب آتی ہے، تباہ و برباد کردیتی ہے یا رسوا کرکے چھوڑتی ہے۔

اس شعر میں ''یُصْمِ' اور ''یَصِم'' کے درمیان تجنیس محرَّف ہے اور دونوں کلمات میں حرکت و سکون کا فرق ہے۔

(۳)　فَاقَ النَّبِيِّيْنَ فِيْ خَلْقٍ وَفِيْ خُلُقٍ　　　وَلَمْ يُدَانُوْهُ فِيْ عِلْمٍ وَّلَا كَرَمٍ

ترجمہ: آپ حسنِ صورت و حسنِ سیرت دونوں میں سارے انبیاے کرام پر فائق ہیں، اور یہ لوگ علم و دانش اور عطا و بخشش میں آپ کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔

اس مثال میں ''خَلق'' اور ''خُلُق'' کے درمیان اس صنعت کا ظہور ہوا ہے جیسا کہ ادنیٰ توجہ سے واضح ہو جاتا ہے۔

(۴)　كَاَنَّمَا الدِّيْنُ ضَيْفٌ حَلَّ سَاحَتَهُمْ　　　بِكُلِّ قَرْمٍ اِلٰى لَحْمِ الْعِدٰى قَرِمٍ

ترجمہ: گویا مذہب اسلام ایک مہمان ہے جو ایسے بہادروں اور سرداروں کو لے کر کافروں کے صحن میں فروکش ہوا ہے جو دشمنوں کے گوشت کے بڑے شوقین اور حریص ہیں۔

اس مثال میں خط کشیدہ کلمات متجانس ہیں اور ان کے درمیان تجنیس محرَّف پائی جاتی ہے، ذیل میں اس صنعت کی کچھ مثالیں ضیافتِ طبع کے لیے حاضر ہیں:

(۵) صحابہ کرام کی شجاعت و جواں مردی اور شہ سواری میں مہارت کو بیان کرتے ہوئے

رقم طراز ہیں:

كَاَنَّهُمْ فِيْ ظُهُوْرِ الْخَيْلِ نَبْتُ رُباً　　مِنْ شِدَّةِ الْحَزْمِ لا مِنْ شَدَّةِ الْحُزُمِ

ترجمہ: وہ گھوڑوں کی پشت پر ایسے جمے ہوتے ہیں جیسے بلند ٹیلوں کے پودے جمے ہوتے ہیں، یہ ثابت قدمی ان کی احتیاط ومہارت کی وجہ سے ہے، بندھن مضبوط ہونے کی وجہ سے نہیں۔

(۶)　طَارَتْ قُلُوْبُ الْعِدىٰ مِنْ بَاْسِهِمْ فَرَقًا　　فَمَا تُفَرِّقُ بَيْنَ الْبَهْمِ وَالْبُهَمِ

ترجمہ: ان کی دہشت سے دشمنوں کے ہوش اس طرح اڑ گئے کہ وہ بھیڑ بکریوں کے بچوں اور بہادر جیالوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔

تجنیسِ ناقص:

یہ ہے کہ تجنیس کے دونوں الفاظ عدد، حروف میں کم وبیش ہوں کہ کسی میں حرف زیادہ ہو اور کسی میں کم، مثلاً لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ۔

حروف کی زیادتی کبھی کلمہ کے اول میں ہوتی ہے کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں، پہلی قسم کو تجنیسِ مردوف، دوسری کو تجنیس مکتنف اور تیسری قسم کو تجنیس مطرف کہا جاتا ہے۔

تجنیسِ مردوف:

وہ تجنیس ناقص ہے کہ جس میں متجانسین میں سے ایک کلمہ کے شروع میں کوئی حرف زیادہ ہو، جیسے (الف) دَوَامُ الْحَالِ مِنَ الْمُحَالِ، اس مثال میں ''حال'' اور ''مُحال'' کے درمیان تجنیس ناقص مردوف ہے کیوں کہ دوسرے لفظ کے شروع میں میم کا اضافہ ہے۔

(ب) اور جیسے قرآن کریم کی آیت میں: وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ اِلىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ۝ (القیامۃ:۲۹) اس میں ''ساق'' اور ''مساق'' کے درمیان تجنیس کی مندرجہ بالا صورت موجود ہے۔

امام احمد رضا قادری بریلوی فرماتے ہیں:

تم سے کھلا بابِ جُود، تم سے ہے سب کا وجود
تم سے ہے سب کی بقا، تم پہ کروروں درود
ثنا کا نشاں، وہ نور فشاں، کہ مہروشاں، بآں ہمہ شاں
بسایہ کشاں، مواکب شاں، یہ نام و نشاں تمہارے لیے

اب قصیدۂ بردہ میں اس صنعت کے جلوے ملاحظہ ہوں۔

نفس کی فریب کاری بیان کرتے ہوئے امام بوصیری لکھتے ہیں:

(۱) کَمْ حَسَّنَتْ لَذَّةً لِلْمَرْءِ قَاتِلَةً مِنْ حَیْثُ لَمْ یَدْرِ اَنَّ السَّمَّ فِی الدَّسَمِ

ترجمہ: بسا اوقات نفس انسان کے سامنے جان لیوا لذت کو ایسی اچھی صورت میں پیش کرتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ چکنائی میں زہر ملا ہوا ہے۔

اس مثال میں ''سَمّ'' اور ''دَسَم'' کے درمیان تجنیس ناقص مردوف پائی جاتی ہے۔

(۲) آیات قرآنی کی مدح وستائش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

لَمْ تَقْتَرِنْ بِزَمَانٍ وَّھِیَ تُخْبِرُنَا عَنِ الْمَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَعَنْ اِرَمٖ

ترجمہ: یہ کسی خاص زمانے سے محدود نہیں، مگر آئندہ وگزشتہ کے حالات مثلاً آخرت اور قوم عاد وارم سے متعلق ہمیں خبردار کرتی ہیں۔

(۳) رسولِ اقدس ﷺ کی عظمت و رفعت کو بیان کرتے ہوئے اس صنعت کا استعمال قابلِ دید ہے، عرض کرتے ہیں:

وَجَلَّ مِقْدَارُ مَا وُلِّیْتَ مِنْ رُّتَبٍ وَعَزَّ اِدْرَاکُ مَا اُوْلِیْتَ مِنْ نِّعَمٖ

ترجمہ: جو رتبے آپ کو عطا کیے گئے بڑے جلیل القدر ہیں، اور جن نعمتوں سے آپ سرفراز کیے گئے ان کا حصول بہت مشکل ہے۔

اس شعر میں ''وُلِّیْتَ'' اور ''اُوْلِیْتَ'' کے درمیان تجنیس مزدوج ہے۔

خیال رہے کہ اس باب میں حرف مشدد، مخفف کے حکم میں ہوتا ہے، جیسا کہ شیخ

ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمن بن عمر قزوینی نے تلخیص المفتاح میں اور علامہ سعدالدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر المعانی میں اس کی صراحت کی ہے۔

تجنیس غیر تام میں کبھی دونوں کلموں کے حروف تعداد میں برابر ہوتے ہیں مگر ایک حرف کا فرق ہوتا ہے، یعنی ایک کلمہ میں کوئی ایک حرف پایا جاتا ہے اور دوسرے میں اس کے سوا دوسرا حرف ہوتا ہے، یہ حرف اگر اپنے مقابل کے حرف سے قریب المخرج ہو تو تجنیس مضارع ہے ورنہ تجنیس لاحق۔

تجنیس لاحق:

جیسے قرآن کریم میں ہے (الف) وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ (الهمزة ۱:۱)

اس مثال میں "هُمَزَةٍ" اور "لُمَزَةٍ" کے درمیان سارے حروف میں اتفاق کے ساتھ حروف اول میں فرق پایا جاتا ہے، کہ پہلے کلمہ میں حرف اول "ھا" ہے اور دوسرے کلمے میں حرف اول "لام" ہے اور یہ دونوں قریب المخرج نہیں ہیں۔

(ب) اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (العادیات: ۷-۸) اس مثال میں "شَهِيْد" اور "شَدِيْد" کے درمیان "دال" اور "ھا" کا فرق ہے اور یہ دونوں قریب المخرج نہیں ہیں۔

(ج) اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ، (النساء: ۸۳) اس مثال میں "اَمْرٌ" اور "اَمْنٌ" کے درمیان "راء" اور "نون" کا فرق ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تجنیسِ لاحق کی تین صورتیں ہیں:
(۱) متجانسین میں جس حرف سے فرق واختلاف واقع ہوا ہے وہ کلمہ کے شروع میں ہو (۲) درمیان میں ہو (۳) کلمہ کے آخر میں ہو، جیسا کہ اوپر کی مثالیں بتا رہی ہیں۔

اردو زبان میں اس صنعت کی مثالیں درج ذیل ہیں:

کہا جگنو نے او مرغِ نواریز
نہ کر بے کس پہ منقار ہوس تیز

تجھے جس نے چٹک گل کو مہک دی   اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی (اقبال)

وہ اٹھیں چمک کے تجلیاں، کہ مٹادیں سب کی تعلیاں
دل وجاں کو بخشیں تسلیاں، ترا نور بار دوحار ہے
وہاں فلک پر یہاں زمیں پر، رچی تھی شادی، مچی تھیں دھومیں
ادھر سے انوار ہنستے آتے، ادھر سے نفحات اٹھ رہے تھے
براق کے نقش سم کے صدقے، وہ گل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن، لہکتے گلشن، ہرے بھرے لہلہا رہے تھے
شافع روز جزا، تم پہ کروروں درود
دافع جملہ بلا، تم پہ کروروں درود
کر کے تمہارے گناہ، مانگیں تمہاری پناہ
تم کہو دامن میں آ، تم پہ کروروں درود (امام احمد رضا بریلوی)

اب قصیدۂ بردہ شریف میں اس صنعت کی جلوہ ریزیاں دیکھئے:

(۱) كَالزَّهْرِ فِيْ تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِيْ شَرَفٍ   وَالْبَحْرِ فِيْ كَرَمٍ وَالدَّهْرِ فِيْ هِمَمٍ

ترجمہ: آپ تازگی میں کلی کی مانند، اوج ورفعت میں مہِ کامل کے مثل، جود وسخا میں سمندر کی طرح اور عزم وحوصلے میں زمانہ کے مانند ہیں۔

(۲) وَاَحْيَتِ السَّنَةَ الشَّهْبَاءَ دَعْوَتُهٗ   حَتّٰى حَكَتْ غُرَّةً فِي الْاَعْصُرِ الدُّهُمِ
بِعَارِضٍ جَادَ اَوْ خِلْتَ الْبِطَاحَ بِهَا   سَيْباً مِّنَ الْيَمِّ اَوْ سَيْلاً مِّنَ الْعَرِمِ

ترجمہ: بارہا سرکار کی دعا نے قحط رسیدہ سال کو ایسی شادابی بخشی کہ وہ سرسبز زمانوں میں بے حد نمایاں ہوگیا۔ ایسے بادل کے ذریعہ جو اس قدر جھوم کے برسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگلاخ وادیوں پر سمندر کا کوئی ریلا چلا آیا، یا عرم کا سیلاب آگیا۔

(۳) فَحُزْتَ كُلَّ فَخَارٍ غَيْرَ مُشْتَرَكٍ   وَجُزْتَ كُلَّ مَقَامٍ غَيْرَ مُزْدَحَمٍ

ترجمہ: تو آپ نے ہر قابلِ فخر رتبہ اپنے دامن میں اس طرح سمیٹ لیا کہ اس میں کوئی آپ کا شریک وسہیم نہیں اور ہر منزل آپ نے تن تنہا طے کی جس میں کوئی آپ کا مزاحم نہیں۔

تجنیس قلب:

یہ ہے کہ تجنیس کے ایک لفظ میں حروف کی جو ترتیب ہے وہ دوسرے لفظ کے حروف میں نہیں، اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) قلب کل (۲) قلب بعض۔

قلبِ کل: یہ ہے کہ لفظ کے تمام حروف کو ترتیب وار الٹ دو تو دوسرا لفظ بن جائے، مثلاً حُسَامُهُ فَتْحٌ لِأَوْلِيَاءِ ہ وَ حَتْفٌ لِأَعْدَاءِ ہ (اس کی تلوار دوستوں کے لیے سراپا فتح و نصرت اور دشمنوں کے لیے مجسم موت ہے)، اس میں ''فتح'' اور ''حتف'' میں قلب کل ہے۔

قلب بعض: یہ ہے کہ ایک لفظ کے بعض حروف کو الٹ دو تو دوسرا لفظ بن جائے، مثلاً اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَامِنْ رَوْعَاتِنَا (اے اللہ! ہماری عیب پوشی فرما اور خوف کی چیزوں سے ہمیں نجات دے)، اس حدیث میں ''عورات'' اور ''روعات'' میں قلب بعض ہے۔

قصیدۂ بردۃ المدیح میں بھی قلب بعض کی مثال موجود ہے:

(۱) وَلَا الْتَمَسْتُ غِنَى الدَّارَيْنِ مِنْ يَدِهٖ　　اِلَّا اسْتَلَمْتُ النَّدٰى مِنْ خَيْرِ مُسْتَلَمِ

ترجمہ: اور جب بھی میں نے آپ سے دونوں جہاں کی دولت مانگی تو سب سے بہتر داتا سے مجھے وہ دولت وثروت مل گئی۔

اس شعر میں ''اِلْتَمَسْتُ'' اور ''اِسْتَلَمْتُ'' میں قلبِ بعض ہے۔

فوائدِ اشعار

قصیدۂ بردہ شریف نہایت بابرکت اور حصول مقاصد کے لیے بڑا نفع بخش ہے، مشائخ کرام اور بزرگان دین سے اس کے فوائد و برکات منقول ہیں، جو بطور وظیفہ اسے پڑھا کرتے اور اس کے آدابِ تلاوت کا لحاظ کر کے اس کی برکتوں سے مستفیض ہوتے، مگر شرطِ افادیت یہ ہے کہ ان آدابِ تلاوت کو ملحوظ رکھا جائے جن کا بیان آگے آرہا ہے۔

یہ قصیدہ لکھ کر جس مال و متاع یا مکان میں رکھا جائے اس میں چوری نہ ہوگی اور وہ ہر طرح کی تباہی و بربادی سے محفوظ و مامون رہے گا، اس کی قراءت حلِ مشکلات کے لیے تیر بہدف نسخہ ہے، محبت و اخلاص اور عشق و عقیدت سے پڑھنے کے بعد جو دعا کی جائے گی ان شاءاللہ مقبول ہوگی۔

اب ذیل میں بعض اشعار کے فوائد و تاثیرات درج کیے جاتے ہیں جو اس قصیدہ کی عربی شرح میں شیخ الاسلام علامہ ابراہیم باجوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ) نے ذکر کیے ہیں۔

o پہلے دونوں شعروں کو ہرن کی جھلی پر لکھ کر داہنے بازو پر باندھ لیا جائے تو بہت جلد عربی زبان بولنا آجائے۔

o فَمَالِعَیْنَیْکَ الخ سے وَاَثْبَتَ الْوَجْدُ الخ تک پانچ اشعار کا فائدہ یہ ہے کہ اگر اپنی بیوی، یا بیٹی یا اہل خانہ میں سے کسی شخص کے بارے میں کسی پوشیدہ راز کا وہم وگمان ہو تو لیموں کے پتے پر لکھ کر سوتے وقت اس کے بائیں ہاتھ پر رکھ دیں اور اپنا کان اس کے منہ کے قریب کریں تو اِس کی غیر موجودگی میں اُس نے جو بھی اچھا یا برا کام کیا ہوگا بیان کر دے گی۔

یوں ہی اگر کسی کی کوئی چیز چوری ہوگئی ہے اور کسی پر شک وشبہہ ہو تو یہ پانچوں

اشعار مینڈک کی دباغت دی ہوئی کھال پر لکھے اور مینڈک کی زبان لے کر کھال میں اور جس پر شبہہ ہو اس کی گردن میں باندھ کر لٹکا دے تو وہ دہشت زدہ ہو جائے گا اور فوراً جرم کا اقرار کرلے گا۔

o "نعم سری طیف من" الخ جو شخص بعد نماز عشا اس شعر کو پڑھتے پڑھتے سو جائے تو ان شاءاللہ اسی رات سرکار کی زیارت سے شادکام ہوگا۔

o "یالائمی فی الھوی العذری" الخ کسی کے سامنے خلاف شرع کوئی کام ہو رہا ہو اور وہ اس کو روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اگر زعفران، مشک اور عرقِ گلاب سے یہ اور اس کے بعد والا شعر ایک کاغذ پر دائرہ میں لکھ کر اپنی دونوں آنکھوں کی سیدھ میں سر پر عمامہ کے نیچے رکھ لے تو ان شاءاللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اپنے اندر اس کے ازالہ کی طاقت محسوس کرے گا۔

o "فان امارتی بالسوء ما اتعظت" الخ اگر کسی پر نفس ایسا غالب ہو کہ اسے توبہ کی توفیق نہ ملتی ہو اور مخالفتِ نفس کی اپنے اندر طاقت نہ پاتا ہو تو یہ اور بعد کے دو شعر ایک کاغذ پر بعد نماز جمعہ لکھ کر عرقِ گلاب سے دھو کر پلائیں اور اسی جگہ قبلہ رو بٹھائیں اور خشوع و خضوع کے ساتھ ذکر الٰہی میں مصروف رہیں اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرائیں کہ اسے سچی توبہ کی توفیق نصیب ہو، عصر و مغرب کی نمازیں اسی جگہ ادا کی جائیں، اس دوران یہ اشعار بھی اس سے پڑھوائے جائیں تو بحکم الٰہی اس مجلس سے جدا ہونے سے پہلے ہی اس کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا ہو جائے گا اور اسے اپنے نفسِ سرکش پر قابو مل جائے گا۔

o "من لی بردّ جماح من غوایتھا" الخ خلاف شرع کام کے ازالہ کے لیے ابتدا ہی میں یہ اور بعد کے دو شعر دس مرتبہ پڑھے تو باذن اللہ تعالیٰ بے مثال رعب اور مقبولیت دیکھے گا۔

o "فاصرف ھواھا وحاذر أن تولیۂ" الخ جو شخص یہ اور بعد کے دو شعر ہر فرض نماز کے بعد بیس مرتبہ پڑھنے کا وظیفہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے کتاب و سنت پر استقامت عطا فرمائے گا اور بدعات و خرافات اور ہوائے نفس سے محفوظ رکھے گا۔

○ ''واخش الدسائس من جوع ومن شبع'' الخ غلبۂ نفس اور سختیِ قلب کو ختم کرنے کے لیے یہ اور اس کے بعد والا شعر شب جمعہ کو صبح صادق تک پڑھے، صبح صادق سے پہلے پہلے حیرت انگیز تبدیلی کا مشاہدہ کرے گا، دل میں نرمی پیدا ہوگی، نفس مغلوب ہوگا، اعضا میں عبادت کا شوق، سابقہ گناہوں پر ندامت وشرم ساری پیدا ہوگی اور بارگاہ خداوندی میں توبہ مقبول ہوگی۔

○ ''خالف النفس والشيطان واعصهما'' الخ یہ اور بعد والا شعر پابندی کے ساتھ پڑھنے والا نفس اور شیطان پر غالب رہے گا اور بہ حکم الٰہی دونوں کے شر سے محفوظ ومامون رہے گا۔

○ ''ولا تزودت قبل الموت نافلة'' الخ جس شخص کے علم وعمل کے اندر ریا وتکبر وخود پسندی آجائے تو طلوعِ فجر کے وقت یہ اور اس سے پہلے کے دو شعر لکھے اور اکہتر بار ان کو پڑھے پھر اس تحریر کو اپنے بائیں بازو پر اس طرح باندھے کہ وہ پہلو کی جانب مائل ہو تو اس کے اندر تواضع وانکسار پیدا ہوگا اور خود پسندی وریاکاری کے شعلے سرد پڑجائیں گے۔

○ ''ظلمت سنة من أحيى الظلام الى'' الخ جب سستی وکاہلی اور نیند کا غلبہ ہو، شب بیداری گراں ہو اور نفس دنیوی عیش وآرام کا خواہاں ہو تو یہ اور بعد کے چار شعر ایک تختی پر لکھ کر سرہانے رکھ لیے جائیں تو نفس امورِ آخرت کی یاد سے معمور ہوگا اور اس میں اعمالِ صالحہ کا چاؤ پیدا ہوگا۔

○ ''نبينا الآمر الناهي فلا احد'' الخ یہ اور اس کے بعد والا شعر پابندی کے ساتھ پڑھنے والا مصائب وآلام سے محفوظ رہے گا اور جو مبتلائے مصیبت ہو نصفِ شب کو ان اشعار کا وِرد کرے اور مصائب وآلام سے نجات کے لیے سرکار کو بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ بنائے، ان شاء اللہ اس کے مصائب رفع ہوجائیں گے۔

○ ''دعا الى الله فالمستمسكون به'' الخ ایمان کی حفاظت کے لیے ہر نماز کے بعد

دس مرتبہ یہ شعر پڑھے اور اس سے پہلے درج ذیل درود شریف کا ورد کرے ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی نَبِیِّکَ الْبَشِیْرِ، الدَّاعِیْ اِلَیْکَ بِاِذْنِکَ السِّرَاجِ الْمُنِیْرِ''۔

○ ''لوناسبت قدرہ ایاتہ عظما'' الخ دشمنانِ دین سے جہاد اور بحث ومباحثہ کے وقت ''محمد سید الکونین والثقلین'' الخ سے لے کر اس شعر تک پڑھنا اور لکھ کر پانی سے دھو کر پینا قوت قلب اور حصولِ شدت وغلبہ کے لیے بے حد مفید ہے اور اگر عرقِ گلاب اور زعفران سے لکھ کر پی جائے تو سوالِ نکیرین کے وقت استقامت اور ثابت قدمی نصیب ہو باذنہ تعالیٰ۔

○ ''ماسامنی الدھر ضیما واستجرت بہ'' الخ اگر کسی شخص کو حاکمِ وقت سے اندیشہ ہو یا وہ جیل میں ہو تو ہر نماز کے بعد سترہ بار پابندی کے ساتھ یہ اور اس کے بعد والا شعر پڑھے، ان شاء اللہ اس کی پریشانی دور ہوگی اور غیب سے اس کی رہائی کا سامان پیدا ہو جائے گا۔

○ ''لاتنکر الوحی من رؤیاہ ان لہ'' الخ شفائے امراض کے لیے یہ اور اس کے بعد والے شعر کو مٹی کے پیالے پر لکھ کر ملیٹھی کے جوشاندہ سے دھو کر نہار منہ پینا بہت مفید ہے۔

○ ''تبارک اللہ ماوحی بمکتسب'' الخ یہ اور بعد والا شعر مرگی زدہ انسان کے لیے مفید ہے، ان دونوں اشعار کو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھے اور کسی نیلے کپڑے میں لکھ کر فتیلہ بنائے پھر مرگی زدہ کی ناک کے قریب نیچے کی جانب اس طور پر جلائے کہ اس کے دھوئیں کا اثر ناک کے اندر پہنچے، جب وہ دھوئیں کا اثر محسوس کرے گا تو چیختے ہوئے باہر بھاگے گا اور آنکھوں کے درمیان لکھی ہوئی تحریر مٹا دے گا اور پھر کبھی اس کا اثر نہ ہوگا، جب یہ عارضہ ختم ہو جائے تو کسی قرآنی آیت کے ساتھ ان اشعار کا تعویذ لکھ کر مریض کے گلے میں پہنا دے، تو اس کی حیرت انگیز تاثیر سامنے آئے گی۔

○ ''فما تطاول امال المدیح الی'' الخ اس شعر سے لے کر ''قد تنکر العین ضوء الشمس من رمد'' الخ تک پندرہ اشعار ذوقِ عبادت پیدا کرنے اور فصاحتِ زبان کے لیے بے حد نفع بخش ہیں، جس شخص کے اندر ذوقِ عبادت کی کمی ہو یا زبان میں لکنت ہو تو

مٹی کے پیالے پر عرق گلاب اور زعفران سے یہ پندرہ اشعار لکھ کر پانی سے دھو کر سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد پیے تو بعونہٖ تعالیٰ ذوقِ عبادت بیدار ہوگا، لکنت دور ہوگی اور فصیح اللسان ہو جائے گا۔

٥ ''یا خیر من یمّم العافون ساحتہ'' الخ اس شعر سے ''جلَّ مقدارُ ما اُوتیتَ مِنْ رُتَبٍ'' الخ کے آخر تک گیارہ اشعار کی خاصیت یہ ہے کہ اگر کسی مجرم کو یہ اندیشہ ہو کہ حاکم اسے سرزنش اور لعنت وملامت کرے گا تو یہ اشعار اونٹ کی کھال پر لکھ کر کپڑوں کے نیچے سینہ پر رکھ کر حاکم کے یہاں جائے اور اندر داخل ہوتے وقت تین بار ''اللہ اکبر'' کہہ لے تو حاکم اس سے اس جرم کے سلسلے میں کبھی کوئی گفتگو ہی نہ کرے گا، اگر بیوی یا محبوب سے جھگڑا ہو جائے تو ان اشعار کو شیر کی کھال پر لکھ کر عمامہ کے پیچ میں رکھ لے اور خاموشی کے ساتھ محبوب کے پاس جائے تو باذنہٖ تعالیٰ محبوب خود گفتگو کا آغاز کرے گا اور اس کا عاشق وشیدا ہو جائے گا، مگر ہرگز ہرگز ناجائز وحرام مقصد کے لیے یہ عمل نہ کرے۔

٥ ''ھم الجبال فسل عنھم مُصادمھم'' الخ سے ''طارتْ قلوبُ العِدیٰ من باسِھِم فرَقاً'' الخ تک آٹھ اشعار کی خاصیت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شہر یا گھر یا باغ کے پھاٹک پر یہ اشعار لکھ دے تو جب تک ان کے نقوش باقی رہیں گے وہاں کسی چور یا کیڑے مکوڑے کی رسائی نہیں ہوگی۔

علامہ ابراہیم باجوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ان اشعار کے درج بالا فوائد بتانے والے بزرگ نے فرمایا کہ گیہوں، جو وغیرہ میں میں نے خود اس کا تجربہ کیا تو نہایت مفید پایا، میں نے ایک بار یہ اشعار ایک گھر کے دروازہ پر لکھ دیے اور باہر چلا گیا، میری عدم موجودگی میں چور آیا تو اس نے ایک ہولناک آواز سنی اور الٹے پاؤں واپس ہو گیا، پھر اپنے ساتھیوں سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا، انہوں نے بتایا کہ صاحبِ خانہ تو دو ہفتے ہوئے کہیں گئے ہوئے ہیں، گھر پر موجود نہیں ہیں، چنانچہ دوسری رات چور دوبارہ آیا تو ایک آواز سنی کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ ''میں ایک لمحے کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں گیا'' اس طرح ان اشعار کی برکت سے وہ گھر چوری سے محفوظ رہا۔

○ ''وَمَن تکنُ بِرسُولِ اللّٰہِ نُصرتُہٗ'' الخ سے ''اَحلَّ اُمَّتَہٗ فِی حِرزِ مِلَّتِہٖ'' الخ تک تین شعروں کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر درندوں کا سامنا ہو جائے اور حملہ کا اندیشہ ہو تو اپنے لعابِ دہن سے ہتھیلی پر لکھ کر ان کو دکھائے، باذنہ تعالیٰ وہ دفع ہو جائیں گے اور وہ ان کے شر سے محفوظ ہو جائے گا۔

○ ''کم جدّلتْ کلماتُ اللّٰہِ منْ جَدلٍ'' الخ یہ اور بعد والا شعر سفید کاغذ پر لکھ کر ریشم کے دھاگے میں پرو کر بچوں کے گلے میں ڈالا جائے تو آسیب اور اثرات وامراض سے محفوظ رہیں۔

○ ''خدمتہٗ بمدیحٍ استقیلُ بہٖ'' الخ سے ''لَمْ اُرِدْ زَھرۃَ الدُّنیا التي اقتطفتْ'' کے آخر تک بارہ اشعار کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی کو سانپ، بچھو، یا اور کسی زہریلے جانور نے کاٹ لیا ہو تو ان اشعار کو عرقِ گلاب اور بارش کے پانی سے لکھ کر پلائے ان شاء اللہ زہر فوراً اتر جائے گا۔

ان کے علاوہ مشائخِ سلاسل اور بزرگانِ دین نے اپنے اپنے تجربات ومشاہدات کے اعتبار سے اس قصیدہ کے اشعار کے اور بھی خواص وتاثیرات اور فوائد وبرکات لکھے ہیں، جن سے اربابِ عقیدت فائدہ اٹھاتے اور پریشانیوں سے نجات پاتے رہے ہیں، بہرحال اخلاص اور حسنِ اعتقاد شرط ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے محبوبانِ بارگاہ کے وسیلے سے ہر قاری وسامع کو اس کی برکتوں سے حظِّ وافر عطا فرمائے اور اس ناچیز راقم سطور کو اس کے فوائد سے فیض یاب فرمائے اور دارین کی سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے، آمین بجاہ حبیبنا وشفیعنا ومولانا سید الانبیاء والمرسلین وآلہٖ وصحبہٖ أجمعین.

قصیدۂ مبارکہ پڑھنے کے آداب

ذیل میں قصیدۂ بردہ شریف پڑھنے کے آداب لکھے جاتے ہیں جو امام محقق علامہ سید عمر مفتیِ شہر خرپوت کی تصنیف عصیدۃ الشہدۃ شرح قصیدۂ بردہ سے ماخوذ ہیں، فرماتے ہیں کہ اس قصیدہ کے پڑھنے میں چند شرائط وآداب کا لحاظ ضروری ہے، ورنہ نتیجہ میں اگر فائدہ ظاہر نہ ہوتو قصیدہ کی بے اثری نہ سمجھی جائے، بلکہ اپنی غلطی پر محمول کرے، امام غزنوی اس قصیدۂ مبارکہ کو ہر رات پڑھا کرتے تاکہ اس کی برکت سے سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو، ایک مدت تک پڑھنے کے باوجود زیارتِ سرکار سے مستفیض نہ ہوئے تو اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر ماجرا سنایا، شیخ نے جواب دیا: "لعلک لا تراعِیُ شرائطھا" غزنوی! شاید تم اس کی شرائط وآداب کی رعایت نہیں کرتے، شیخ غزنوی نے عرض کیا "لا، بل اُراعیھا" "نہیں حضور! میں خاص رعایت اور توجہ سے پڑھتا ہوں، تو ان کے شیخ نے مراقبہ کیا اور فرمایا: وَقَفْتُ علیٰ سِرِّہٖ، وَھُوَ اَنَّکَ لا تُصَلِّیْ بِالصَّلٰوۃِ الَّتِیْ صَلّٰی بِھَا الْاِمَامُ الْبُوْصِیْرِیُ اِذْھُوَ یُصَلِّیْ عَلَیْہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ بِقَوْلِہٖ:

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمٖ

(غزنوی! زیارت نہ ہونے کا راز مجھے معلوم ہوگیا، وہ یہ ہے کہ تم وہ درود نہیں پڑھتے جو امام بوصیری نے سرکار کی بارگاہ میں اس قصیدہ کو پیش کرتے وقت پڑھا تھا اور وہ درود یہ ہے:

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمٖ)

اور اس قصیدہ میں اس درود کا پڑھنا ہی خاص سرّ ہے، اس کے سوا کوئی اور درود نہ ہو۔

اس قصیدۂ مبارکہ کو پڑھنے کی شرائط وآداب درج ذیل ہیں:

پڑھنے کے آداب
۱۔ باوضو ہو۔ ۲۔ قبلہ رو بیٹھ کر پڑھے۔ ۳۔ صحت الفاظ کی خاص کوشش کرے اور زیر، زبر، پیش، کی صحت کا بھرپور لحاظ رکھے۔ ۴۔ جو شعر پڑھے اس کے معنی سمجھتا ہو، اس لیے کہ الفاظ کے معنی و مفہوم نہ سمجھنے کی صورت میں اس کی تاثیر جاتی رہتی ہے، جیسا کہ علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ "الحزب الاعظم" میں فرمایا:

"فعلیک بحفظ مبانیه و التامل فی معانیه" (یعنی تمہارے لیے الفاظ کو یاد کرنا اور معانی سمجھنا لازم ہے)۔

۵۔ ہر شعر کو شعر کے طرز پر پڑھے نہ کہ نثر کے طریقے پر۔

۶۔ پورا قصیدہ پہلے زبانی یاد کر لے پھر پڑھنے کا معمول بنائے۔

۷۔ بطور وظیفہ پڑھنے والا کسی شیخ مجاز سے اس کی اجازت حاصل کر لے، پھر اس کا وِرد شروع کرے۔

۸۔ قصیدہ کے اول و آخر میں وہ خاص درود پڑھا جائے جو امام بوصیری نے بارگاہِ رسالت میں پڑھا تھا۔ (عصیدۃ الشہدۃ، از: علامہ عمر بن احمد خرپوتی، ص ۲۴، مطبوعہ: آرام باغ کراچی)

○ اور اس قصیدہ کے آغاز سے پہلے درج ذیل اشعار پڑھ لینا چاہئے:

الحمدُللّٰه مُنْشِی الخَلْقِ مِنْ عَدَمٖ ثُمَّ الصَّلٰوةُ علَی المُختارِ فی القِدَمٖ

مَوْلایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِماً اَبَدًا عَلیٰ حَبِیبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمٖ

کیوں کہ ان میں حمد الٰہی اور درود و سلام بھی موجود ہیں اور ہر اہم اور عظیم الشان کام کے آغاز میں ان کے پڑھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ کام برکتوں سے معمور اور بے برکتی سے دور ہو جاتا ہے، اس مبارک قصیدہ کی ابتدا میں ان اشعار کا پڑھا جانا عربوں سے منقول اور بہت سے مشائخ کا معمول رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرح بردہ

الفصل الأول

في ذكر العشق

اَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِيْ سَلَمٍ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرٰی مِنْ مُّقْلَةٍ بِدَمٍ ①

ترجمہ: کیا تجھے ذی سلم کے ہم سایے یاد آ گئے ہیں جس کی وجہ سے تیری آنکھوں سے خونِ آلود آنسو رواں ہیں؟

لغات: أَمِنْ: ہمزہ مفتوحہ برائے استفہام بمعنی کیا۔ مِنْ: حرفِ جر برائے سببیت، یہ "مَزَجْتَ" سے متعلق اور اس کی علت ہے۔ تَذَكُّر: یاد، مصدر از باب تفعل۔ جِيْرَان: جار کی جمع، ہم سایہ، پڑوسی، مراد محبوب۔ ذُوْ سَلَم: قُدَیْد کے قریب مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے (شرح الباجوری علی البردہ، ص ۳) علامہ یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں: ذو سلم حجاز کی ایک وادی کا نام ہے جو بصرہ سے مکہ آنے والے راستے پر واقع ہے، "سلم" دراصل ایک کانٹے دار درخت کا نام ہے جس کی پتیوں سے چمڑے کو دباغت دی جاتی تھی، وادیِ ذو سلم میں یہ درخت کثرت سے پایا جاتا ہے، (ج ۳، ص ۲۴۰، مطبوعہ بیروت) لیکن یہاں پہلا معنی ہی مراد لینا مناسب ہے۔ مَزَجْتَ: (ن) آمیزش کی، ملایا۔ دَمْع: اشک، آنسو (ج) دُمُوْع۔ مُقْلَة: آنکھ، آنکھ کا ڈھیلا، گوشۂ چشم (ج) مُقَل۔

أَمْ هَبَّتِ الرِّيْحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ
وَأَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ اِضَمِ ②

ترجمہ: یا کاظمہ کی جانب سے ہوا آگئی ہے، یا وادیِ اِضَم میں کوئی بجلی چمکتی دیکھی ہے۔

لغات: أَمْ: یا، حرف عطف۔ هَبَّتِ الرِّيحُ: (ن) ہوا چلی۔ اَلرِّيحُ: ہوا (مؤنث) (ج) اَرْيَاح وَ اَرْوَاح وَ رِيَاح وَ رِيَحٌ (جج) اَرَاوِيح وَ اَرَايِيحُ۔ ہوائیں چار ہیں: الجنوب: دکھنی ہوا۔ الشِّمال: اتری ہوا۔ الصَّبَا: پروائی ہوا۔ الدَّبُور: پچھوائی ہوا۔ تِلْقَاءَ: جانب، طرف۔ أَوْمَضَ الْبَرْقُ: بجلی کا آہستہ چمکنا۔ اَلظَّلْمَاءُ: تاریکی، اندھیرا۔ كَاظِمَة: بحرین اور بصرہ کے درمیان کا ایک ساحلی راستہ جس کے اطراف کی وادیاں خوشگوار موسم، شیریں پانی، پُرکشش اور خوب صورت مناظر کے لیے مشہور ہیں، عربی شعرا نے اپنے اشعار میں اس مقام کا کثرت سے ذکر کیا ہے، (معجم البلدان، ج۲، ص۴۳۱) شیخ خالد ازہری لکھتے ہیں کہ یہ مکہ کی طرف جانے والے ایک راستے کا نام ہے، (شرح البردہ للازہری علی ھامش شرح الباجوری، ص۴)۔ اِضَم: مدینہ منورہ کے قریب ایک وادی کا نام ہے اور اس وادی میں ایک پہاڑ ہے اسے بھی اِضَم کہتے ہیں، (العمدۃ، ص۱۴) حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ذی سلم، کاظمہ اور اِضَم مدینہ طیبہ کے قریب تین مقامات کے نام ہیں اور ان اشعار میں یہی معنی مراد لینا زیادہ مناسب ہے، (الزبدۃ العمدۃ فی شرح البردۃ)۔

تشریح: ان دونوں اشعار کا مفہوم یوں سمجھئے کہ ایک محبّ ہے جس کا محبوب "ذو سلم" کا رہنے والا ہے اور کاظمہ اور اِضَم سے بھی اس کا تعلق ہے جہاں اس کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے، یہ محبّ اپنے اس محبوب سے دور ہے اور اس کے ہجر و فراق میں مضطرب اور بے چین ہے، جب اس کا یہ اضطراب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے تو صبر و تحمل کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے اور محبوب کی یاد میں اس کی آنکھیں آنسوؤں کی موسلا دھار بارش کرنے لگتی ہیں اور آنسو بھی عام آنسو نہیں بلکہ ایسے آنسو ہیں جن میں خونِ جگر کی آمیزش ہے جس سے اس کی حد درجہ بے تابی اور بے چینی عیاں ہے، اس حالِ زار میں بھی وہ اپنے عشق اور محبوب کے ساتھ اپنے والہانہ تعلق کو چھپاتا ہے جیسا کہ عاشقوں کی عادت ہے۔ شاعر اس کے عشق

اور والہانہ محبت سے آگاہ ہے اسے روتا دیکھ کر اس سے کہتا ہے تو کیوں زار وقطار رو رہا ہے اور اپنے خونِ جگر کو آنسوؤں کے ساتھ بہا رہا ہے؟ تیرے اس طرح رونے کا سبب کیا ہے؟ کیا تجھے ذو سلم میں رہنے والا محبوب یاد آ رہا ہے، یا دیارِ محبوب کے درو دیوار سے مَس ہو کر ہوا کے جھونکے آئے ہیں جن سے تیرا زخم جگر ہرا ہو گیا ہے، یا دیارِ محبوب کی سمت، تاریکی میں کوئی بجلی چمکتی دیکھ لی ہے جس سے تجھے محبوب کا نورانی چہرہ یاد آ گیا ہے؟

سوزِ دروں کے اظہار کا یہ شاعرانہ اسلوب بہت ہی دل کش اور لطیف ہے کہ محبوب کا نام بھی زبان پر نہ آئے، بلکہ صرف طرزِ تعبیر اور پیرایۂ بیان سے عشق و وارفتگی اور قلبی والہانہ پن کا اظہار ہو جائے، شاعر یہاں عشق کی ایک خاص کیفیت بیان کر رہا ہے جب کہ عاشق کو ہر شے میں محبوب کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے، ہر بات میں اس کی یاد آنے لگتی ہے اور اس کے زخمِ جگر کو کریدنے کے لیے ایک اشارہ اور اس کے رونے کے لیے ایک ہلکا سا بہانہ کافی ہوتا ہے، بقولِ شاعر اس کی کیفیت کچھ یوں ہو جاتی ہے:

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

اور پھر جب وہ روتا ہے تو آنکھوں سے خون آلود آنسوؤں کا ایک سیلاب امنڈنے لگتا ہے اور اس کی چشمانِ تر ساون بھادوں برسانے لگتی ہیں:

گہے ابرِ کرم، گاہے ترشّح، گہ بُود باراں
بیا در چشمِ ما بنگر ہوائے برشکالی را

مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو
سیاہی بھی، سفیدی بھی، شفق بھی، ابرِ باراں بھی

مگر خیال رہے کہ شاعر ان اشعار میں جس عاشق سے رونے کا سبب دریافت کر رہا ہے وہ کوئی اور نہیں، بلکہ خود وہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سچے عاشق تو زمانے میں

نایاب ہیں جن سے عشق کے رموز واسرار اور دل پر گزرنے والے احوال وکیفیات کا اظہار کیا جائے، اس لیے شعرا اپنی ہی ذات کو ایک الگ شخص فرض کر کے اس سے سوال و جواب، ناز وعتاب اور اپنے قلبی احوال کا اظہار کرتے ہیں، اس صنعت کو علماے بلاغت "تجرید" کہتے ہیں۔

امام بوصیری نے اس نعتیہ قصیدہ کی ابتدا قدیم عربی شاعری کے روایتی انداز سے کی ہے مگر نعت کے مضمون کی نزاکت اور مقام رسالت کا جمال وجلال پورے طور پر ان کے پیش نظر ہے، اسی لیے تشبیب کے اس مضمون کو طول نہیں دیا بلکہ چند اشعار ہی میں اسے مکمل کر دیا اور ان میں بھی کسی خیالی محبوب کے حسن وجمال، خط وخال اور کاکل وعارض کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ جاہلی شعرا کا دستور تھا اور بعد کے شعرا میں بھی اس کا چلن رہا ہے، بلکہ مدینہ منورہ کے قریب کے چند مقامات (ذو سلم، کاظمہ اور اِضَم) کا تذکرہ کیا ہے جو قصیدہ کی اصلی غرض (نعت سرور کائنات ومدح فخر موجودات) کی طرف اشارہ کرتے ہیں، بلاغت کی اصطلاح میں اسے "براعت استہلال" کہتے ہیں۔

محاسن بلاغت: (۱) جیران سے بطور کنایہ محبوب مراد ہے (۲) اس میں صنعت تجرید بھی ہے جیسا کہ تشریح سے واضح ہے (۳) دَمْعٌ، جَرىٰ اور مُقْلَة کے ذکر میں صنعت مراعاۃ النظیر ہے (۴) اس میں صنعت براعت استہلال بھی ہے۔

نوٹ: اصطلاحات بلاغت کی تشریح وتفصیل کے لیے "قصیدۂ بردہ کی بلاغی پیمائش" کا مطالعہ کریں، جو اسی کتاب کے مقدمہ میں شامل ہے۔

(۳)

فَمَا لِعَيْنَيْکَ اِنْ قُلْتَ اکْفُفَا هَمَتَا

وَمَا لِقَلْبِکَ اِنْ قُلْتَ اسْتَفِقْ يَهِمِ

ترجمہ: آخر تیری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے، ان سے کہو رک جاؤ تو اور اشک بار ہو جاتی ہیں؟ اور تیرے دل کو کیا بیماری لگ گئی ہے اس سے کہو ہوش میں آجا تو اور مدہوش ہو جاتا ہے؟

لغت: فَمَا: فاء فصیحہ ہے جو شرط مقدر کا جواب ہے، اصل عبارت یوں ہوگی: ان لم تکن شدة مسکانک من العشق والمحبة فما لِعَیْنَیْکَ الخ۔ بعض شارحین نے کہا کہ فاء عاطفہ ہے لیکن پہلا احتمال ہی واضح اور راجح ہے اور "مَا" برائے استفہام بمعنی کیا۔ اُکْفُفَا: تثنیہ مذکر، امر حاضر معروف از کَفَّ (ن) بمعنی رکنا، باز رہنا۔ هَمَتَا: تثنیہ مؤنث غائب، فعل ماضی معروف از همی (ض) هَمْیًا: بہنا، جاری ہونا۔ اِسْتَفِقْ: امر حاضر از اِسْتِفَاق اِسْتِفَاقَةً بمعنی ہوش میں آنا۔ یَهِمْ: مضارع معروف از هَامَ یَهِیْمُ هَیْمًا و هَیَمَانًا بمعنی آوارہ پھرنا، مدہوش ہونا۔

تشریح: اس شعر کا گزشتہ شعر سے معنوی تعلق یہ ہے کہ عاشق نے جب شاعر کے سوال کا کچھ جواب نہ دیا تو اسے منکرِ عشق قرار دے کر اس کی حالتِ زار پر تعجب کا اظہار کر رہا ہے اور کہتا ہے اگر تیرے رونے کا سبب عشق و محبت نہیں تو تیری آنکھیں اور تیرا دل تیرے قابو میں کیوں نہیں ہیں، آنکھوں سے کہو کہ رونا دھونا بند کرو تو ان سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگتی ہے، اور دل سے کہو ہوش اور قابو میں آجا تو وہ اور مدہوش اور بے قابو ہو جاتا ہے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ دل کا سنبھلنا، ہوش میں آنا، اور قرار پانا عشق کی موت ہے، اس سے ہر عاشق پناہ مانگتا اور کوسوں دور بھاگتا ہے، اس کی قلبی خواہش ہوتی ہے کہ عشق کی سوزش سے اس کا قلب وجگر کباب ہوتا رہے، ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

فَيَا حُبَّهَا زِدْنِيْ جَوًى كُلَّ لَيْلَةٍ وَيَا سَلْوَةَ الْأَيَّامِ! مَوْعِدُكَ الْحَشْرُ

(اے عشقِ محبوب! تیری سوزش ہر رات تیز ہوتی رہے، اور اے زندگی کے سکون بخش لمحات! تم سے ملنا اب قیامت ہی کے دن ہو)۔

کیوں کہ ہر عاشق کو دل کے کباب میں جو مزہ ملتا ہے وہ کسی لذیذ سے لذیذ چیز میں بھی نہیں ملتا۔

جل جل کے سے اس کی پیدا، ہے سوزشِ عشق چشم والا
کباب آہو میں بھی نہ پایا مزہ جو دل کے کباب میں ہے (امام احمد رضا بریلوی)

امام بوصیری علیہ الرحمہ نے عاشق کی اسی کیفیت کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے کہ عشقِ محبوب میں نہ ان کی آنکھوں کو آنسو روکنے کا یارا ہے، نہ دل کو قرار ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) هَمَتَا اور يَهِم کے درمیان تجنیس شبہِ اشتقاق ہے (۲) ان میں سے ایک کے پہلے مصرع کے آخر میں آنے اور دوسرے کے شعر کے آخر میں آنے سے صنعتِ ''ردالعجز علی الصدر'' ہوئی (۳) ''هَمَتَا'' میں ضمیر تثنیہ (جس کا مرجع آنکھیں ہیں) کی اسنادِ فعل کی طرف مجازِ عقلی ہے، کیونکہ آنکھیں نہیں بہتیں بلکہ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں، جیسے مجازِ عقلی کے طور پر عربی میں کہتے ہیں: يَجْرِى النَّهْرُ (دریا بہتا ہے)، يَسِيْلُ الْمِيْزَابُ (پرنالہ بہ رہا ہے) سبھی جانتے ہیں کہ دریا نہیں بہتا بلکہ اس میں پانی بہتا ہے، یوں ہی پرنالہ نہیں جاری ہوتا بلکہ اس میں پانی جاری ہوتا ہے (۴) اس شعر میں دو طباقِ ایجاب ہیں، ایک ''أُكْفُفَا'' اور ''هَمَتَا'' کو یک جا کرنے میں اور دوسرا ''إِسْتَفِقْ'' اور ''يَهِم'' کو اکٹھا کرنے میں۔

(۴)

أَيَحْسَبُ الصَّبُّ أَنَّ الْحُبَّ مُنْكَتِمٌ
مَا بَيْنَ مُنْسَجِمٍ مِنْهُ وَ مُضْطَرِمِ

ترجمہ: کیا عاشق نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کے اشکِ رواں اور قلبِ تپاں سے آشکارا ہونے والی محبت پوشیدہ رہ جائے گی؟

لغات: أَيَحْسَبُ: ہمزہ، استفہام انکاری کے لیے ہے اور يَحْسَبُ (س، ح) گمان کرنا، سمجھنا۔ الصَّبُّ: عاشق، یہ صفت مشبہ ہے (ج) صُبُوْن. مُنْكَتِمٌ: پوشیدہ، اسم فاعل از اِنْكِتَام. مُنْسَجِمٌ: اسم فاعل از اِنْسِجَامٌ، بہنے والا۔ مُضْطَرِمٌ: اسم فاعل از اِضْطِرَامٌ، جلنے والا، بھڑکنے والا۔

تشریح: شاعر نے جب عاشق سے مُسکِت سوال کیا اور اپنے مدعا پر ایک دلیل بھی قائم کر دی تو پھر مزید دلائل وشواہد کے ذریعہ اپنے دعوے کو مضبوط کر رہا ہے اور عاشق سے عشق کا اقرار کرانا چاہتا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جس عشق کی علامتیں تیری چشمِ گریاں اور دلِ سوزاں سے

عیاں ہوں وہ لوگوں سے کیسے چھپا رہ سکتا ہے اور اس سے انکار کس طرح ہوسکتا ہے؟

اسی مضمون کو درج ذیل اشعار میں بھی نظم کیا گیا ہے:

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن
زردیِ رنگِ رخ وخشکیِ لب را چہ علاج
ضبطِ فریاد سے ہو جائیں نہ آنکھیں پُرنم
پردہ داری ہی کہیں پردہ درِ راز نہ ہو

مطلب یہ ہے کہ محبوب کی یاد میں عاشق کی آنکھیں اشک بار اور دل بے قرار ہے ایسی حالت میں اس کا یہ خیال فضول ہے کہ اس کے عشق کا راز فاش نہ ہوگا۔

محاسن بلاغت: (۱) الصَّبُّ اور اَلْحُبُّ کے درمیان تجنیس لاحق ہے (۲) صیغۂ خطاب کی بجائے صیغۂ غائب لانے میں صنعتِ "التفات من الخطاب الی الغیبۃ" ہوئی۔

(۵)
لَوْلَا الْهَوٰى لَمْ تُرِقْ دَمْعًا عَلٰى طَلَلٍ
وَلَا اَرِقْتَ لِذِكْرِ الْبَانِ وَالْعَلَمِ

ترجمہ: اگر محبت نہ ہوتی تو (دیارِ محبوب کے) کھنڈر پر آنسو نہ بہاتا اور درختِ بان اور پہاڑ کی یاد سے تیری نیند اچاٹ نہ ہو جاتی۔

لغات: اَلْهَوٰى: محبت، عشق (مصدر از باب سمع)۔ لَمْ تُرِقْ: واحد مذکر حاضر از أَرَاقَ يُرِيْقُ إِرَاقَةً: بہانا۔ طَلَلٌ: کھنڈر، مسمار شدہ عمارت، ویران مکان کے نشانات (ج) أَطْلَالٌ وطُلُوْل. أَرِقْتَ (س): واحد مذکر حاضر، ماضی معروف از أَرِقَ أَرَقًا بمعنی بے خواب ہونا، نیند اڑ جانا۔ اَلْبَان: بلادِ عرب میں پایا جانے والا ایک خوب صورت درخت جس سے حسن و دل کشی میں حسینوں کے قد و قامت کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ اَلْعَلَمُ: پہاڑ (ج) اَعْلَامٌ۔ اس سے مراد کوہِ حرا یا کوہِ ابو قُبَیس ہے۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص ۱۸)

تشریح: عاشق کے انکارِ محبت کے غلط ہونے پر شاعر یہاں ایک اور دلیل لاتا ہے اور کہتا

ہے کہ اگر تجھے عشق نہ ہوتا تو دیارِ محبوب کے کھنڈروں پر کھڑے ہو کر زار و قطار نہ روتا اور نہ تیری آنکھوں سے نیند اڑ جاتی۔

درختِ بان اور خاص پہاڑ کو یاد کر کے

محبوب کا مکان (جس کے کھنڈرات کا یہاں ذکر ہے) ایک پہاڑ میں واقع ہے جس کے دامن میں "بان" کے درخت بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں، ان کی یاد عاشق کو بے چین کر رہی اور رات بھر جگاتی اور بستر پر کروٹیں بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہ بھی عربی شاعری کا ایک روایتی انداز ہے کہ جب شاعر کا گزران مقامات سے ہوتا ہے جن سے محبوب کو کسی طرح کی کوئی نسبت رہی ہو، یا وہ مقامات اس کے ذہن و دماغ میں آتے ہیں تو اس کا زخم جگر تازہ ہونے لگتا ہے، کچھ یہی حالت اس وقت بھی ہوتی ہے جب محبوب کو یاد دلانے والی کوئی چیز سامنے آجائے، مثال کے طور پر چاند دیکھا تو محبوب کا رخِ زیبا یاد آگیا، خوش بو سونگھی تو اس کے دل کی دنیا مہک اٹھی کہ یہ خوش بو تو اس کے محبوب کی زلفِ معنبر کی خوش بو سے ملتی جلتی ہے، بلبل کی آواز سنی تو کانوں میں رس گھولنے والی محبوب کی شیریں کلامی یاد آگئی اور پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے زخم جگر رسنے لگتے ہیں اور آنسوؤں کے ساتھ مل کر آنکھوں سے باہر آتے ہیں۔

محاسن بلاغت: (۱) "لَمْ تُرِقْ" اور "أَرِقْتَ" کے درمیان تجنیس شبہِ اشتقاق ہے (۲) غائب کی بجائے حاضر کا صیغہ لانے میں صنعتِ التفات کی ایک قسم "التفات من الغیبۃ الی الخطاب" ہے۔

(۶)

فَكَيْفَ تُنْكِرُ حُبًّا بَعْدَ مَا شَهِدَتْ

بِهٖ عَلَيْكَ عُدُوْلُ الدَّمْعِ وَالسَّقَمِ

ترجمہ: تو محبت سے کیسے انکار کر سکتا ہے جب کہ تیرے خلاف آنسو اور بیماری جیسے دو عادل گواہ شہادت دے رہے ہیں۔

(۷)

وَاَثْبَتَ الْوَجْدُ خَطَّيْ عَبْرَةٍ وَّضَنًى

مِثْلَ الْبَهَارِ عَلٰى خَدَّيْكَ وَالْعَنَمِ

ترجمہ: اور محبت وشیفتگی نے تیرے دونوں رخساروں پر دو لکیریں بنادی ہیں، ایک تو آنسو کی لکیر جو عَنَم کے پھل کی طرح سرخ ہے اور دوسری لکیر لاغری سے جو "بہار" پھول کی طرح زرد ہے۔

لغات: فَكَيْفَ: فا فصیحہ ہے جو شرط محذوف کے جواب پر آتی ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: إذا قامت عليك الأدلة والبراهينُ فكيف تنكر الخ۔ اور كَيْفَ اسم استفہام ہے جو یہاں پر یا تو تعجب کے لیے ہے یا توبیخ کے لیے، یا استبعاد کے لیے۔ عُدُوْل: عَادِل کی جمع، معتمد اور معتبر آدمی۔ اَلسَّقَمُ: مرض، بیماری (ج) أَسْقَام. اَلْوَجْدُ: محبت وشیفتگی، غم عشق۔ اَلْخطُّ: لکیر (ج) خُطُوْط. عَبْرَةٌ: آنسو (ج) عَبَرَات وَعَبَر. اَلضَّنٰى: کمزوری، لاغری۔ اَلْبَهار: ایک قسم کا خوش بودار زرد رنگ کا پھول جس کو "عينُ البقر" (گاؤ چشم) بھی کہتے ہیں، یہ موسم بہار کے ابتدائی ایام میں کھلتا ہے۔ اَلْعَنَمُ: ایک درخت جس کا پھل سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور جس سے محبوب کی انگلی کے رنگے ہوئے پوروں کو تشبیہ دی جاتی ہے، اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سرخ رنگ کا ایک پھول ہوتا ہے۔ اَلْخَدُّ: رخسار (ج) خُدُوْد۔

تشریح: گزشتہ شعر کی طرح یہ دونوں شعر بھی عاشق کی جانب سے انکارِ محبت کے غلط ہونے پر دلیل ہیں، اس کو یوں سمجھئے کہ عاشق اپنے محبوب کی جدائی کے غم میں بالکل لاغر اور نحیف وناتواں ہوگیا ہے، اس کے چہرہ کا رنگ زرد ہو چکا ہے اور وہ غم عشق میں اس قدر رویا کہ اس کا قلب وجگر بھی پگھلنے لگا اور خون بن کر آنسوؤں کے ساتھ رخساروں پر بہنے لگا جس سے اس کے رخساروں پر دو لکیریں بن گئیں، ایک خون آمیز آنسوؤں کی لکیر جو "عَنَم" کے پھل کی طرح سرخ ہے اور دوسری لکیر رخساروں کی زمین کے رنگ سے پیدا ہوئی جو گل زرد کی طرح پیلی ہے اور یہ دونوں لکیریں اس کے سوزِ دروں اور قلبی اضطراب وبے چینی اور دل میں چھپے ہوئے عشق کو بتارہی ہیں، مگر عاشق اپنے عشق کو ہر طرح چھپاتا ہے اور جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ شاید تو کسی کے عشق میں مبتلا ہے جس نے تیری یہ حالت بنادی ہے تو وہ اقرار کی بجائے انکار ہی کرتا ہے، اس پر شاعر، عاشق کے انکارِ عشق کو غلط قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ

جب تیرے عشق پر آنسو اور بیماری جیسے دو معتبر اور معتمد گواہ گواہی دے رہے ہیں اور غم عشق نے تیرے رخساروں پر سرخ اور زرد لکیریں بنادی ہیں تو ان سب دلائل وشواہد کے ہوتے ہوئے تیرا عشق کیسے چھپ سکتا ہے اور تیرا انکارِ عشق کیسے درست ہوسکتا ہے؟ لہٰذا تجھے کھلے لفظوں میں اپنے عشق کا اقرار کرلینا چاہیے۔

محاسن بلاغت: (۱) شعر نمبر (٦) میں ''شَهِدَتْ'' استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے اور بعد میں ''عُـــدُوْل'' کا ذکر ترشیح ہے (۲) اور شعر نمبر ۷ میں آنسو اور لاغری کی لکیروں کی ''عَنَم'' اور ''بَہار'' پھول سے تشبیہ، تشبیہِ مرسل ومجمل ہے (۳) عَبْرَة اور ضَنًى کے بعد بے ترتیب ان کے متعلقات (بہار اور عنم) کے ذکر کرنے میں صنعتِ لف ونشر غیر مرتب ہے (۴) أَثْبَتَ کی وَجْـد کی طرف اسناد، مجاز عقلی ہے، کیوں کہ یہ حقیقت میں سبب کی جانب اسناد ہے، جیسے ''سَرَّتْنِي رُؤْيَتُكَ'' میں۔

نَعَمْ سَرىٰ طَيْفُ مَنْ أَهْوىٰ فَأَرَّقَنِي
وَالْحُبُّ يَعْتَرِضُ اللَّـــذَّاتِ بِالْأَلَمِ (۸)

ترجمہ: ہاں! رات کو محبوب مجھے خواب میں نظر آیا تو اس نے میری نیند ہی اڑادی اور محبت تو خوشیوں میں غم کا رخنہ ڈالا ہی کرتی ہے۔

لغات: سَرىٰ (ض): رات میں آیا۔ طَيْف: خواب، خیال۔ أَهْوىٰ: واحد متکلم، مضارع معروف از هَوِيَ يَهْوىٰ هَوًى (س) بمعنی محبت کرنا، چاہنا۔ أَرَّقَ: ماضی معروف از باب تفعیل، نیند اڑادی، بے خواب کردیا۔ الأَلَم: رنج وتکلیف، مراد غم واندوہ (ج) آلام۔

تشریح: جب شاعر نے گزشتہ اشعار میں واضح دلائل وبراہین قائم کرکے عاشق کے لیے عشق ومحبت سے انکار کے سبھی راستے بند کردیے تو اسے مجبوراً اپنے عشق اور بے قراری کا ان الفاظ میں اقرار کرنا پڑا کہ ''ہاں! رات کو محبوب مجھے خواب میں نظر آیا تو اس نے میری آنکھوں سے نیند ہی اڑادی، اور عشق ومحبت کا تو کام یہی ہے کہ وہ محبوب کی جدائی کے غم کے ذریعے عاشق کی

خوشیوں کے لمحات میں رخنہ اندازی کرتا ہے اور اس کی مسرتوں کو رنج والم سے بدل دیتا ہے۔
صوفیہ کرام کے مطابق آخری مصرع کا مطلب یہ ہے: کہ جب عشق حقیقی کسی انسان کے دل میں رچ بس جاتا ہے تو اس کو دنیا کی لذتوں اور آسائشوں سے دور کر دیتا ہے، پھر دنیا کی کسی لذیذ سے لذیذ چیز میں بھی اسے کوئی لطف ولذت نہیں ملتی، اسے جو بھی مزہ ملتا ہے وہ آخرت سے تعلق رکھنے والی چیزوں ہی میں ملتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی ازلی دشمن ہیں، یہ دونوں پورے طور پر کسی شخص میں یک جا نہیں ہو سکتیں اس کو درج ذیل واقعہ سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

خلیفہ ہارون رشید نے ایک بار اپنے دل میں سوچا کہ میں دنیا وآخرت میں سے کسی کو چھوڑے بغیر دونوں کو پورے طور پر اپنے پاس یک جا کر لوں، ولیِ وقت حضرت بہلول کو کشف کے ذریعہ اس کے دل کی بات معلوم ہوگئی، وہ ہارون رشید کے شاہی محل کے پاس تشریف لائے، وہاں برسوں سے ایک زبردست ستون پڑا ہوا تھا، جو اتنا بڑا اور اس قدر وزنی تھا کہ اگر سارے شہر کے باشندے مل کر اسے اٹھانا چاہتے تو اٹھانا تو دور کی بات ہے اسے ہلا بھی نہ پاتے، حضرت بہلول نے اس کا ایک سرا پکڑا اور اپنی روحانی طاقت کے ذریعہ اسے اٹھالیا، پھر اسے چھوڑ کر دوسری طرف آئے اور دوسرے سرے کو بھی اٹھالیا اور چھوڑ دیا، پھر اس کے بیچ میں آئے اور بیچ کے حصے کو پکڑ کر اٹھانا چاہا تو نہ اٹھا سکے، ہارون رشید یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اس نے آپ کو اپنے پاس بلا کر پوچھا: بہلول! تمہارے اس کام کا مقصد کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: میرا مقصد بادشاہ کو یہ دکھانا ہے کہ میں نے دنیا جمع کرنے کا ارادہ کیا تو دنیا جمع کر لی، مگر اس کے ساتھ آخرت میرا مقصد نہیں تھی، اور آخرت حاصل کرنی چاہی تو اسے بھی حاصل کر لیا لیکن اس کے لیے دنیا کو چھوڑنا پڑا، پھر میں نے ان کے بیچ کی صورت اپنانی چاہی کہ دنیا اور آخرت دونوں کو پورے طور پر حاصل کر لوں اور کسی کو چھوڑنا نہ پڑے، تو اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، تو میری سمجھ میں آگیا کہ دنیا اور آخرت میں سے کسی کو

چھوڑے بغیر دونوں کو پورے طور پر حاصل کرنے کی جو بات تجھے سوجھی ہے وہ ناممکن ہے
(عصیدۃ الشہدۃ، ص ۴۳، ۴۴)

(۹)
يَا لَائِمِي فِي الْهَوَى الْعُذْرِيِّ مَعْذِرَةً
مِنِّي إِلَيْكَ وَلَوْ أَنْصَفْتَ لَمْ تَلُمِ

ترجمہ: اے پاکیزہ اور سچی محبت میں مجھے ملامت کرنے والے! میری تجھ سے معذرت ہے اور اگر تو انصاف کرتا تو کبھی ملامت نہ کرتا۔

لغات: لَائِمٌ: اسم فاعل از لَامَ يَلُوْمُ لَوْمًا وَ مَلَامَةً بمعنی ملامت کرنے والا (ج) لُوَّام، وَ لُوَّمٌ، وَلُيَّمٌ. مَعْذِرَة: اس لفظ میں چار احتمال ہیں (۱) یہ "أَعْتَذِرُ"، فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے (۲) یہ "أُقَدِّمُ"، فعل محذوف کا مفعول بہ ہے، اصل عبارت ہے: أُقَدِّمُ إِلَيْكَ مَعْذِرَةً مِنِّي، ان دونوں صورتوں میں اسے منصوب پڑھا جائے گا (۳) یہ مبتدا ہے اور "مِنِّي إِلَيْكَ" بمنزلہ خبر ہے، اس صورت میں اصل عبارت یوں ہوگی: مَعْذِرَةٌ صَادِرَةٌ مِنِّي إِلَيْكَ (۴) یہ مبتدائے محذوف "هٰذِهٖ" کی خبر ہے، ان دونوں صورتوں میں اسے مرفوع پڑھا جائے گا۔

تشریح: اس شعر کا گزشتہ شعر سے تعلق یہ ہے کہ جب دلائل وشواہد سے مجبور ہو کر عاشق نے عشق ومحبت کا اقرار کرلیا تو محبت کے سلسلے میں سائل اسے ملامت کرنے لگا، اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے: اے پاکیزہ اور سچی محبت میں مجھے ملامت کرنے والے! میری تجھ سے معذرت ہے اور اگر تو مُنصِف مزاج ہوتا تو کبھی مجھے ملامت نہ کرتا۔

اس شعر میں "الحُبّ العُذرِي" آیا جس کا اردو ترجمہ میں نے "پاکیزہ اور سچی محبت" سے کیا ہے، اس تعبیر کا ایک خاص تاریخی وادبی پس منظر ہے، بنی عُذرہ، یمن کے ایک قبیلہ کا نام ہے، اس کی دوشیزائیں نہایت خوب صورت، عفت مآب اور شرم وحیا کا پیکر ہوتی تھیں، جب کہ اس قبیلے کے جوان اپنی محبوبہ کے حد درجہ عاشق وشیدا، نہایت شرمیلے، صابر وشاکر اور نرم دل ہوتے تھے، اس قبیلہ میں بہت سے شعرا پیدا ہوئے جن کا وصف

مشترک یہ تھا کہ ان کی شاعری میں سوز و گداز بہت ہوتا تھا، وہ محبوب کے جسمانی قرب و وصال کے متمنی نہیں ہوتے تھے اور ان کا عشق سچا اور بے لوث ہوتا تھا، یہاں تک کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ "بنو عذرہ" کے قبیلے میں جو جوان بھی عاشق ہوا وہ اپنے محبوب پر پروانہ وار فدا ہو گیا اور ہوس ناکی اور شہوت پرستی کے کبھی قریب نہ گیا، اسی قبیلہ کی نسبت سے ایسی محبت کو "حبِ عذری" کہا جانے لگا، میرے خیال میں "پاکیزہ اور بے لوث محبت" کے الفاظ سے اردو میں اس کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے ملامت کرنے والے! میری مجبوری کا عذر تیرے سامنے ہے کہ محبوب کی پاکیزہ محبت میرے دل کے نہاں خانہ میں بالکل رچ بس چکی ہے اور میں اس سلسلے میں بے اختیار اور مجبور ہو چکا ہوں اور اس سلسلے میں میرا حال وہی ہو چکا ہے جو بنی عذرہ کے عاشقوں کا ہوتا ہے، اس لیے تجھے میری معذرت قبول کر لینی چاہیے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر تیرے اندر کچھ بھی انصاف ہوتا تو میرے عشق کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد تو کبھی مجھے ملامت ہی نہ کرتا، کیوں کہ ملامت تو اس چیز پر کی جاتی ہے جو انسان کے اختیار میں ہو، اور جو چیز انسان کے اختیار ہی میں نہ ہو اس پر ملامت کرنا انصاف کی بات نہیں، ایک عربی شاعر کہتا ہے:

و عیب الفتی فی ما أتی باختیارہ   ولا عیب فی ما کان خلقا مرکبا

(انسان اپنے اختیار سے جو کام کرے اس میں عیب چینی ہو سکتی ہے اور جو چیز فطرتِ ثانیہ بن گئی ہو اس میں عیب نہیں لگایا جا سکتا)۔

یا یوں کہہ لیجئے کہ اگر تو منصف مزاج ہوتا تو مجھے کبھی بھی ملامت نہ کرتا، کیوں کہ محبت پر ملامت کرنے کا حق اسے پہنچتا ہے جس نے کبھی اس کا مزہ چکھا ہو اور اس پر پیچ وادی سے گزرنے کا اسے سابقہ اور تجربہ ہو، اور جسے کبھی اس سے سابقہ ہی نہ پڑا ہو اسے اس پر ملامت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

نا تجربہ کاری سے زاہد کی یہ باتیں ہیں — اس رنگ کو کیا جانے، پوچھو تو کبھی لی ہے

پھر حضرتِ جنوں ہوئے رونق فزائے دل — ہاتھوں سے پھر گیا مرا بیٹھے بٹھائے دل

جب تک نہ مبتلا ہو کوئی جانتا نہیں — کہتے ہیں جس کو عشق وہی ہے بلائے دل

اور اسی بناپر بعض صوفیۂ کرام نے فرمایا: لا ینبغي للشخص أن یتکلم علی حال إلاّ إذا ذاقها (کسی کو یہ حق نہیں کہ صوفیہ کے کسی حال پر کلام کرے جب تک اس کا مزہ نہ چکھ لے)۔

اسی مفہوم کی طرف مشہور صوفی شاعر حضرت ابن فارض علیہ الرحمہ نے اپنے اس شعر میں اشارہ فرمایا ہے:

دَعْ عَنکَ تَعْنِیْفِيْ وَ ذُقْ طَعْمَ الْھَوٰی — وَإِذَا عَشِقْتَ فَبَعْدَ ذٰلِکَ عَنِّفِ

(مجھے سختی کے ساتھ جھڑکنا اور عتاب کرنا بند کر اور عشق و محبت کا مزہ چکھ اور جب تجھے عشق ہو جائے تو اس کے بعد مجھے جھڑکنا اور عتاب کرنا)۔ (شرح الباجوری، ص ۸،۹)

محاسن بلاغت: (۱) لَائِمِ اور لَمْ تَلُمْ کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۲) اور اس میں صنعتِ ردالعجز علی الصدر ہے، کیوں کہ مُتجانسین میں سے ایک پہلے مصرع کے شروع میں ہے اور دوسرا شعر کے آخر میں ہے (۳) مَعْذِرَۃ اور الْعُذْرِي میں تجنیس شبہ اشتقاق ہے (۴) اور مَعْذِرَۃ میں ایجاز حذف ہے، جیسا اس کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے۔

(۱۰)

عَدَتْکَ حَالِيَ لَا سِرِّيْ بِمُسْتَتِرٍ
عَنِ الْوُشَاۃِ وَلَا دَائِيْ بِمُنْحَسِمِ

ترجمہ: میرا حال تجھ تک پہنچ چکا ہے یا میرا حال تجھ تک پہنچ جائے، میرا راز چغل خوروں سے پوشیدہ نہیں ہے، اور نہ میرا روگ ختم ہونے والا ہے۔

لغات: عَدَتْ (ن) ماضی معروف از عَدَا یَعْدُوْ عُدْوَانًا بمعنی تجاوز کرنا، دوسروں تک پہنچنا۔ سِرّ: راز، بھید (ج) أَسْرَار. اَلْوُشَاۃ: چغل خور، لگائی بجھائی کرنے والے، وَاشٍ کی جمع (اسم فاعل از وَشَی یَشِي وِشَایَۃ)۔ داءٌ: مرض، بیماری (ج) أَدْوَاء. مُنْحَسِمْ:

ختم ہونے والا، اسم فاعل از اِنحِسَام۔ ''عَذَتکَ حَالِيْ'' کے بارے میں شارحین کی مختلف رائیں ہیں، کسی نے کہا: یہ دعائیہ جملہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ خدا تجھے اس روگ میں گرفتار نہ کرے۔ کسی نے لکھا: یہ بددعا ہے اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے میرا روگ تجھے بھی لگ جائے، تو معلوم ہو کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے اور بعض اہل علم اسے جملہ خبریہ قرار دیتے ہیں۔

تشریح: اس شعر کا گزشتہ شعر سے معنوی تعلق یہ ہے کہ گزشتہ شعر میں عاشق نے سائل سے عشق کے بارے میں معذرت کی اور اسے ملامت کرنے سے باز رہنے پر زجر وتوبیخ کی، مگر جب اس نے نہ عاشق کی معذرت قبول کی اور نہ ملامت سے باز آیا تو اس نے کہا: عَدَتکَ حَالِيْ خدا کرے میرے جیسا حال تیرا بھی ہو جائے، تو تجھے بھی ملامت کا مزہ آئے، یہ سننے کے بعد سائل نے اس سے پوچھا: مَاحَالُکَ الَّذِيْ استعظمتَها؟ (وہ تیرا حال کیا ہے جس کو تو اس قدر بڑا سمجھ رہا ہے؟) تو اس نے جواب میں کہا: لَا سِرِّيْ بِمُسْتَتِرٍ عَنِ الْوُشَاةِ (میرا حال چغل خوروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہے) بلکہ وہ جگ ظاہر ہو چکا ہے۔ اور اے ملامت گر! سن لے میرے عشق کا روگ کسی طرح ختم ہونے والا نہیں ہے، لہٰذا تیری ملامت بے سود ہے، گویا عاشق اسے کہہ رہا ہے:

میں مصطفٰے کے جام محبت کا مست ہوں	یہ وہ نشہ نہیں جسے تُرشی اتار دے
از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب	دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

مَحَضْتَنِي النُّصحَ لٰكِنْ لَّسْتُ أَسْمَعُهُ
(۱۱)
إِنَّ الْمُحِبَّ عَنِ الْعُذَّالِ فِيْ صَمَمِ

ترجمہ: تو نے مجھے بے لوث نصیحت کی، لیکن میں اسے نہیں سن سکتا، عاشق تو ملامت گر ناصحوں کی نصیحت سے بہرا ہوتا ہے۔

اِنِّی اتَّهَمْتُ نَصِيحَ الشَّيْبِ فِیْ عَذَلِیْ
(۱۲)
وَالشَّيْبُ اَبْعَدُ فِیْ نُصحٍ مِّنَ التُّهَمِ

ترجمہ: میں نے تو بڑھاپا جیسے ناصح کو بھی ملامت کے باب میں ملزم گردانا جب کہ بڑھاپا نصیحت کے معاملے میں ہر الزام سے دور ہے۔

لغات: مَحَضْتَ: واحد مذکر حاضر، ماضی معروف از مَحَضَ فلانًا الوُدَّ او النُصحَ مَحْضًا (ف): خالص دوستی یا خیر خواہی کرنا۔ العُذَّال: عَاذِل کی جمع، ملامت کرنے والے۔ صَمَمْ: مصدر از باب سمع، بہرا ہونا، بہرہ پن۔ اِتَّهَمْتُ: میں نے تہمت لگائی، ملزم گردانا۔ نَصِيْح: (صفت مشبہ) ناصح، خیر خواہ (ج) نُصَحَاء ۔ الشَّيْب: بڑھاپا، بالوں کی سفیدی (مصدر از باب ضرب) "نَصِيْحَ الشَّيْب" کی اضافت کے بارے میں تین احتمال ہیں: (۱) یہ اضافت بیانیہ ہے، یعنی وہ ناصح جو کہ خود بڑھاپا ہے (۲) یہ صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے، یعنی شَيْبِ نَاصِحٌ (نصیحت کرنے والا بڑھاپا) (۳) یہ مشبہ بہ کی اضافت مشبہ کی طرف ہے، یعنی بڑھاپا جو کہ ناصح کی طرح ہے۔ التُّهَم: تُهْمَة کی جمع، تہمت، الزام، شک، ایک نسخہ میں "عَنِ التُّهَم" کی بجائے "مِنَ التُّهَم" ہے۔

تشریح: اس شعر میں "لَسْتُ أَسْمَعُهُ" ہے (میں اسے نہیں سنتا) اس سے مطلقاً سننے سے انکار کرنا مراد نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ میں قبولیت کے کانوں سے نہیں سنتا، اس طرح نہیں سنتا کہ اسے سن کر قبول کرلوں اور عشق سے باز آجاؤں۔

دونوں شعروں کا مفہوم یہ ہے کہ اے ناصح! میں جانتا ہوں کہ تیری نصیحت مخلصانہ اور بے لوث ہے، مگر اس کو قبول کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے قاصر ہوں، کیوں کہ عاشق تو اپنے معشوق کے بس میں ہوتا ہے، اپنے بس میں نہیں ہوتا، اسی لیے وہ ناصحوں اور ملامت گروں کی بات پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ حدیث پاک میں سچ فرمایا گیا ہے: حُبُّکَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَ يُصِمُّ یعنی محبت انسان کو گونگا اور بہرا بنا دیتی ہے (رواہ البخاری فی صحیحہ) اور اے ناصح! غور کر، جب میں نے بڑھاپے کی نصیحت ماننے سے انکار کر دیا حالانکہ اس کی نصیحت میں کسی طرح کی تہمت اور بدگمانی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تو تیری نصیحت کی کیا

حقیقت ہے، جا اپنی راہ لے اور میرے پیچھے دماغ سوزی نہ کر۔

اس شعر میں بڑھاپے کو ناصح کہا گیا ہے، کیوں کہ جب بڑھاپا آتا ہے تو گویا وہ زبانِ حال سے پکار کر کہتا ہے: اے انسان! ذرا دیکھ تو سہی، موت سر پہ ہے، اب گناہ کرنے کا نہیں، بلکہ ان سے توبہ کرنے کا وقت ہے، توبہ کر کے گناہوں سے باز آجا اور نیک کاموں میں مصروف ہو جا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

موے سفید از کفن آرد پیام پشتِ خم از مرگ رساند سلام

(سفید بال کفن کا پیغام لاتے ہیں اور کبڑی پیٹھ موت کا سلام پہنچاتی ہے)۔

روایت ہے کہ حضرت عمر ﷛ جب خلیفہ ہوئے تو ایک اعرابی کو حکم دیا کہ وہ روزانہ صبح کو ان کے مکان کے باہر سے یہ آواز لگایا کرے: يَا عُمَرُ! لَا تَنْسَ مَوْتَكَ ، وَاعْمَلْ فِي الدُّنْيَا بِقَدْرِ مَقَامِكَ فِيهَا. (اے عمر! اپنی موت کو نہ بھولو، اور دنیا میں جس قدر تمہارا قیام ہے اتنا نیک کام کرو)۔

لیکن جب آپ نے اپنی داڑھی میں کچھ سفیدی دیکھی تو اس اعرابی سے فرمایا:

أُتْرُكِ النِّدَاءَ ، لأَنَّ مُخْبِرِيْ وَمُذَكِّرِيْ حَصَلَ فِيْ نَصَبِ عَيْنِيْ، فَلَمْ يَبْقَ لِنِدَائِكَ حَاجَةٌ.

(اب تم یہ آواز لگانا بند کر دو، کیوں کہ مجھے خبر دار کرنے والا اور نصیحت کرنے والا میری نگاہوں کے سامنے موجود ہے، اب تمہاری یاددہانی کی کوئی ضرورت نہیں)۔ (عصیدۃ الشہدۃ ص ۳۱)

محاسن بلاغت: (۱) ''نَصِيحَ الشَّيْب'' میں تشبیہِ بلیغ ہے (۲) ''إِتَّهَمْتُ'' اور ''التُّهَمْ'' کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے، یوں ہی نصیح اور نُصح کے درمیان بھی تجنیس اشتقاق ہے (۳) اور ''إِتَّهَمْتُ'' کو مصرع اول کے شروع میں اور ''التُّهَمْ'' کو مصرع ثانی کے آخر میں لانے سے صنعتِ رد العجز علی الصدر ہوئی جس کو ''تصدیر'' بھی کہتے ہیں (۴) لفظِ ''الشَّيْب'' کو دو بار لانے میں صنعتِ تکریر ہے۔

الفصل الثاني

في منع هوى النفس

(۱۳)
فَـإِنَّ أَمَّارَتِي بِالسُّوْءِ مَا اتَّعَظَتْ
مِنْ جَهْلِهَا بِنَذِيْرِ الشَّيْبِ وَالْهَرَم

ترجمہ: کیوں کہ میرا نفس امارہ اپنی نادانی کے سبب، بالوں کی سفیدی اور عمر کی درازی جیسے ڈرانے والوں سے بھی نصیحت پذیر نہ ہوا۔

لغات: **أَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ**: برائی کا حکم دینے والا، اس سے مراد نفس امارہ ہے۔ **مَا اتَّعَظَتْ**: ماضی معروف، واحد مؤنث غائب از باب افتعال، مصدر اِتِّعَاظ، نصیحت پذیر نہ ہوا۔ **مِنْ جَهْلِهَا**: مِنْ میں دو احتمال ہیں: (۱) یہ ''اِتَّعَظَتْ'' کا صلہ ہے اور اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنی جہالت اور نادانی سے باز نہ آیا (۲) یہ علت بیان کرنے کے لیے ہو، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا: وہ اپنی نادانی کی وجہ سے نصیحت پذیر نہ ہوا۔ **نَذِيْر**: یا تو مصدر ہے بمعنی إِنْذَار (ڈرانا) جیسے نَكِيْر بمعنی انکار، یا مُنْذِرٌ (ڈرانے والا) کے معنی میں ہے، جیسے بَدِيْع بمعنی مُبْدِع، ترجمہ اسی معنی کے لحاظ سے ہے اور اس تقدیر پر ''نذیر الشیب والهرم'' میں اضافت یا تو بیانیہ ہے یا ازقبیل اضافة المشبه به الى المشبه، جیسے لُجَيْنُ الماءِ میں۔

از قبیل اضافة الصفة الى الموصوف، یعنی الشیب والھرم المنذر. الھرم: پیری، کہن سالی، انتہائی بڑھاپا (مصدر از سمع)۔

تشریح: اہل تصوف کے نزدیک نفس کے سات مراتب ہیں: (۱) نفسِ اَمّارہ : یہ وہ ہے جس کا میلان طبیعتِ بدنیہ کی جانب ہوتا ہے اور یہ لذات وشہواتِ حسّیہ کا حکم دیتا ہے، دل کو جہتِ سفلی کی طرف کھینچتا ہے، یہ شر وفساد کا سرچشمہ اور بری عادات وخصائل کا منبع ہے، کیوں کہ اسی سے غرور وتکبر، حرص وشہوت، حسد وغضب اور کینہ وبخل کے سوتے پھوٹتے ہیں، (۲) نفسِ لَوّامہ: یہ نورِ قلب سے روشن ہوتا ہے، کبھی عاقلہ کا مطیع ہوتا ہے کبھی مخالف، جب مخالفت کر لیتا ہے تو شرم سار ہوتا اور اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، یہ ندامت وشرمساری کا سرچشمہ اور حرص وہوس اور لغزش کا نقطہ آغاز ہے، (۳) نفسِ مُطْمَئِنَّة: یہ نورِ قلب سے ایسا منور ہوتا ہے کہ صفاتِ ذمیمہ سے پاک اور اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ ہوتا ہے، (۴) نفسِ مُلْہِمَة : یہ وہ ہے جس پر من جانب اللہ علم کا الہام ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے تواضع وقناعت اور سخاوت کی استعداد اور صلاحیت بخشتا ہے، (۵) نفس راضیة : یہ وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور رضائے الٰہی کا اثر اس پر ذکر واخلاص اور کرامت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، (۶) نفس مرضیة : یہ وہ ہے جو اللہ عزوجل سے ہر حال میں راضی رہ کر ''وَرَضُوا عَنْہُ'' کی صفت سے متصف ہوتا ہے، وہ کرامات سے بہرہ ور ہوتا ہے اور ذات کی حقیقت کا عرفان اسی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، (۷) نفس صالحة: یہ وہ ہے جو اسرارِ ربانیہ کی آماجگاہ اور ان کا امین ہوتا ہے۔

پہلا نفس کافرین وشیاطین وفاسقین کا ہے، دوسرا نفس مومنینِ غیر فاسقین کا ہے، تیسرا نفس متعلمین عاملین کا ہے، چوتھا نفس معلمینِ عاملین کا ہے، پانچواں نفس اولیائے مومنین کا ہے، چھٹا نفس عارفین کا ہے اور ساتواں نفس انبیا ومرسلین کا ہے۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر میں جس نفس کا ذکر کیا ہے وہ پانچواں یعنی

نفس راضیہ ہے، کیوں کہ آپ صاحبِ کرامت ولی کامل ہیں اور آپ کا
"اَمَّارَتِيْ بِالسُّوْءِ" فرمانا تواضع اور انکسار کی بنا پر ہے، جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام
نے کسرِ نفسی کی بنا پر فرمایا:

"وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْءِ" (سورہ یوسف آیت ۱ پ ۱۳)
(اور میں اپنے نفس کو مبرا نہیں کرتا، بلاشبہ نفس برائی کا حکم کرنے والا ہے۔)

تو اب شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ میرا نفس جو مجھے برایاں کرنے پر مجبور اور آمادہ کرتا ہے
وہ اپنی فطری جہالت کے باعث ایسا کرتا ہے، ورنہ میری پیرانہ سالی اسے برابر نصیحت کرتی
ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ موت سر پر ہے، سفرِ آخرت بالکل قریب
ہے، اب گناہوں سے توبہ کا وقت ہے:

موے سفید از کفن آرد پیام پشتِ خم از مرگ رساند سلام

محاسن بلاغت: (۱) "اَمَّارَتِيْ بِالسُّوْءِ" میں صنعتِ تلمیح ہے۔

(۱۴)
وَلَا اَعَدَّتُ مِنَ الْفِعْلِ الْجَمِيْلِ قِرىٰ
ضَيْفٍ اَلَمَّ بِرَاْسِيْ غَيْرَ مُحْتَشِمِ

ترجمہ: اور نہ میرے نفس نے اعمال صالحہ کی صورت میں اس مہمان کی ضیافت کا کوئی
سامان کیا جو میرے سر پر اتر آیا اور بے شرمی کے ساتھ رکا ہوا ہے۔

لغات: اَعَدَّتُ: ماضی معروف از اِعْدَاد: تیاری کرنا۔ قِرىٰ: ضیافت کا سامان، مہمانی
کا کھانا، (مصدر از باب ضرب)۔ ضَيْف: مہمان (یہ لفظ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب
کے لیے استعمال ہوتا ہے، کیوں کہ یہ اصل میں مصدر ہے)، (ج) اَضْيَاف و ضُيُوْف
و ضِيَاف و ضِيْفَان۔ اَلَمَّ: ماضی معروف از اِلْمَام: اترنا۔ مُحْتَشِم: اسم فاعل از احتشام:
شرم کرنا، یا اسم مفعول از احتشام بمعنی تعظیم و توقیر۔

تشریح: اس شعر کا عطف پہلے شعر پر ہے اور یہ لفظی و معنوی حیثیت سے گزشتہ شعر سے

مربوط ہے، مطلب یہ ہے کہ بالوں کی سفیدی جو بڑھاپے کی علامت ہے اور بڑھاپا موت کا پیامی ہے وہ طبیعت کو خواہ کتنا ہی ناپسند ہو مگر وہ اب ایک مہمان کی حیثیت سے سر پر آچکا ہے، اس مہمان کی خاطر و تواضع گناہوں سے توبہ اور اعمال صالحہ سے کرنا چاہیے تھی، مگر مجھ سے اس کی مہمان نوازی کا یہ سامان نہ ہو سکا، جو قابل افسوس و ملامت ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) ضیف میں استعارۂ تصریحیہ ہے اور قریٰ کا ذکر ترشیح ہے (۲) اعدت، قری، ضیف اور الم کا ذکر مراعاۃ النظیر کے طور پر ہے۔

(۱۵)

لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ اَنِّيْ مَا اُوَقِّرُهٗ
كَتَمْتُ سِرًّا بَدَالِيْ مِنْهُ بِالْكَتَمِ

ترجمہ: سفیدی کا راز جو ابتداءً چند بالوں میں نمودار ہوا اسے میں خضاب سے چھپا دیتا اگر معلوم ہوتا کہ میں اس کی عزت نہ کر سکوں گا۔

لغات: بَدَا: ظاہر ہوا، نمودار ہوا، (ماضی معروف از باب نصر)۔ سرّ: راز، بھید (ج) اسرار۔ الکَتَم: وسمہ جس سے خضاب بناتے ہیں اور اس کی جڑ کو جوش دے کر روشنائی تیار کرتے ہیں۔

تشریح: بڑھاپا جو بہ منزلہ ایک مہمان کے ہے اس کی عزت و توقیر اس میں ہے کہ انسان گناہوں سے تائب ہو کر نیک کاموں میں لگ جائے، اگر بڑھاپا آنے پر اس نے یہ نہ کیا تو گویا اس نے اس مہمان کی بے توقیری کی، شعر کا حاصل یہ ہے کہ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ میں بڑھاپے کی عزت و توقیر نہ کر سکوں گا تو میں بالوں میں سفیدی کے نمودار ہوتے ہی اسے خضاب سے چھپا دیتا اور مزید عتاب اور لعنت و ملامت کا نشانہ نہ بنتا اور لوگ مجھے بایں ریش و فَش طعن نہ کرتے، مگر ہائے افسوس مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔

محاسن بلاغت: (۱) "کتمتُ" اور "کتم" کے درمیان جناس شبہ اشتقاق ہے، (۲) اور اس شعر میں ردالعجز علی الصدر ہے، (۳) "کتمتُ" اور "بدا" کے درمیان طباق ایجاب ہے۔

مَنْ لِي بِرَدِّ جِمَاحٍ مِنْ غَوَايَتِهَا
كَمَا يُرَدُّ جِمَاحُ الْخَيْلِ بِاللُّجُمِ (۱۶)

ترجمہ: کون ہے جو میرے نفس سرکش کو شرارت اور سرکشی سے باز رکھے، جیسے لگام کے ذریعہ گھوڑوں کو سرکشی سے باز رکھا جاتا ہے۔

لغات: مَنْ: برائے استفہام ہے۔ الجماح: پہلا "جماح" جَمُوح کی جمع ہے، جس کا معنی ہے سرکش گھوڑا جو سوار کے قابو میں نہ آئے اور دوسرا مصدر ہے بمعنی سرکشی، سوار کے قابو میں نہ آنا۔ اَلْخَيْلُ: گھوڑوں کا ریوڑ (ن) خُيُوْلٌ و اَخْيالٌ۔ اَللُّجُمُ: لِجامٌ کی جمع ہے جو لگام کا معرب ہے۔

تشریح: جب نفس، پیرانہ سالی جیسے مخلص اور بے لوث ناصح سے بھی راہ راست پر نہ آیا اور اس کی نصیحت بھی اس کی اصلاح کے لیے کارگر نہ ہوئی تو حضرت بوصیری بہ طور استعطاف سوال کرتے ہیں کہ کون ہے جو میرے نفس سرکش کو مواعظ حسنہ اور اسرار ربانیہ کے ذریعہ راہ راست پر لائے؟ اس شعر میں اس بات کی تعلیم ہے کہ سالک کے لیے سلوک کی تکمیل کا آسان راستہ یہ ہے کہ وہ کسی عارف باللہ شیخ کے دامن سے وابستہ ہو جائے، کیوں کہ نفس کبھی کبھی کسی مُہلک اور تباہ کن چیز کو بھی اچھا سمجھ بیٹھتا ہے، ایسے نازک موقع پر شیخ کامل کام آتا ہے اور وہ سالک کو تباہی و بربادی کے غارِ عمیق میں گرنے سے بچالیتا ہے، حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے قول: "مَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ شَيْخٌ فَشَيْخُهُ شَيْطَانٌ" میں اسی کی تعلیم ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) "جِمَاح" میں استعارۂ مُصرحہ اصلیہ ہے، (۲) اور اس شعر میں تشبیہ مرسل بھی ہے، (۳) اور "مَنْ" اور "مِن" کے درمیان تجنیس مُحرف ہے، (۴) الخیل اور اللجم کو یک جا کرنا صنعت مراعاۃ النظیر ہے۔

فَلَا تَرُمْ بِالْمَعَاصِي كَسْرَ شَهْوَتِهَا
إِنَّ الطَّعَامَ يُقَوِّي شَهْوَةَ النَّهِمِ (۱۷)

ترجمہ: تو معاصی کی خوارک دے کر نفس کی خواہشات کو دبانے کا ارادہ چھوڑ دے، کیوں کہ خوارک تو کھانے کے حریص کی خواہش کو اور طاقت ور بنا دیتی ہے۔

لغات: لَاتَرُمْ: نہی حاضر معروف از رَامَ، (ن) بمعنی قصد کرنا۔ المعاصي: معصیۃ کی جمع ہے۔ النَّہِمُ: حریص، پیٹو۔

تشریح: بعض فلاسفہ یونان کا خیال یہ ہے کہ نفس کی بھوک پوری کر دو تو وہ خود سیر ہو کر اس سے متنفر ہو جائے گا جس سے اس کو روکا جا رہا ہے، اس شعر میں حضرت بوصیری نے اس خیال کی تردید فرمائی ہے، فرماتے ہیں: اے مخاطب! جب تجھے معلوم ہے کہ نفس شرارتوں اور برائیوں کا حریص ہے تو اسے شرارتوں اور گناہوں کی کھلی چھوٹ دے کر اس کی خواہش دبانے کا خیال فضول ہے، اس طرح سے اس کی خواہشات دبتی نہیں ہیں بلکہ اور بڑھ جاتی ہیں، اس کو یوں سمجھے کہ کھانے کے حریص کو جتنی زیادہ غذا دی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ اس کی اشتہا بڑھتی جاتی ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں التفات من التکلم الی الخطاب ہے (۲) اور اس میں تشبیہِ ضمنی بھی ہے۔

(۱۸)

وَالنَّفْسُ كَالطِّفْلِ اِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلىٰ
حُبِّ الرِّضَاعِ وَاِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

ترجمہ: نفس تو بچے کی طرح ہے، جس کا دودھ چھڑا دیں تو چھوڑ دے گا، ورنہ جوان ہو کر بھی ماں کا دودھ پینے کا رسیا رہے گا۔

لغات: الطفل: شیر خوار بچہ (ج) اطفال، اصل میں یہ لفظ اسم جنس ہے، جو واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تُهْمِلْ: مضارع معروف از اِهْمَال: کسی چیز کو اپنے حال پر چھوڑ دینا، شَبَّ شَبَاباً وَ شَبِيْبَةً (ض): جوان ہوا۔ الرِّضَاعُ: دودھ پینا۔ تَفْطِمْ: مضارع معروف از فَطَمَ فَطْماً وَفِطَاماً (ض) دودھ چھڑانا۔ اِنْفَطَمَ: دودھ چھٹنا۔

تشریح: اس شعر کا معنوی تعلق پہلے والے شعر سے ہے، اس طرح یہ بھی بعض یونانی فلاسفہ کے مذکورہ بالا خیالِ فاسد کی تردید کا حصہ ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ نفس امارہ کو اگر ابتداءً میں لگام دے دی جائے تو وہ قبولِ ہدایت کر لیتا ہے اور درست ہو جاتا ہے، جیسے شیر خوار بچے کا دودھ اگر دو سال کی عمر کے اندر چھڑایا جائے تو وہ آسانی سے چھوڑ دیتا ہے اور تیسرے سال یا اس سے زائد اسے دودھ پلایا جاتا رہا تو بچہ کے دل میں اس کا شوق اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ چھوڑنا نہیں چاہتا، بلکہ سر مار مار کر ماں کو ہلکان کر دیتا ہے، یہی حال نفسِ امارہ کا ہے کہ اگر ابتداءً اس پر قدغن نہ لگایا جائے تو وہ معصیت کا حریص ہو کر جوان ہوتا ہے اور انسان کو تباہی و بربادی کی بھٹی میں جھونک کر ہی دم لیتا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) نفس کی طفل سے تشبیہ، تشبیہِ مجمل ہے (۲) طفل اور شباب کا اجتماع طباق ایجاب ہے، (۳) یوں ہی رضاع اور فطام کا اجتماع بھی طباق ایجاب ہے، (۴) تفطِم اور ینفطم کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے، (۵) طفل، رضاع اور فطام کا ذکر مراعاۃ النظیر کے طور پر ہے۔

(۱۹)

فَاصْرِفْ هَوَاهَا وَحَاذِرْ اَنْ تُوَلِّيَهُ
اِنَّ الْهَوٰى مَا تَوَلّٰى يُصْمِ اَوْ يَصِمِ

ترجمہ: تو خواہش نفس پر قدغن لگا اور چوکنا رہ کہ وہ کہیں تجھ پر غالب نہ آجائے، کیوں کہ جب بھی وہ غالب آتی ہے تباہ و برباد کر دیتی ہے یا رسوا کر کے چھوڑتی ہے۔

لغات: الھوٰی: (مصدر) خواہش نفس (ج) أھواء۔ حاذِرْ: امر حاضر از محاذرۃ بمعنی ڈرنا، پرہیز کرنا، چوکنا رہنا۔ تُوَلِّيْ: مضارع معروف از تَوْلِيَةٌ بمعنی اختیار دینا۔ تَوَلّٰى: ماضی معروف از باب تفعل، خود مختار ہونا، غالب آنا۔ يُصْمِ: مضارع معروف از اَصْمٰى يُصْمِيْ اِصْمَاءً: مار ڈالنا، ہلاک کر دینا۔ يَصِمِ: مضارع معروف از وَصَمَ يَصِمُ وَصْماً (ض) عیب لگانا۔ اور مَا تَوَلّٰى میں "ما" شرطیہ ہے۔

تشریح: یعنی اے انسان! جب تجھے معلوم ہو چکا کہ نفس قابل تربیت واصلاح ہے اور سدھارنے سے سدھر سکتا ہے اور برائیوں سے رک سکتا ہے تو اس کو ہوا وہوس سے روک اور اس کی خواہشات کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دے، کیوں کہ خواہشِ نفس کا غلبہ انسان کی تباہی یا گمراہی کا موجب اور اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب ہے، اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد ہوا: وَلا تَتَّبِعِ الْهَوىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص:۲۶)۔ یعنی اور خواہشِ نفس کے پیچھے نہ جانا، کہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دے گی۔ اور حدیثِ پاک میں ہے: وَاما المهلِكاتُ فثلاثٌ: شحٌ مُطاعٌ وهَوىٰ مُتَّبَعٌ واعجابُ المرءِ بنفسه، یعنی انسان کے لیے ہلاکت خیز چیزیں تین ہیں (۱) بخل، جس کی اطاعت کی جاے، (۲) خواہشِ نفس، جس کی پیروی کی جاے، (۳) خود پسندی۔

محاسن بلاغت: (۱) ''هَوَاهَا'' میں استعارۂ مکنیہ اور تخییلیہ ہے، (۲) اور ''يُصْمِ اَوْ يَصِمِ'' کا ذکر ترشیح ہے، (۳) ''يُصْمِ'' اور ''يَصِمِ'' کے درمیان تجنیس مُحرّف ہے، (۴) تُوَلِّيَهُ اور تَوَلّىٰ کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے۔

(۲۰)

وَرَاعِهَا وَهْيَ فِي الْاَعْمَالِ سَائِمَةٌ
وَاِنْ هِيَ اسْتَحْلَتِ الْمَرْعىٰ فَلا تُسِمِ

ترجمہ: اور نفس جب اعمال صالحہ (نوافل) کے میدان میں چرنے میں مصروف ہو تو اس وقت بھی اس کی نگرانی کر اور اگر یہ چارہ اسے میٹھا لگے تو چرنے سے اسے روک دے۔

لغات: رَاعِ: فعل امر حاضر، از مُراعاۃ بمعنی نگرانی کرنا، دیکھ ریکھ کرنا۔ سَائِمَةٌ: چرنے والا، (ج) سَوَائِمُ۔ اِسْتَحْلَتْ: شیریں اور لذیذ سمجھے، پسند کرے۔ اَلْمَرْعىٰ: چراگاہ، اس صورت میں یہ ظرفِ مکان ہے، یا بہ معنی گھاس، چارہ، اس صورت میں یہ مصدر ہے، (ج) مَرَاعِيْ۔ لا تُسِمْ: مت چرنے دے، فعل نہی از سَامَ يَسُوْمُ سَوْماً (ن)۔

تشریح: یعنی نفس کی پرفریب چالوں پر ہمیشہ کڑی نگاہ رکھ، کیوں کہ کبھی نفس بہ ظاہر اعمال

صالحہ میں مصروف دکھائی دیتا ہے اور اسے ان میں بڑا مزا آتا ہے، کیوں کہ ان میں ریا ونمود ہوتا ہے، جس سے اس کے اندر غرور ونخوت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ دوسروں پر اپنے تقویٰ وطہارت اور عبادت وریاضت کی دھونس جمانے لگتا ہے، جو انسان کے لیے زہر ہلاہل ہے، جب نفس کی یہ کیفیت ہوجائے تو اس کو ان اعمال صالحہ سے ہٹا کر دوسرے نیک کاموں میں مصروف کردے جن میں اسے یہ مزہ نہ ملتا ہو، خیال رہے کہ اس شعر میں اعمال صالحہ سے مراد نوافل ہیں، فرائض وواجبات نہیں، کیوں کہ انہیں بہر حال ادا کرنا ہے، چاہے ان میں نفس کو مزہ ملے یا نہ ملے، جی لگے یا نہ لگے، فریبِ نفس کی بنا پر انہیں چھوڑا نہیں جاسکتا، ہاں نفلی عبادتوں میں اگر ریا اور دکھاوا پیدا ہونے لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے جذبے سے خالی ہوں تو ان کو ترک کردینا اور ریا ونمود سے خالی دوسری عبادتوں میں مصروف ہوجانا ہی شرعاً محمود ومطلوب ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) ضمیر ''هِيَ'' میں استعارہ بالکنایہ ہے، (۲) اور ''چرنے'' کا نفس کے لیے اثبات استعارۂ تخییلیہ ہے، (۳) ''وَهِيَ سَائِمَةٌ'' میں تشبیہِ بلیغ ہے، (۴) ''مَرْعیٰ'' کا ذکر ترشیح ہے، (۵) ''رَاعِ'' اور ''مَرْعیٰ'' کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے، یوں ہی ''سَائِمَةٌ'' اور ''لَا تُسِمْ'' کے درمیان بھی صنعتِ اشتقاق ہے، (۶) ''سَائِمَةٌ'' کو مصرع اولیٰ کے اخیر میں اور ''لَا تُسِمْ'' کو مصرع ثانیہ کے اخیر میں لانے میں صنعتِ رد العجز علی الصدر ہے۔

(۲۱)

كَمْ حَسَّنَتْ لَذَّةً لِلْمَرْءِ قَاتِلَةً
مِنْ حَيْثُ لَمْ يَدْرِ اَنَّ السَّمَّ فِي الدَّسَمِ

ترجمہ: (کیوں کہ) بسا اوقات وہ انسان کے سامنے جان لیوا لذت کو ایسی اچھی صورت میں پیش کرتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ چکنائی میں زہر ملا ہوا ہے۔

لغات: لَمْ يَدْرِ: نہ جاننا، مضارع مجزوم بلم، از دریٰ يَدْرِي دِرَايَةً (ض)۔ السَّمّ (بتثلیث سین): زہر (ج) سِمَامٌ وسُمُوْمٌ۔ الدَّسَم: گوشت یا چربی کی چکنائی۔

تشریح: نفس دشمنوں کی مانند ہے اور چالاک وعیار دشمن کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چکنے اور لذیذ کھانوں میں زہر ملا دیا کرتا ہے جسے کھا کر انسان موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے، کیوں کہ اس کھانے کی لذت کی وجہ سے اسے زہر کا پتہ نہیں چلتا، اسی طرح نفس اعمالِ صالحہ میں ریا وسُمعہ اور خود پسندی کو داخل کر دیتا ہے جو ان کے لیے زہر ہلاہل ہے اور اس طرح وہ انسان کے اعمال کو برباد کر دیتا ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔

محاسن بلاغت: (۱) السَّم اور الدَّسَم کے درمیان تجنیس مردوف ہے (۲) ''سَم'' بہ طور استعارۂ تصریحیہ ریا وخود پسندی اور ''دَسَم'' سے طاعت وعمل مراد ہے۔

وَاخْشَ الدَّسَائِسَ مِنْ جُوْعٍ وَّمِنْ شِبَعٍ
فَرُبَّ مَخْمَصَةٍ شَرٌّ مِّنَ التُّخَمِ (۲۲)

ترجمہ: بھوک اور سیری دونوں صورتوں میں نفس کی پرفریب چالوں سے ڈرتا رہ، کیوں کہ کبھی فاقہ کی کیفیت بدہضمی سے زیادہ بری ثابت ہوتی ہے۔

لغات: الدَّسَائِس: دَسِیْسَۃ کی جمع ہے، بمعنی سازش، پوشیدہ چال۔ جوع: بھوک، شِبَعٌ: مصدر از باب سَمِعَ یَسْمَعُ، شکم سیری۔ اَلْمَخْمَصَۃُ: بھوک کی شدت۔ التُّخَم: بدہضمی، یہاں مراد غایتِ شکم سیری ہے۔

تشریح: بھوک کی شدت اور شکم سیری کی کثرت دونوں حالتوں میں انسان کو نفس امارہ سے چوکنا اور اس کی پرفریب چالوں سے ہوشیار رہنا چاہیے، کیوں کہ وہ بھوک کی حالت میں انسان کو بدمزاج، بدخلق اور ضعیف وناتواں بنا دیتا ہے اور شکم سیری کی حالت میں اسے عبادات میں سست وکاہل، یادِ خدا سے غافل اور تیرہ دل بنا دیتا ہے، انسان کو یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ بھوک کی شدت میں کوئی آفت نہیں، کیوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بھوک شکم سیری سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، بارہا دیکھا گیا ہے کہ سیری کی حالت میں تھوڑی بہت عبادت سستی کے ساتھ ہو جاتی ہے اور بھوک کی شدت میں عبادت

بالکل نہیں ہو پاتی، اسی مفہوم کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے: كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا. یعنی تنگ دستی کبھی انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔

محسن بلاغت: (۱) مخمصۃ اور تخم کے درمیان طباق ایجاب ہے۔

وَاسْتَفْرِغِ الدَّمْعَ مِنْ عَيْنٍ قَدِ امْتَلَاَتْ
مِنَ الْمَحَارِمِ وَالْزَمْ حِمْيَةَ النَّدَمِ (۲۳)

ترجمہ: حرام سے لب ریز آنکھ کا علاج آنسوؤں کے استفراغ اور اشک باری سے کر، پھر ہمیشہ ندامت کا پرہیز اختیار کر۔

لغات: اِسْتَفْرِغْ: امر حاضر معروف از استفراغ بمعنی قے کرنا، معدہ یا بدن کو فضلات سے خالی کرنا، بہانا۔ اَلْمَحَارِم: مَحرم کی جمع: حرام چیزیں، ناجائز مناظر۔

تشریح: یعنی آنکھ جو نامحرموں اور حرام چیزوں کو دیکھتے دیکھتے گناہوں کی گندگی سے بھر گئی ہے اس کی صفائی کا طریقہ یہ ہے کہ ندامت وشرم ساری کے آنسو اس قدر بہاؤ کہ آنکھوں کا چشمہ خشک ہو جائے، جیسے گندے کنویں سے سارا پانی نکال کر اس کی صفائی کی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد ہمیشہ یہ ندامت برقرار رکھو، تاکہ دوبارہ گناہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔

فائدہ:- اس شعر میں امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے تین لفظ خاص اطبا کی اصطلاح کے استعمال فرمائے ہیں (۱) استفراغ (۲) امتلاء (۳) حمیہ، جب معدہ غذا سے بالکل پُر ہو جاتا ہے اور بدہضمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسے اطبا کی اصطلاح میں ''امتلاء'' کہا جاتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ مُسہل اور دست آور دوا دے کر اس کے اندر جمع فضلات اور فاسد مادوں کو خارج کیا جاتا ہے، یا پھر قے کے ذریعہ اسے ان سے خالی کیا جاتا ہے، دوسری صورت کو اصطلاح طب میں ''استفراغ'' کہا جاتا ہے، پھر مریض پر لازم ہوتا ہے کہ ہمیشہ معدے کو خراب کرنے والی اور بدہضمی پیدا کرنے والی غذاؤں سے بچتا اور پرہیز کرتا رہے، اسے ''حمیہ'' کہا جاتا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) استفراغ اور امتلاء کو یک جا کرنا "طباق ایجاب" ہے (۲) دمع اور عین کے اجتماع میں صنعت "مراعاۃ النظیر" ہے (۳) "عین" میں استعارۂ مکنیہ اصلیہ ہے (۴) اور اس کے بعد "امتلاء" کا ذکر ترشیح ہے (۵) اس شعر میں بزرگوں کے مقولہ "صَبُّ الْعَبَرَاتِ يَحُطُّ السَّيِّآتِ" (اشک ریزی گناہوں کو مٹاتی ہے) کی جانب تلمیح ہے (۶) الندم کی "حمیہ" سے تشبیہ "تشبیہ بلیغ" ہے۔

(۲۴)
وَخَالِفِ النَّفْسَ وَالشَّيْطَانَ وَاعْصِهِمَا
وَإِنْ هُمَا مَحَضَاكَ النُّصْحَ فَاتَّهِمِ

ترجمہ: نفس اور شیطان کی مخالفت اور نافرمانی کر اور یہ دونوں اگر تجھے مخلصانہ نصیحت کریں تو بھی ان پر بدخواہی کا الزام رکھ۔

لغات: مَحَضَا: صیغۂ تثنیہ مذکر غائب از مَحَضَ فُلَاناً النُّصْحَ (ف) کسی کے ساتھ مخلصانہ خیر خواہی کرنا۔ النُّصْح: خیر خواہی۔ اِتَّهِمْ: امر حاضر از اتہام بمعنی تہمت لگانا، الزام رکھنا۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نفس اور شیطان انسان کے ابدی دشمن ہیں اور ایسے دشمن سے خیر خواہی کی امید رکھنا کھلی ہوئی غلطی اور عاقبت نا اندیشی ہے، لہٰذا نفس اور شیطان اگر بھلی بات بھی بتائیں تو سوچ سمجھ کر ہی ان کے حکم کی تعمیل کرنا، کیوں کہ ضرور اس میں بھی کوئی خاص راز مضمر ہوگا، بلکہ ہر حال میں ان کی مخالفت اور حکم عدولی ہی احتیاط کا تقاضا ہے۔

(۲۵)
وَلَا تُطِعْ مِنْهُمَا خَصْماً وَّلَا حَكَماً
فَأَنْتَ تَعْرِفُ كَيْدَ الْخَصْمِ وَالْحَكَمِ

ترجمہ: ان دونوں میں سے ایک تیرا فریق ہو اور دوسرا فیصل تو بھی کسی کی نہ سن، کیوں کہ تو خوب جانتا ہے کہ ایسے فریق اور ایسے فیصل کی چال کیا ہوگی۔

لغات: الخصم: فریق مخالف، مدمقابل، اس لفظ میں تثنیہ، جمع اور مؤنث و مذکر برابر ہیں (ج) خُصوم، خِصام، اَخصام۔ الْحَكَمُ: فیصل، سرپنچ، یہ لفظ واحد و جمع دونوں کے

لیے مستعمل ہے۔ **اَلْکَیْدُ**: مکروفریب، خفیہ چال، (ج) کِیَادٌ۔

تشریح: انسان کے اندر خواہشات کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں (۱) دل (۲) نفس (۳) شیطان، اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ اگر دل کوئی کارِ خیر کرنا چاہتا ہے تو نفس امارہ اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے، اس طرح دونوں میں جھگڑا ہونے لگتا ہے، تو وہ دونوں کسی کو اپنا حکم اور فیصل بنانا چاہتے ہیں، بالآخر شیطان کی جانب رجوع کرتے ہیں، تو وہ اس محاکمہ میں دل کو برائی کا حکم دیتا ہے، اس اعتبار سے نفس فریق مخالف ہوا اور شیطان فیصل. اور اگر شیطان کسی برے کام پر آمادہ ہوتا ہے تو دل اسے اس سے روکتا ہے، کہ اسے مت کر، کیوں کہ یہ برا کام ہے، مگر شیطان ضد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اچھا کام ہے، بالآخر دونوں فیصلہ کے لیے نفس کی جانب رجوع کرتے ہیں، نفس، شیطان کے حق میں فیصلہ دیتا ہے، اس صورت میں شیطان دل کا فریق بنا اور نفس فیصل، اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ نفس اور شیطان میں سے ہر ایک دل کا فریقِ مخالف بھی ہوتا ہے اور حکم و فیصل بھی، امام بوصیری اس شعر میں فرماتے ہیں کہ نفس اور شیطان کی دونوں صورتوں میں مخالفت اور حکم عدولی کرنی چاہیے اور کسی حال میں بھی ان کے فریب میں نہیں آنا چاہیے۔

فائدہ: علامہ زرکشی نے اس شعر کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ اس قصیدہ کا سب سے مشکل شعر ہے، کیوں کہ نفس کا فریق مخالف اور فیصل دونوں ہونا یوں ہی شیطان کا دونوں صفات سے متصف ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا اور شارحین نے اس کی تشریح میں جو بھی خامہ فرسائی کی ہے اس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا، ایک مدت تک میں اس کے صحیح مفہوم کی تہ تک پہنچنے کے لیے حیران و سرگرداں رہا، بالآخر مکاشفہ میں حضرت بوصیری رحمۃ اللہ علیہ سے شرف نیاز حاصل ہوا، میں نے عرض کیا: حضور! اس شعر کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر تو نے انسان کے اندر خواہشات کے اسباب و دواعی کے بارے میں غور کر لیا ہوتا تو شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا، میں نے عرض کیا: میں آپ ہی سے اس کی تفصیل چاہتا ہوں، تو

حضرت امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے شعر کی وہی تشریح کی جو میں نے اوپر بیان کیا ہے،
(عصیدۃ الشہدۃ شرح قصیدۃ البردۃ للشیخ عمر بن احمد الخرپوتی، ص ۵۶)۔
محاسن بلاغت: الخصم والحکم کو مصرعہ اولیٰ کے آخر میں پھر شعر کے آخر میں لانا "رد العجز علی الصدر" ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ مِنْ قَوْلٍ بِلَا عَمَلٍ
(۲۶)
لَقَدْ نَسَبْتُ بِهٖ نَسْلاً لِذِيْ عُقُمٖ

ترجمہ: میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اس گفتار سے جو کردار سے خالی ہو، کہ ایسی بات کرنا گویا بانجھ کے لیے اولاد بتانا ہے۔

لغات: اَلنَّسْلُ: اولاد، ذریت، (ج) اَنْسَال۔ العُقُمُ: (مصدر، س) بانجھ ہونا۔

تشریح: اس شعر میں امام بوصیری بہ طور انکسار فرماتے ہیں کہ جو نصیحتیں میں دوسروں کو کر رہا ہوں ان پر خود ہی عامل نہیں، لہٰذا میں بارگاہِ خداوندی میں اس گفتار سے استغفار کرتا ہوں جو کردار و عمل سے خالی ہے، فرمان الٰہی ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (بقرہ: آیت ۴۴) کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھے ہو، اور فرمان باری تعالیٰ ہے: كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصف: ۳) ترجمہ: (کتنی سخت ناپسند اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو) کیوں کہ ایسی بات کرنا گویا بانجھ کے لیے اولاد بتانا ہے۔

اَمَرْتُكَ الْخَيْرَ لٰكِنْ مَا ائْتَمَرْتُ بِهٖ
(۲۷)
وَمَا اسْتَقَمْتُ فَمَا قَوْلِيْ لَكَ اسْتَقِمٖ

ترجمہ: میں نے تجھے نیکی کی ہدایت کی لیکن خود اس پر عمل نہ کیا اور راہِ راست پر نہ آیا تو تجھے اس کی تاکید کرنے کا کیا معنیٰ؟

لغات: اِئْتَمَرْتُ بِهٖ: ماضی متکلم از اِئْتِمَار بمعنی قصد وارادہ کرنا، عمل کرنا۔ مَا: "فَمَا قَوْلِيْ

لَکَ ''میں استفہام انکاری کے لیے ہے۔

تشریح: یہ شعر گزشتہ شعر کا بیان ہے، اس میں استقامت کا ذکر ہے اور استقامت نام ہے علم و عمل پر ہمیشہ اس طرح قائم رہنے کا کہ کبھی اس کا ترک نہ ہو، یہ ایسی زبردست اور مشکل چیز ہے کہ سرورِ کونین ﷺ نے فرمایا: شَیَّبَتْنِي سُوْرَةُ هُوْد مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا، ایک بزرگ نے سرکار ﷺ کی خواب میں زیارت کی تو عرض کیا کہ حضور کو سورہ ہود کے کس مضمون نے بوڑھا کر دیا، کیا انبیا کے قصوں یا گزشتہ امتوں کی ہلاکت و بربادی کے واقعات نے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ اس آیت نے جس میں ارشاد ہوا: فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (ھود، آیت ۱۱۲) ترجمہ: (تو استقامت اختیار کرو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے)۔ حضرت ابو علی جرجانی کا ارشاد ہے: كن طالب الاستقامة لا طالب الكرامة فان نفسك متحركة في طلب الكرامة وربك يطلب منك الاستقامة فالكرامة الكبرىٰ الاستقامة في خدمة الخالق لا باظهار الخوارق. یعنی تو استقامت کا طلب گار بن، نہ کہ کرامت کا، کیوں کہ تیرا نفس تو طلبِ کرامت میں کوشاں ہے، جب کہ تیرا رب تجھ سے استقامت چاہتا ہے اور سب سے بڑی کرامت تو خالق کائنات کی خدمت و پرستش میں استقامت ہے نہ کہ خوارق عادات کا اظہار۔

محاسن بلاغت: (۱) اَمَرْتُ اور اِئْتَمَرْتُ کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے، یوں ہی اِسْتَقَمْتُ اور اِسْتَقِمْ کے درمیان بھی (۲) اِسْتَقَمْتُ کو مصرعہ ثانیہ کے آغاز میں اور اِسْتَقِمْ کو اس کے آخر میں لانا صنعتِ تصدیر ہے، جس کو رد العجز علی الصدر بھی کہتے ہیں (۳) ما استفہامیہ مجاز لغوی ہے۔

(۲۸)

وَلَا تَزَوَّدْتُ قَبْلَ الْمَوْتِ نَافِلَةً
وَلَمْ اُصَلِّ سِوىٰ فَرْضٍ وَلَمْ اَصُمِ

ترجمہ: اور میں نے سفرِ موت سے پہلے نوافل کا توشہ بھی نہ لیا اور بجز فرض کے نماز روزہ بھی ادا نہ کیے۔

لغت: لاَتَزَوَّدْتُ: فعل ماضی از باب تفعل: میں نے توشہ اور سامان سفر نہ لیا۔ نَافِلَة: فرض و واجب اور سنت مؤکدہ کے سوا زائد عبادات، (ج) نَوَافِل۔

تشریح: حدیث پاک میں ارشاد ہے: کُن في الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔ دنیا میں ایسے رہ جیسے کہ تو مسافر ہو یا راہ چلتا۔ تو مومن کو دنیا میں مسافروں کی طرح رہنا چاہیے اور اسے سفر آخرت کے لیے سامان سفر اور توشہ کی فکر کرنی چاہیے اور اس سفر کا سب سے بہترین اور شاندار تحفہ یہ ہے کہ وہ فرائض و واجبات کی بھرپور ادائیگی کے بعد نوافل کی جانب متوجہ ہو اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرے، اس لیے حدیث قدسی میں ہے:

لایزال العبد یتقرب الي بالنوافل حتّٰی احبہُ اللّٰہ تعالیٰ. اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔

اسی بنا پر ہمارے اسلافِ کرام فرائض و واجبات کی بھرپور ادائیگی کے بعد نوافل کا خاص اہتمام فرماتے تھے، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر روز اپنے حجرۂ عبادت میں پردہ ڈال کر چار سو رکعت نفل ادا فرماتے، اس کے بعد دولت سرا میں تشریف لاتے۔ حضرت شریک روایت کرتے ہیں کہ: میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ایک سال رہا، اس مدت کے دوران کبھی بھی میں نے آپ کے پہلو کو زمین کا سہارا لیتے نہ دیکھا اور آپ کی بارگاہ کے حاضر باش لوگ بیان کرتے تھے کہ آپ فجر کی نماز ہمیشہ عشا کے وضو سے پڑھا کرتے تھے۔ حضرت شعبہ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ لوگ جب آپ سے رخصت ہو کر سونے کے لیے چلے جاتے تو آپ اپنی نشست گاہ سے اٹھ کر مسجد میں تشریف لاتے تو جب میرے اندر جاگنے کی طاقت نہ رہتی تو میں آپ کے نعلین مبارک میں کنکریاں ڈال کر گھر آ کر سو جاتا، صبح کی نماز کو جاتا تو

نعلین میں وہ کنکریاں جوں کی توں پاتا اور آپ کو مسجد میں اپنی جگہ روتا، دعا کرتا پاتا۔

اسی بنا پر حضرت بوصیری رحمۃ اللہ علیہ بطور انکسار اپنی ذات پر افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخرت کا طویل اور دشوار گزار سفر درپیش ہے، مگر افسوس! میں نے نوافل کی ادائیگی کر کے اس کے لیے کوئی توشہ تیار نہ کیا، اور صرف فرض نمازیں اور روزے ہی ادا کیے۔ اس شعر میں بہ ظاہر جہاں اپنے اوپر افسوس کا اظہار ہے وہیں دوسروں کو سفر آخرت کی تیاری کرنے اور عبادت و ریاضت میں دل لگانے کی دبے لفظوں میں نصیحت بھی ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں موت کو سفر سے تشبیہ دے کر مشبہ بہ کو حذف کیا اور اس کے مناسبات میں سے ''تَزَوَّدْت'' کو ذکر کیا، یہ استعارۂ مکنیہ اصلیہ ہے، (۲) ''نافلۃ'' اور ''فرض'' کو جمع کرنے میں صنعت طباق ایجاب ہے، (۳) صلوٰۃ، صوم اور فرض و نفل کے ذکر میں مراعاۃ النظیر ہے۔

الفصل الثالث

فی مدح رسول اللہ ﷺ

(۲۹)

ظَلَمْتُ سُنَّةَ مَنْ اَحْيَ الظَّلَامَ اِلىٰ
اَنِ اشْتَكَتْ قَدَمَاهُ الضُّرَّمِنْ وَرَم

ترجمہ: میں نے ان کی سنت کا حق نہ ادا کیا جو اتنی زیادہ عبادت و شب بیداری کرتے کہ قدموں میں ورم ہو جاتا۔

لغات: الظَّلام: تاریکی، مراد تاریک راتیں۔ اَحيَ الظَّلام: تاریک راتو کو زندگی بخشی، یعنی عبادتِ الٰہی کے ذریعہ انہیں روشن و تاب ناک بنایا۔

تشریح: نزول وحی کے ابتدائی دور میں سرکارِ اقدس ﷺ پوری پوری رات بیدار رہتے اور عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے اور نماز میں اتنا طویل قیام فرماتے کہ پائے اقدس میں ورم آجاتا، صحابہ کرام نے عرض کیا: آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں، آپ کے سبب تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ بخش دیے ہیں؟ آپ ﷺ ارشاد فرماتے: افلا اکُونُ عَبداً شَکُوراً۔ کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں؟ (بخاری، کتاب الصلوۃ، باب قیام النبی ﷺ باللیل)، بالآخر اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور کی تسکین کا سامان ہوا اور اس طرح عبادات میں تخفیف کرنے کی تلقین ہوئی، ارشاد ہوا:

طٰهٰO مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓىO (طٰہٰ: ۱)

(طٰہٰ، میں نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ خود کو مشقت میں ڈالیں)۔

اس کے بعد حضور کی عادتِ کریمہ یہ رہی کہ تہائی رات گزر جانے کے بعد بیدار

ہوتے اور تہجد ادا فرماتے، جو عام طور پر مع وتر گیارہ رکعتیں ہوتیں، البتہ کبھی کبھی تیرہ
پندرہ رکعت پڑھتے اور کبھی دو رکعت ہی میں پوری رات گزر جاتی، جیسا کہ حضرت عائشہ
صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکور ہے۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ سرکار اقدس ﷺ کی عبادت و
ریاضت اور شب بیداری کا تو یہ عالم تھا اور ہم نے آپ کی سنت کا اتباع نہ کر کے اور اس
کے حق کی ادائیگی نہ کر کے آپ کی سنت پر ظلم کیا، پھر خود کو سرکار کا عاشق و شیدا کہنا میرے
لیے کسی طرح زیبا نہیں۔

محاسن بلاغت: (۱) ''ظَلَمْتُ'' سے بطور کنایہ چھوڑنا اور حق ادا نہ کرنا مراد ہے،
(۲) ''الظَّلَام'' میں مجاز مرسل ہے، (۳) ''اَحْیَی'' میں استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے،
(۴) ''اشتکاء القدمین'' شدتِ تکلیف اور غایت درد والم سے کنایہ ہے، (۵) اس شعر میں
''حسن تخلص'' ہے جسے اردو میں ''حسن گریز'' کہا جاتا ہے، (٦) اس میں صنعت تلمیح بھی ہے۔

وَشَدَّ مِنْ سَغَبٍ اَحْشَآءَهٗ وَطَوٰی
تَحْتَ الْحِجَارَةِ كَشْحاً مُتْرَفَ الْاَدَمِ (۳۰)

ترجمہ: جو بھوک کی شدت سے شکم مبارک باندھ لیتے اور پتھروں کے نیچے نازک و مبارک کمر
کو تہہ کر لیتے۔

لغات: شَدَّ: ماضی معروف از باب نصر، باندھا۔ مِنْ: برائے تعلیل ہے۔ السَّغَبُ: سخت
بھوک، مصدر از باب نصر و سمع۔ الاَحْشَآءُ: الحشا کی جمع، پیٹ کے اندر کی چیزیں، جیسے
جگر، گردہ، اوجھڑی وغیرہ، مجازاً پیٹ۔ طَوٰی: لپیٹا، تہہ کیا، ماضی از باب ضرب۔ الْکَشْحُ:
کمر، پہلو، کوکھ اور پسلیوں کے درمیان کی جگہ، (ج) کُشُوْحٌ۔ مُتْرَف: عیش و عشرت کا پروردہ، ناز
و نعمت کا پلا ہوا، مراد نرم و نازک۔ الاَدَمُ: جلد، کھال۔

تشریح: یہ شعر بھی معنیٰ کے اعتبار سے گزشتہ شعر سے مربوط ہے، یعنی میں نے ان کی سنت

کا حق ادا نہ کیا جو پوری پوری رات جاگ کر عبادت کرتے اور بھوک کی شدت سے شکم مقدس کس لیتے۔ الخ

صحیح مسلم میں حضرت انس ﷺ سے روایت ہے:

جئت رسول اللہ ﷺ یوما فوجدتہ جالسا مع أصحابہ یحدثھم وقد عصب بطنہ بعصابۃ، فقالوا: من الجوع.

(ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا آپ صحابہ کرام کے ساتھ بیٹھے گفتگو فرما رہے ہیں اور شکم مبارک کو ایک پٹکے سے باندھ رکھا ہے، لوگوں نے بتایا: یہ بھوک کی وجہ سے ہے)۔

اس طرح کی اور بھی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بھوک کی شدت سے شکم مبارک پر بعض وقت ایک اور بعض وقت دو پتھر باندھ لیا کرتے تھے، اس طرح معدہ کی سوزش کسی قدر دب جاتی اور بھوک کی شدت کچھ کم ہو جاتی، یہ سب کچھ رفع درجات، مزید اجر و ثواب کے حصول اور امت کی تعلیم و تسکین کے لیے تھا، مگر اس سے آپ کی قوت و طاقت اور جسم کی تر و تازگی میں کچھ فرق نہ آتا تھا، درحقیقت یہ بھی آپ کے معجزوں میں سے ایک معجزہ تھا، کیوں کہ قوت اور چہرے کی آب و تاب اور چمک دمک، رنگت کی صفائی اور جسم کی تر و تازگی مرغوب و لذیذ غذاؤں، مقوی اور تغذیہ بخش کھانوں کے استعمال، عمدہ اور صاف ستھرے لباس کے پہننے، اور نرم نرم بچھونوں پر حسب ضرورت محوِ استراحت ہونے سے حاصل ہوتی ہے، مگر یہاں ان میں سے کچھ بھی نہیں، کھانے کو جو کی روٹی ہے، وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں، پہننے کو موٹے جھوٹے کپڑے، بچھانے کو کبھی کھردرے ٹاٹ کا فرش اور کبھی چمڑا جس میں روئی کی جگہ درخت کھجور کی چھال بھری ہوتی اور کبھی محض چارپائی جو کھجور کے پتوں کی رسی سے بنی ہوتی، مگر قوت و توانائی، حسن و جمال، تازگی و لطافت، آب و تاب اور چمک دمک میں بڑے بڑے طاقت ور پہلوان،

شاہان حسن وجمال اور خوش حال صاحبانِ ثروت بھی آپ کے سامنے ہیچ تھے
محاسن بلاغت: (۱) اس میں صنعت تلمیح ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الْجِبَالُ الشُّمُّ مِنْ ذَهَبٍ
(۳۱) عَنْ نَفْسِهِ فَأَرَاهَا أَيَّمَا شَمَمِ

ترجمہ: اور سونے کے بلند وبالا پہاڑوں نے آپ کو فریفتہ کرنا چاہا تو ان کے سامنے کیسی بے نیازی وبلندی سے پیش آئے۔

لغات: رَاوَدَتْهُ: آپ کو لبھانا، فریفتہ کرنا چاہا۔ الشُّمُّ: اَشَمُّ کی جمع: بلند وبالا۔ الشَمَم (مصدر از باب نصر وسمع) بلندی۔ اَيَّمَا: "ما" زائدہ ہے اور "أيّ" "عظمت وکمال کے معنی پر دلالت کرتا ہے اور یہ موصوف کی صفت ہے یعنی فَأَرَاهَا شَمَمًا أَيَّمَا شَمَمٍ: اَیْ شَمَمًا کامِلًا عَظِيْمًا. بولتے ہیں: محمد رجلٌ، اَیُّ رَجُلٍ، یعنی محمد بہت باکمال اور باعظمت آدمی ہیں۔

تشریح: حدیث پاک میں ہے کہ سرکارِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عرض علي ربي بطحاء مكة ذهبا، فقلت: لا يا ربِّ، ولكن أجوع يوما وأشبع يوما، فاذا شبعت حمدتک واذا جعت تضرعت اليک ودعوتک.

(سبل الہدیٰ، ج۷، ص۱۲۳)

(میرے پروردگار نے مکہ کے سارے کنکروں کو سونے میں تبدیل کر کے مجھے پیش کیا، میں نے عرض کیا: یارب العالمین! مجھے اس کی خواہش نہیں، میری یہ آرزو ہے کہ میں ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن کھانا کھاؤں، جس دن کھاؤں تیری حمد وثنا کروں اور جس دن فاقہ کروں تجھ سے گڑگڑا کے مانگوں اور دعا کروں)۔

دوسری حدیث میں ہے کہ ایک دن جبریل امین بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

ان اللّٰہ يقرئک السلام ويقول لک أتحب ان أجعل هذه

الجبال ذهبا وتکون معک حیثما کنت.

(اللہ تعالیٰ آپ کو سلام فرماتا ہے اور کہتا ہے کیا آپ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ میں ان پہاڑوں کو سونا بنادوں اور جدھر آپ تشریف لے جائیں وہ آپ کے ساتھ جائیں)۔ یہ سن کر کچھ دیر کے لیے حضور اقدس ﷺ نے سر مبارک جھکالیا اور غور وفکر کرنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد سر مبارک اٹھایا اور فرمایا:

یا جبریل ان الدنیا دارُ من لا دارَ لهٗ وَ مالُ مَن لا مالَ لهٗ یجمعها مَن لا عقل لهٗ فقال له جبریل: ثبّتک اللّٰه یا محمد بالقول الثابت. (الشفا للقاضي عیاض)

(اے جبریل! دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی اور گھر نہ ہو اور یہ اس کا مال ہے جس کے پاس کوئی مال نہ ہو، اس دنیا کو وہ آدمی جمع کرتا ہے جو عقل ودانش سے محروم ہو، تو حضرت جبریل نے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ کو حق پر ثابت قدم رکھے)۔

محاسن بلاغت: (۱) ''الجبال'' میں استعارہ مکنیہ اصلیہ ہے، (۲) الشم اور شمم کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے، (۳) شمم کو شعر کے آخر میں اور الشم کو مصرع اول کے وسط میں لانا صنعتِ ردالعجز علی الصدر ہے، (۴) اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے۔

(۳۲)

وَاَکَّدَتْ زُهْدَهٗ فِیْهَا ضَرُوْرَتُهٗ
اِنَّ الضَّرُوْرَةَ لَا تَعْدُوْ عَلَی الْعِصَمِ

ترجمہ: ان کی ضرورت نے دنیا سے بے رغبتی کو اور مضبوط کر دیا، ضرورت، عصمت پر غالب نہیں آتی۔

لغات: اَکَّدَت: مضبوط اور پختہ کیا۔ الزُّهد: ترکِ دنیا، دنیا سے بے رغبتی۔ لا تَعْدُوْ: غالب نہیں آتی۔ الْعِصَم: عِصْمَة کی جمع، گناہوں سے بچنے کا ملکہ، یہاں مراد اہل عصمت ہیں، یعنی انبیاے کرام وفرشتگان عظام۔

تشریح: یہ شعر معنیً گزشتہ شعر سے مربوط ہے، حضرت بوصیری اس میں سرکارِ اقدس ﷺ کے

زہد واستغنا اور عزم واستقلال کو بیان کر رہے ہیں کہ ظاہری اور حسی ضرورتوں نے حضور کے
زہد وترکِ دنیا کو بجائے کمزور کرنے کے اور مضبوط و مستحکم کر دیا اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ہمارے
نبی ﷺ سید المعصومین ہیں اور دنیوی ضرورتیں عصمتوں پر غالب نہیں آسکتیں۔

حضرت فاروق اعظم ؓ سے مروی ہے، آپ نے فرمایا: میں ایک دفعہ بارگاہ
رسالت میں حاضر ہوا، میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور کھردرے بان کے ساتھ بنی ہوئی چارپائی پر
ٹیک لگائے بیٹھے ہیں اور اس کے نشان حضور ﷺ کے پہلوئے مبارک میں صاف نظر آرہے
ہیں، میں نے سر اٹھا کر کاشانۂ اقدس کو دیکھا تو بخدا مجھے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جو
آنکھوں کے سامنے سدِ راہ بن سکے، سوائے تین چمڑوں کے جن کو رنگنے کے لیے لٹکایا
گیا تھا اور ایک کونے میں جَو کا ایک ڈھیر تھا، اس بے سروسامانی کو دیکھ کر میری آنکھیں
اشک آلود ہو گئیں، سرکار نے دریافت فرمایا: عمر! کیا ہو گیا ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟ میں نے
عرض کی یارسول اللہ!

اَنْتَ صَفْوَةُ اللّٰهِ مِنْ خَلْقِهٖ وَ كِسْرٰى وَ قَيْصَرُ فِيْمَا هُمَا فِيْهِ.

(حضور اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہیں (اور
حضور کی یہ حالت ہے) اور کسریٰ و قیصر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں)۔

حضرت عمر ؓ کی بات سن کر حضور کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا:

اولئک قوم عُجِّلت لهم طيِّباتُهم في حياتهم الدنيا، أما ترضىٰ
أن تكون لهم الدنيا ولنا الآخرة.

(یہ وہ لوگ ہیں جن کو اس دنیوی زندگی میں ساری راحتیں دے دی گئیں، کیا تم اس
بات کو پسند نہیں کرتے کہ انہیں تو دنیا دے دی جائے اور ہمیں آخرت کی ابدی نعمتیں)۔

حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں: میں نے عرض کی، میں اس تقسیم پر راضی ہوں اور
اپنے رب کریم کی حمد وثنا کرتا ہوں۔ ابوالحسن ضحاک نے اس جملہ کا اضافہ کیا:

یا عمر! لو شاء أن یسیر الجبال الراسیات معي ذھباً لسارث.

(سبل الھدی والرشاد، ج ۷، ص ۱۲۴)

(اگراللہ تعالیٰ ان بلند وبالا پہاڑوں کو میرے ساتھ سونا بنا کر چلانا چاہتا تو یہ میرے ہم راہ سونا بن کر چلتے)۔

محاسن بلاغت: (۱) ''العِصَم'' میں ایجاز حذف ہے یا مجاز مرسل۔

وَكَيْفَ تَدْعُوْ اِلَى الدُّنْيَا ضَرُوْرَةُ مَنْ
لَوْلَاهُ لَمْ تَخْرُجِ الدُّنْيَا مِنَ الْعَدَمِ (۳۳)

ترجمہ: اگر وہ نہ ہوتے تو خود دنیا عدم سے وجود میں نہ آتی، تو ضرورت انہیں اس دنیا کا طالب کیا بنا سکے گی۔

تشریح: یعنی سرکار باعث تخلیق عالم ہیں، اگر آپ نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی، ساری کائنات اپنے وجود میں آپ کی محتاج ہے، اگر وہ آپ کی طرف مائل ہو تو یہ عین ممکن اور قرین عقل وقیاس ہے، لیکن آپ دنیا کی طرف مائل ہوں یا دنیوی ضرورت آپ کو دنیا کی طرف مائل کرے یہ ناممکن اور سمجھ سے بالاتر ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) ''كَيْفَ'' میں مجاز لغوی ہے، کیوں کہ یہ یہاں نفی وانکار کے معنی میں ہے (۲) اس میں حدیث قدسی ''لولاک لما خلقت الدنیا'' کی جانب تلمیح ہے۔

مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْـ
ـنِ وَالْفَرِيْقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمٖ (۳۴)

ترجمہ: وہ محمد ﷺ ہیں جو دنیا وآخرت، جن وانس، عرب وعجم کے سردار ہیں۔

لغات: ''الکونین'': کونٌ کا تثنیہ، دونوں جہان یعنی دنیا وآخرت (ج) اکوان۔ الثَّقَلَيْن: الثقلُ کا تثنیہ، جن وانس، قرآن کریم میں ہے: ''سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ'' ۝ (الرحمٰن: ۳۱)۔ العُرب: بمعنی عرب (ج) اَعرُبٌ وعُروبٌ۔ السیِّد: سردار،

ملجائے کائنات (ج) أسیادٌ وسادۃٌ وسیائدُ۔

محاسن بلاغت: (۱) شعر کے پہلے مصرعہ میں ایجاز حذف ہے، کیوں کہ اصل یہ ہے: ہو محمد الخ۔

نَبِیُّنَا الْاٰمِرُ النَّاھِيْ فَلَا اَحَدٌ
(۳۵)
اَبَرَّ فِيْ قَوْلِ لَاْ مِنْـهُ وَلَا نَعَمِ

ترجمہ: ہمارے نبی، بھلائی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے ہیں، ان سے زیادہ سچا ہاں یا نہیں کہنے میں کوئی نہیں۔

لغات: اَبَرُّ: زیادہ سچا، اسم تفضیل از "بَرَّ فُلَانٌ فِيْ قَوْلِهٖ بَرًّا" (س، ض) بمعنی سچ بولنا۔

محاسن بلاغت: (۱) "لا" سے بطور کنایہ نفی اور "نعم" سے اثبات مراد ہے، (۲) نبینا کے بعد الآمر، الناھی وغیرہ کے ذکر میں صنعتِ تنسیق الصفات ہے، (۳) الآمر اور الناھی کا اجتماع طباق ایجاب ہے، (۴) الآمر الناھی کنایہ ہے سرکار کے رسول ہونے کا۔

هُوَ الْحَبِيْبُ الَّذِيْ تُرْجىٰ شَفَاعَتُهٗ
(۳۶)
لِكُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْاَهْوَالِ مُقْتَحَمِ

ترجمہ: وہی ایسے محبوب خدا ہیں جن کی شفاعت کا آسرا ہر پیش آنے والی ہول ناک مصیبت میں کیا جاتا ہے۔

لغات: الحبیبُ: محبوب (ج) اَحِبَّاءُ واَحِبَّۃ۔ تُرجیٰ: مضارع مجہول، از رجی یرجو رَجاءً (ن) بمعنی امید کرنا، آسرا کرنا، آس لگانا۔ الھَوْل: خوف، دہشت، خطرہ (ج) أھوالٌ وَھُؤُوْلٌ۔ المُقتحَم: اسم مفعول از اقتحام، یہ اصل میں "مُقْتَحَمٌ فِيْهِ": یعنی وہ چیز جس میں کوئی مبتلا ہو۔

تشریح: سرکار اقدس ﷺ دنیا وآخرت کی ہر مصیبت وبلا کے وقت ہماری مدد فرمانے والے اور شفاعت فرمانے والے ہیں اور قیامت کے دن آپ کی شفاعت کئی طرح کی

ہوگی، جس کی تفصیل صاحب المواہب اللدنیہ نے بیان فرمائی ہے، سرکار کی شفاعت کے یقینی ہونے کے باوجود اسے رَجا اور امید سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ انسان کے لیے یہ شایاں نہیں کہ وہ آپ کی شفاعت پر تکیہ کر کے دریائے معصیت میں ڈوب جائے۔

علامہ عمر بن احمد خرپوتی فرماتے ہیں:

"یہ شعر اس قصیدہ میں مناجات وقبولیتِ دعا کا پہلا شعر ہے، تو جس کو کوئی دینی یا دنیوی ضرورت درپیش ہو وہ اس شعر کو ایک ہی مجلس میں ایک ہزار بار پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری فرمائے گا اور اس کی دعا ان شاء اللہ ضرور قبول ہوگی"۔

شیخ ابوسعد خادمی نے فرمایا: "یہ شعر میری ہر ضرورت کے لیے تریاق ثابت ہوا ہے"

آگے اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہمارے استاذ محترم شیخ الحاج عثمان اقشہری ایک شہر کے مفتی تھے، کسی وجہ سے اس عہدہ سے برخاست کر دیے گے، جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان اور مغموم تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ منصب انہیں دوبارہ مل جائے، تو انہوں نے مجھے میرے دو ساتھیوں کے ہمراہ طلب فرمایا، ہم لوگوں نے درمیان میں کسی قسم کی گفتگو کیے بغیر ایک ہی نشست میں اس شعر کو ایک ہزار ایک بار پڑھا، ابھی تھوڑا سا وقت گزرا تھا کہ ان کے منصب افتا پر بحال ہونے کا فرمان جاری ہو گیا۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص ۷۷، ۷۸، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی)

(۳۷)

دَعَا اِلَی اللّٰہِ فَالْمُسْتَمْسِکُوْنَ بِہٖ
مُسْتَمْسِکُوْنَ بِحَبْلٍ غَیْرِ مُنْفَصِمِ

ترجمہ: آپ نے لوگوں کو خدائے برتر کی جانب بلایا، تو آپ کے دامن کو تھامنے والے درحقیقت ایسی مضبوط رسی کو پکڑے ہوئے ہیں جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔

لغات: اَلْمُسْتَمْسِکُوْنَ بِہٖ: آپ کا دامن پکڑنے والے، مراد آپ پر ایمان لانے والے ہیں۔ الحبل: رسی (ج) حِبَالٌ واَحْبُلٌ وَحُبُوْلٌ وَ اَحْبَالٌ. مُنْفَصِمٌ: اسم فاعل از انفصام بمعنی ٹوٹنا، کھلنا۔ غیر منفصم: نہ ٹوٹنے والی۔

تشریح: اس شعر میں ''دعا'' کے مفعول کو اس لیے حذف کر دیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ مفعول کوئی خاص نہیں بلکہ عام ہے، یعنی سرکار اقدس ﷺ کی دعوت صرف عجمیوں یا عربوں، اہل کتاب یا مجوسیوں یا مشرکوں یا جنوں کے ساتھ خاص نہ تھی، بلکہ ان سب کو عام تھی، شعر کا مفہوم یہ ہے کہ سرکار اقدس ﷺ نے تمام بندگان خدا کو دعوتِ حق دی، تو جن خوش نصیبوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسے مضبوطی کے ساتھ تھام لیا، انہوں نے ایک ایسی رسی پکڑی ہے جو کبھی شکست وریخت سے دوچار نہ ہوگی، اس شعر میں ''رسّی'' سے مراد دین خداوندی اور شریعت محمدی ہے اور اس کے نہ ٹوٹنے سے مراد یہ ہے کہ وہ کبھی منسوخ نہ ہوگی۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں اس آیت کریمہ کی جانب تلمیح ہے: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (البقرہ ۲:۲۵۶) تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی، جسے کبھی کھلنا نہیں۔ (۲) ''دعا الی اللّٰہ'' میں ایجاز حذف ہے، (۳) ضمیر ''بِہٖ'' میں استخدام ہے، کیوں کہ اس کا مرجع حضور اکرم ﷺ ہیں اور یہاں ضمیر سے مراد ان کا دین یا ان کی شریعت ہے، (۴) ''حبل'' میں استعارۂ تصریحیہ اصلیہ ہے اور ''غیر منفصم'' کا ذکر ترشیح ہے۔

(۳۸)

فَاقَ النَّبِيِّيْنَ فِيْ خَلْقٍ وَّ فِيْ خُلُقٍ
وَلَمْ يُدَانُوْهُ فِيْ عِلْمٍ وَّ لَا كَرَمٍ

ترجمہ: آپ حسن سیرت وحسن صورت دونوں میں سارے انبیاے کرام پر فائق ہیں اور وہ علم ودانش اور عطا و بخشش میں آپ کے قریب بھی نہیں پہنچے ہیں۔

لغات: فَاقَ: (ن) ماضی معروف از فَاقَ يَفُوْقُ فَوْقًا وَ فَوَاقًا، بمعنی اوپر ہونا، فوقیت لے جانا، برتری حاصل کرنا۔ الـخَلق: اصل معنی پیدا کرنا، ایجاد کرنا، عدم سے وجود میں لانا، لیکن یہاں اس سے مراد کمالات ظاہری اور حسن صورت ہے۔ الـخُلق: عادت، خصلت، طبیعت، لیکن یہاں اس سے مراد کمالات باطنی اور حسن سیرت ہے (ج) اَخلاق۔ لَمْ

بتانو!: قریب نہ ہوئے، ازدانا یلدانی مُدَانَاۃَ ۔

تشریح: تمام انبیاے کرام حسنِ صورت وحسنِ سیرت سے متصف تھے، لیکن ہمارے آقاو مولا ﷺ ان سب میں تمام نبیوں سے فائق وبرتر ہیں، کسی نبی کا علم ودانش اور عطا وبخشش میں آپ کے ہم پلہ ہونا تو درکنار، وہ آپ کے قریب بھی نہیں پہنچ سکا ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاے سابقین کو جو اوصاف وکمالات علاحدہ علاحدہ عطا فرمائے تھے وہ سب آپ کی ذاتِ مقدسہ میں جمع فرمادیے:

حسن یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری		آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ان کے علاوہ آپ کو وہ فضائل وکمالات بھی عطا ہوئے جو کسی نبی کو عطا نہ ہوئے:

آنچہ بناز ندزاں دل براں		جملہ تر اہست وزیادت براں

سوال: حضرت بوصیری رحمۃ اللہ علیہ سرکارِ اقدس ﷺ کی تمام انبیاے سابقین پر فضیلت و برتری بیان کررہے ہیں جب کہ خود سرکار نے اس سے منع فرمایا ہے، ارشادِ رسالت ہے: لا تفضلونی علیٰ یونس بن متی۔ یونس بن متی پر مجھے فضیلت مت دو۔ اور ایک موقع پر فرمایا: لا تُفَضِّلُونِیْ بین الانبیاء۔ دیگر انبیاء سے مجھے افضل نہ کہو۔

جواب: اس سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک جواب یہ ہے کہ سرکار نے اس سے منع فرمایا کہ میری فضیلت وبرتری اس طرح بیان نہ کرو جس سے کسی نبی کی توہین وتنقیص ہو، ورنہ مطلقاً آپ کی دیگر انبیاے کرام پر تفضیل ممنوع کیوں کر ہوسکتی ہے، جب کہ قرآن کریم میں اس کی صراحت یوں موجود ہے: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۔ (البقرہ: ۲۵۳) یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر افضل کیا ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا اور اس پر تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ وہ ذاتِ گرامی جسے اللہ تعالیٰ نے تمام رسولانِ عظام پر درجوں بلند فرمایا سرکارِ اقدس ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

فائدہ: علامہ عمر بن احمد خرپوتی لکھتے ہیں: یہ اس قصیدہ کا وہ دوسرا مبارک شعر ہے جس کو سن کر سرکارِ اقدس ﷺ فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے، لہٰذا اس شعر کو کم از کم تین بار دہرانا چاہیے۔ (عصیدۃ الشہدۃ ص ۸۱)

محاسن بلاغت: (۱) "خَلْق" اور "خُلُق" کے درمیان تجنیس محرف ہے۔

(۳۹)

وَكُلُّهُمْ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ

غَرْفاً مِّنَ الْبَحْرِ اَوْ رَشْفاً مِّنَ الدِّيَمِ

ترجمہ: اور وہ سب آپ کے دریائے علم و فضل سے ایک چلّو یا آپ کے بارانِ جود و کرم سے ایک گھونٹ پانے والے ہیں۔

لغات: مُلْتَمِسٌ: سائل، طلب گار، مگر یہاں اس سے مراد "پانے والا" ہے، اَلْغَرْفُ: چلّو۔ اَلرَّشْفُ: گھونٹ، پانی یا کسی سیال چیز کی تھوڑی مقدار جسے ہونٹوں سے چوسا جائے۔ اَلدِّيَمُ: دیمۃ کی جمع: لگاتار بارش جس میں چمک اور گرج نہ ہو۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے سرورِ کونین ﷺ کی روحِ پاک کو پیدا فرمایا، پھر اسے تاجِ نبوت سے سرفراز فرمایا، پھر دیگر انبیائے کرام کی ارواحِ طیبہ کی تخلیق فرمائی، سرکار کی روحِ پاک عالمِ ارواح میں دیگر انبیائے کرام کی روحوں کو تعلیم دیا کرتی تھی، ہر ایک روح نے اپنی قابلیت اور استعداد کے مطابق سرکار کی روحِ پاک سے استفادۂ علم کیا، کسی نے آپ کے علم کے بحرِ زخار سے ایک چلّو لیا اور کسی نے آپ کے فیضان کی موسلا دھار بارشوں سے ایک قطرہ یا ایک گھونٹ کی مقدار لیا، صاحب تفسیر روح البیان آیتِ کریمہ: وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ کے تحت لکھتے ہیں:

"ہمارے شیخ نے "الرسالة الرحمانية في بيان الكلمة العرفانية" میں یوں تحریر فرمایا ہے: اولیائے کرام کا علم انبیائے کرام کے علم کے مقابلہ میں ایسا ہی ہے جیسے سات سمندروں کے مقابلہ میں ایک قطرہ اور انبیائے کرام کا علم ہمارے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کے علم سے

یہی نسبت رکھتا ہے اور ہمارے نبی ﷺ کا علم علم الٰہی سے اسی طرح کی نسبت رکھتا ہے“۔
یہ نہایت بابرکت شعر ہے جسے سننے کے بعد سرکارِ مدینہ ﷺ فرطِ مسرت سے جھومنے لگے
فائدہ: یہ قصیدہ پڑھنے والے کو یہ شعر کم از کم تین بار پڑھنا چاہیے۔ (عصیدۃ الشھدہ ص ۸۳)
محاسن بلاغت: (۱) ”البحر“ میں استعارۂ مصرحہ اصلیہ ہے، یوں ہی ”الدیم“ میں بھی،
”البحر“ کے ساتھ ”غرف“ کا ذکر اور ”الدیم“ کے ساتھ ”رشف“ کا ذکر ترشیح ہے۔

وَوَاقِفُوْنَ لَدَیْهِ عِنْدَ حَدِّهِمِ
مِنْ نُقْطَةِ الْعِلْمِ اَوْ مِنْ شَكْلَةِ الْحِكَمِ (۴۰)

ترجمہ: اور وہ سبھی آپ کی بارگاہ میں اپنی اپنی حد پر کھڑے ہیں، جو آپ کی کتابِ علم کا ایک نقطہ یا کتابِ حکمت کا ایک اعراب ہے۔
لغات: لَدَیْهِ: لَدیٰ بمعنی عند، نزدیک، پاس۔ الشَّكْلَة: اعراب۔ الحِكَم: حکمت کی جمع، علم و معرفت، دانائی۔
تشریح: یہ شعر معنی کے اعتبار سے گزشتہ شعر کا بیان ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو علوم اور حکمتیں سرورِ کونین ﷺ کو بارگاہِ خداوندی سے عطا ہوئیں وہ اتنی کشادہ، وسیع اور زیادہ ہیں کہ دیگر انبیائے کرام کے علوم و حِکَم کو ان سے وہی نسبت ہے جو نقطہ یا اعراب کو کتاب سے ہوتی ہے۔ شیخ ابراہیم باجوری علیہ الرحمہ اپنی شرح بردہ میں لکھتے ہیں کہ: جہاں پر تمام انبیائے کرام کے علوم و حکمت کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے سرکارِ اقدس ﷺ کے علم و دانائی کی ابتدا ہوتی ہے، سرکارِ اقدس ﷺ کی وسعتِ علم کا کچھ اندازہ درج ذیل حدیث سے ہوتا ہے:

عَنْ عُمَرَ قال: قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَقَاماً ، فَاَخْبَرَنَا عَنْ بَدْءِ الْخَلْقِ حَتّٰى دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ مَنَازِلَهُمْ وَاَهْلُ النَّارِ مَنَازِلَهُمْ حَفِظَ ذٰلِكَ مَنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مَنْ نَسِيَهُ. رواہ البخاری۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۰۶، مطبوعہ مطبع مجتبائی)

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ہماری مجلس میں قیام

فصل ثالث

فرما کر ابتدائے تخلیق سے لے کر جنتیوں اور دوزخیوں کے اپنی اپنی منزلوں میں داخل ہونے تک کی خبر دی، اس کو جس نے یاد رکھا، یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا، بھلا دیا)۔

امام بدرالدین محمود عینی رحمۃ اللہ علیہ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (ج ۷، ص ۱۴۴) میں فرماتے ہیں:

فیہ دلالۃ علیٰ أنہ أخبر فی المجلس الواحد بجمیع أحوال المخلوقات من ابتدائھا الیٰ انتھائھا و فی ایراد ذلک کلہ فی مجلس واحد امرٌ عظیمٌ من خوارق العادۃ، کیف و قد أعطیٰ مع ذلک جوامع الکلم ﷺ.

(اس حدیث سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک ہی مجلس میں ابتدا سے انتہا تک مخلوقات کے تمام حالات کی خبر دی اور ایک ہی مجلس میں سب بیان فرما دینا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور یہ کیوں کر نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جوامع الکلم عطا فرما دیے تھے)۔

جسے سرکار اقدس ﷺ کے علم پاک کی ہمہ گیری اور وسعت کے جلوے دیکھنے ہوں وہ حضرت صدرالافاضل علامہ نعیم الدین مرادآبادی کی تصنیف "الکلمۃ العلیا" اور مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کی تصنیف "الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ" کا مطالعہ کرے، ان کتابوں میں قرآنی آیات، نبوی ارشادات اور علما و محدثین کی تحریرات سے سرکار اقدس ﷺ کی وسعت علم کو آفتاب نصف النہار کی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

(۴۱)

فَهْوَ الَّذِيْ تَمَّ مَعْنَاهُ وَصُوْرَتُهُ
ثُمَّ اصْطَفَاهُ حَبِيْبًا بَارِئُ النَّسَمِ

ترجمہ: آپ وہ ہیں جن کی صورت و سیرت کامل ہوگئی، پھر خالق کائنات نے آپ کو اپنا حبیب بنایا۔

لغات: المعنی: مطلب (ج) معانی۔ الصُّوْرَۃ: شکل، تصویر (ج) صُوَر، مگر اس شعر میں "معنی" اور "صورۃ" سے مراد سیرت و صورت ہے، یا کمالات باطنی و اوصافِ ظاہری ہیں،

یا باطنی وبعثت ظاہری، یا طریقت وشریعت، یا روحانیت وجسمانیت، یا علم وعمل، یا اللہ کی عبادت وپرستش اور بندوں کے ساتھ معاملہ داری ہے، اصطفی: چنا، انتخاب کیا۔ الباری: خالق، پروردگار، اسم فاعل از ''بَرَءَ'' بمعنی خَلَقَ۔ النَّسَمُ: نَسَمَة کی جمع، ہر جان دار، مخلوق، جان، انسان۔

تشریح: اس کا معنوی تعلق شعر نمبر ۳۸ ''فاق النبیین'' الخ سے ہے، یعنی آپ وہ اشرف الانبیاء ہیں جن کی سیرت وصورت، باطن وظاہر اور کمالات باطنی وصفات ظاہری کامل ومکمل ہیں اور خالق کائنات نے انہیں اپنا محبوب منتخب فرمایا ہے، اس شعر میں آیت کریمہ: اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلاً وَّمِنَ النَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ○ (الحج: ۷۵) (اللہ تعالیٰ تمام فرشتوں اور انسانوں میں سے رسولوں کا انتخاب فرماتا ہے) کی جانب اشارہ ہے اور درج ذیل حدیث کی طرف بھی:

عن واثلة بن الأسقع انه قال قال رسول الله ﷺ: اِنَّ اللّٰه اصطفىٰ من ولد ابراهيم اسماعيل و اصطفىٰ من ولد اسماعيل بني كنانة و اصطفىٰ من بني كنانة قريشا واصطفىٰ من قريش بني هاشم و اصطفاني من بني هاشم. (عصيدة الشهدة، ص ۸۶)

(حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے بنو کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں شعر ۳۸ کی طرف دیکھتے ہوئے لف ونشر غیر مرتب ہے، کیوں کہ معنی کا تعلق ''خُلُق'' سے اور صورۃ کا تعلق ''خَلْق'' سے ہے، جس میں ترتیبِ سابق الٹ گئی ہے۔

(۴۲)

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيْكٍ فِيْ مَحَاسِنِهٖ
فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ

ترجمہ: آپ اپنی خوبیوں میں شریک سے پاک ہیں، تو آپ کا جوہرِ حسن وجمال قابلِ تقسیم نہیں
لغات: مُنَزَّہٌ: پاک، بالاتر۔ مَحَاسِن: حسن کی جمع، خلاف قیاس، حسن وجمال، خوبی۔ اَلْجَوْهَرُ: کسی شے کی حقیقت، ذات، اصل، مادہ، اصطلاح فلسفہ میں وہ چیز جو قائم بالذات ہو اور جوہر فرد: اس جوہر کو کہتے ہیں جس کی تقسیم نہ ہو سکے (ج) جواھرُ، یہاں مراد یا تو اصل حقیقت اور مادہ ہے یا جوہر فرد۔

تشریح: اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ سرورِ کونین ﷺ اس سے منزہ اور بالاتر ہیں کہ آپ کی خوبیوں میں کوئی بالذات آپ کا شریک وسہیم ہو، کیوں کہ آپ کے تمام محاسن مستقل ہیں، کسی مخلوق کے رہینِ منت نہیں، جب کہ دیگر انبیاے کرام کی خوبیاں آپ کی خوبیوں کا ظل اور آپ کے محاسن کا صدقہ ہیں۔

اس تشریح سے اس اعتراض کا بھی جواب ہو گیا جو اس موقع پر کسی کے ذہن میں آ سکتا ہے، کہ حضور اقدس ﷺ کا تمام انبیاے کرام سے اشرف واعلیٰ ہونا ہمیں تسلیم ہے مگر یہ دعویٰ کہ آپ کے محاسن اور خوبیوں میں اور آپ کے حسن وجمال میں کوئی آپ کا شریک ونظیر نہیں محلِ نظر ہے، کیوں کہ رسالت، نبوت، حسن وجمال، اخلاص وعبادت اور دوسری بہت سی خوبیاں سرکارِ اقدس ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کے ساتھ ساتھ دوسرے انبیاے کرام اور مرسلین عظام میں بھی پائی جاتی ہیں، خلاصۂ جواب یہ ہے کہ سرکار کے محاسن بلاواسطہ اور مستقل ہیں جب کہ دیگر انبیاے کرام کے محاسن آپ کے واسطے سے انہیں حاصل ہوے، تو پھر آپ کے حسن وجمال کی حقیقت آپ کے اور کسی دوسرے کے درمیان منقسم اور مشترک نہیں بلکہ صرف آپ کا خاصہ ہے۔

سوال: آپ کے اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن وجمال سرکارِ اقدس ﷺ کے حسن وجمال کا صدقہ ہے اور سرکار ہی کے وسیلہ سے انہیں حاصل ہوا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن دیکھ کر اہلِ مصر آپ پر فریفتہ ہو گئے اور زنانِ مصر آپ کے

...وجمال میں ایسی کھو گئیں کہ انہیں پتا بھی نہ چلا اور انہوں نے لیموں کی بجائے اپنے ہاتھ...
سوال: جب کہ سرکار کے حسن وجمال کے متعلق ایسی کوئی بات منقول نہیں۔
جواب: سرکار کا حسن وجمال، حسن یوسف سے بدرجہا کامل وافزوں تر تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے جمال پر رعب وجلال کا وہ پردہ ڈال دیا کہ دیکھنے والے آپ کے حقیقی حسن وجمال کا ادراک نہ کر سکے، ورنہ سرکار کے حقیقی حسن وجمال کو کما حقہ اگر کوئی دیکھ لیتا تو وہ عالم میں ایسا محو ہوتا کہ انگلیوں کے بجائے اپنا دل بھی کاٹ لیتا تو اسے احساس نہ ہوتا، جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے درج ذیل اشعار سے ثابت ہے:

فَلَوْ سَمِعُوْا فِيْ مِصْرَ اَوْصَافَ خَدِّهٖ
لَمَا بَذَلُوْا فِيْ سَوْمِ يُوْسُفَ مِنْ نَقْدٍ
لَوَاحِيْ زُلَيْخَا لَوْ رَاَيْنَ جَبِيْنَهٗ
لَآثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَى الْاَيْدِيْ

(شرح المواہب للزرقانی۔ ج۳، ص۲۳۳)

ترجمہ: (اگر اہل مصر آپ کے رخسار مبارک کے اوصاف سن لیتے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے مول بھاؤ میں مال نہ لگاتے)۔
(زلیخا کو ملامت کرنے والیاں اگر سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جبین اقدس کا دیدار کر لیتیں تو وہ ہاتھوں کی بجائے اپنے دل کاٹ لیتیں)۔

محاسن بلاغت: (۱) جوہر اور غیر منقسم کے اجتماع میں صنعت مراعاۃ النظیر ہے۔(۲) "جَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ" کنایہ ہے "جوہر فرد" سے، یعنی آپ کا حسن و جمال "جوہر فرد" ہے جو قابل تقسیم نہیں ہوتا۔

(۴۳)
دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِيْ نَبِيِّهِمِ
وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

ترجمہ: عیسائیوں نے اپنے نبی (عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں جو دعویٰ کیا ہے اسے چھوڑ کر جو تیرا جی چاہے ان کی مدح وستائش کر اور اس پر مضبوطی سے قائم رہ۔

لغات: دَعْ: امر حاضر معروف از وَدَعَ یَدَعُ وِدَاعاً (ف) بمعنی اُتْرُکْ یعنی چھوڑ۔ اِدَّعَتْ: دعویٰ کیا، ماضی معروف، واحد مؤنث غائب، از اِدِّعَاءٌ (باب افتعال)۔ اَلنَّصَارٰی: نصرانی کی جمع، عیسائی، عیسائی کو نصرانی اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (ہم دین خدا کے مددگار ہیں) یا اس وجہ سے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم راہ ''ناصرہ'' یا ''نصران'' نامی گاؤں میں رہے۔ وَاحْکُمْ: حکم لگا، وَاحْکُمْ مَدْحاً: مدح وستائش کر۔ اِحْتَکِمْ: امر حاضر از احتکام بمعنی مضبوطی سے قائم رہنا، یا حکمت کی رعایت کرنا، یا مضبوطی کے ساتھ فیصلہ کرنا۔

تشریح: اس سے پہلے والے شعر میں یہ کہا گیا تھا کہ ''آپ ﷺ کی خوبیوں میں کوئی شریک وسہیم نہیں''، جس سے کسی عامی اور جاہل انسان کے ذہن میں یہ وہم پیدا ہوسکتا تھا کہ نعوذ باللہ حضور اکرم ﷺ اللہ ہیں یا اللہ کی طرح ہیں، لہٰذا اس شعر میں ایسے لوگوں کا وہم دور کرتے ہوئے اور اسلام کا صحیح اور متوازن عقیدہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہنا، اس کے سوا جو بھی مدح وستائش آپ کی شان کے لائق ہے اسے کرسکتے ہو، اس شعر میں ایک مشہور حدیث کی جانب اشارہ ہے حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں:

لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى الْمَسِيْحَ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ.

(میری تعریف میں اس قدر مبالغہ نہ کرو جیسے عیسایوں نے حضرت عیسیٰ مسیح کی تعریف میں کیا، ہاں! مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو)۔

''نَبِیُّھُمْ'' سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم ہیں اور نبی کی اضافت نصاریٰ کی طرف کرنے میں ان کی تردید مقصود ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا نبی بھی مانتے ہیں اور انہیں ''اِلٰہ'' اور معبود بھی کہتے ہیں، یہ نری حماقت ہے، کیوں کہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو

نبی ہوتا ہے وہ معبود اور الٰہ نہیں ہوتا۔

محاسن بلاغت: (۱) دَعْ اور اِدَّعَتْہُ کے درمیان جناس شبہ اشتقاق ہے، (۲) اُحْکُمْ اور اِحْتَکِمْ کے درمیان صنعت اشتقاق ہے، (۳) ان میں سے ایک کو شعر کے آخر میں اور دوسرے کو مصرع ثانی کی ابتدا میں لانے میں صنعت رد العجز علی الصدر ہے، (۴) اس شعر میں صنعت تلمیح بھی ہے۔

(۴۴)

وَانْسُبْ اِلٰی ذَاتِہٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ
وَانْسُبْ اِلٰی قَدْرِہٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمٍ

ترجمہ: آپ کی ذاتِ کریم کی طرف جس شرف وعزت کو چاہے منسوب کر اور آپ کے رتبۂ بلند کی جانب جو عظمت تو چاہے منسوب کر۔

لغات: اُنْسُبْ: (ن) امر حاضر از نسبۃ بمعنی منسوب کر۔ مِنْ: اسم موصول کا بیان ہے۔
شَرَف: عزت وکرامت، شرافت وبزرگی۔ قَدْرٌ: درجہ ومرتبہ۔ عِظَم: عظمۃ کی جمع۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب تجھے معلوم ہو چکا کہ سرکارِ اقدس ﷺ باعثِ تخلیق عالم ہیں اور انبیائے کرام کو جو بھی اوصاف وکمالات حاصل ہیں وہ سب اسی آفتابِ فیوض وبرکات کے پرتو، اسی بحر جود وسخا کا ایک چلّو اور اسی باران رحمت کا ایک قطرہ ہیں اور آپ کی ذات الوہیت اور معبودیت کے سوا تمام ظاہری وباطنی محاسن اور صوری ومعنوی کمالات کی جامع ہے، تو ان کی ذات سراپا قدس کی جانب جس شرف وکرامت کو تو چاہے منسوب کر سکتا ہے، مثلاً آپ متناسب الاعضا تھے، جسم کی رنگت سرخ وسفید تھی، جسم پیکر طہارت ونظافت تھا، اصل پاکیزہ اور صاف تھی، زبان فصیح وبلیغ تھی، کلام شیریں اور موثر ہوتا تھا، عقل اور سمجھ اوجِ کمال پر تھی، ذہانت بے مثل وبے مثال تھی اور اس کے علاوہ جو بھی محاسن وکمالات کسی مخلوق میں ہو سکتے ہیں آپ کی ذات سب کا پیکر محسوس تھی، یوں ہی آپ کے رتبۂ بلند کی جانب تمام صفاتِ عظمت کو منسوب کر سکتا ہے، مثلاً آپ جود وسخا، حلم ووفا، اخلاص وایثار،

صدق وصفا وغیرہ اوصاف حمیدہ کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔

شعر کے پہلے مصرع میں "شرف" اور دوسرے مصرع میں "عظمت" اس لیے ذکر کیا کہ شرف وعزت کی نسبت ذات کی طرف ہوتی ہے اور عظمت وبلندی کی نسبت صفات کی طرف

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں صنعتِ مماثلہ ہے۔

فَاِنَّ فَضلَ رَسُولِ اللّٰہِ لَیسَ لَہٗ
حَدٌّ فَیُعرِبَ عَنـــہُ نَاطِقٌ بِفَـمٖ (۴۵)

ترجمہ: کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے فضل وکمال کی کوئی حد نہیں کہ کوئی بولنے والا اسے اپنی زبان سے بیان کر سکے۔

لغات: فَاِنَّ: فا برائے تعلیل ہے۔ فَضل: کمال (ج) فُضُول۔ یُعرِبُ عَنہُ: مضارع معروف از اعراب بمعنی ظاہر کرنا، بیان کرنا۔ نـــاطِقٌ: متکلم، بولنے والا اور فَیُـعرِبَ میں فا کے بعد "اَن" ناصبہ مقدر ہے، کیوں کہ وہ نفی کا جواب ہے۔

تشریح: حضور اقدس ﷺ کے فضائل وکمالات کی کوئی حد ونہایت نہیں اور ایسا کیوں کر نہ ہو جب کہ آپ کے کمالات برابر بڑھ رہے ہیں اور ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

وَلَلاٰخِرَۃُ خَیرٌ لَّکَ مِنَ الاُولیٰ ○ (والضحیٰ آیت ۴)

(اور یقیناً آنے والی گھڑی آپ کے لیے پہلی والی گھڑی سے بہتر ہے)۔

صدر الافاضل علامہ نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"آنے والے احوال آپ کے لیے گزشتہ سے بہتر وبرتر ہیں، گویا حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ روز بروز آپ کے درجے بلند کرے گا اور عزت پر عزت اور منصب پر منصب زیادہ فرمائے گا اور ساعت بہ ساعت آپ کے مراتب ترقیوں میں رہیں گے" (خزائن العرفان، سورہ والضحیٰ)۔

اسی بنا پر علمائے اسلام اور صوفیہ طریقت فرماتے ہیں کہ: اس دنیا سے حیاتِ

ہونی کے منقطع ہوجانے کے بعد بھی آپ کی روحانی ترقیات جاری ہیں اور تا قیامت
جاری رہیں گی، ہر عاقل جانتا ہے کہ حد وانتہا اس چیز کی ہوتی ہے جو ایک جگہ رک جائے
اور تکمیل پاجائے، یہاں تو ترقیوں کا کارواں پیہم سفر پر ہے، اس لیے آپ کے فضل وکمال
کی کوئی حد کیوں کر ہوسکتی ہے؟ اور کوئی انسان کما حقہٗ آپ کی مدح وثنا کیسے کرسکتا ہے؟ سچ
کہا ہے کسی عارف باللہ نے:

لَایُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اے رضا خود صاحبِ قرآں ہے مداحِ حضور
تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

(۴۶)

لَوْنَاسَبَتْ قَدْرَہٗ اٰیَاتُہٗ عِظَماً
اَحْیَی اسْمُہٗ حِیْنَ یُدْعٰی دَارِسَ الرِّمَمِ

ترجمہ: اگر آپ کے معجزات عظمت ورفعت میں آپ کی شان رفیع کے مطابق ہوتے تو آپ کا نام پاک جوں ہی لیا جاتا بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دیتا۔

لغات: نَاسَبَتْ: ماضی معروف، صیغہ واحد مؤنث غائب، از مناسبۃ بمعنی مطابق ہونا۔ قَدْرَہٗ: آپ کی قدر ومنزلت (ج) اقدار۔ آیات: معجزات، آیۃ کی جمع۔ عِظَماً: عظمت وبلندی کے اعتبار سے۔ دَارِس: اسم فاعل از درس دُرُوساً (ن) بمعنی مٹنا، بے نشان ہونا (ج) دَوَارِسُ۔ الرِّمَمْ: رِمَّۃٌ کی جمع، بوسیدہ ہڈیاں "دَارِسَ الرِّمَمِ" میں اضافت از قبیل اضافۃ الصفۃ الیٰ الموصوف ہے یعنی الرِّمَمُ الدَّارِسَۃُ۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قدر ومنزلت کی بلندی آپ کے معجزات سے کہیں بڑھ کر ہے، اگر آپ کی عظمتوں کے برابر آپ کے معجزات ہوتے تو جب بھی آپ کا

اسمِ مبارک پڑھ کر مردوں پر دم کیا جاتا وہ فوراً زندہ ہو جاتے اور آپ کے اسمِ پاک میں مردے جلانے کی تاثیر ہوتی، مگر ایسا نہیں ہے، البتہ خود سرکار اقدس ﷺ کا اپنی حیاتِ ظاہری میں مردوں کو جلانا احادیث سے ثابت ہے۔

علامہ قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمہ شفا شریف میں روایت کرتے ہیں کہ: حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ ایک شخص بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے اپنی بیٹی کو زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق فلاں وادی میں پھینک دیا، حضور! اس کو زندہ فرمادیں، سرکارِ اقدس ﷺ اس کے ساتھ اس وادی میں تشریف لے گئے اور اس کا نام لے کر بلایا یَا فُلَانَۃُ! اللہ کے اذن سے مجھے جواب دے، تو وہ قبر سے باہر نکل آئی اور کہہ رہی تھی لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ، حضور نے فرمایا: تیرے ماں باپ دونوں مسلمان ہوگئے ہیں، اگر تجھے پسند ہو تو تجھے ان کے پاس بھیج دوں، اس نے کہا مجھے ماں باپ کی ضرورت نہیں، میں نے اپنے رب کو ان سے زیادہ کریم وشفیق پایا۔

ابن عدی، ابن ابی الدنیا، بیہقی، ابونعیم ان تمام جلیل القدر محدثین کرام نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس صُفّہ میں رہا کرتے تھے، ایک روز ایک بوڑھی خاتون جو نابینا تھی ہجرت کر کے سرورِ کائنات ﷺ کے قدموں میں حاضر ہوئی، اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا جس کا عنفوانِ شباب تھا، کچھ دن گزرے کہ مدینہ کی وبا نے اس کو بستر علالت پر ڈال دیا، چند دن بیمار رہا، پھر اس کی روح قبض کر لی گئی، حضور نے اس کی وفات کے بعد اس کی آنکھیں بند کیں اور ہمیں حکم دیا کہ ہم اس کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کریں، جب ہم نے اس کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے انس! اس کی ماں کے پاس جاؤ اور اس کو اس کے بیٹے کی وفات کی اطلاع دو، میں گیا اور اس بوڑھی ماں کو اس کے بیٹے کی وفات کی اطلاع دی، وہ آئی اور اپنے بیٹے کے قدموں کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے، پھر اس نے لوگوں سے

پوچھا کہ کیا میرا بیٹا واقعی وفات پا گیا ہے؟ لوگوں نے کہا: بے شک، اب اس نے بارگاہِ الٰہی کی جانب متوجہ ہو کر عرض کیا:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ اَنِّي اَسْلَمْتُ عَلَيْكَ طَوْعاً وَخَلَعْتُ الْاَوْثَانَ زُهْداً وَهَاجَرْتُ اِلَيْكَ رَغْبَةً، اَللّٰهُمَّ لَا تُشْمِتْ عَبَدَةَ الْاَوْثَانِ وَلَا تَحْمِلْنِي فِيْ هٰذِهِ الْمُصِيْبَةِ مَا لَا طَاقَةَ لِيْ.

(اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں بہ خوشی اسلام لائی ہوں اور بتوں سے بے زار ہو کر ان کی بندگی کا پٹا اپنے گلے سے اتار پھینکا ہے اور میں تیری رحمت کی جانب راغب ہو کر تیرے دربار میں حاضر ہوئی ہوں، اے اللہ! میرے بچے کی موت سے بتوں کے پجاریوں کو خوش ہونے کا موقع نہ دے اور مجھ پر اس مصیبت کا بوجھ نہ ڈال جس کے اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں)۔

جوں ہی اس نے اپنی التجا ختم کی تو بچے نے اپنے پاؤں ہلائے اور اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی، اس کے بعد وہ کافی عرصہ زندہ رہا، یہاں تک کہ حضور ﷺ نے وصال فرمایا اور اس کی والدہ راہی ملکِ بقا ہو گئیں۔ (حیاۃ الرسول، ج۱، ۴۷۰، الشفا، ج۱، ص۴۴۹، ۴۵۰)۔

اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے گھر دعوت کے موقع پر بکری کے بچہ کو زندہ فرمانا اور سرکار کے والدین کریمین کا آپ کی دعا کی برکت سے زندہ ہونا پھر آپ پر ایمان لانا اور اس طرح کے متعدد واقعات کتبِ دلائل و معجزات میں منقول ہیں، جن سے آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہے کہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آپ کی حیاتِ ظاہری میں مردوں کو جِلا نے کا معجزہ ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار ظہور میں آیا، البتہ آپ کے وصال فرمانے کے بعد آپ کے اسمِ مبارک میں یہ معجزانہ تاثیر اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھی۔

بعض شارحین نے یوں شرح کی کہ آیات سے مراد سرورِ کائنات ﷺ کے اسمائے مبارک ہیں اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر آپ کے اسمائے مقدسہ عظمت و رفعت میں آپ کی

قدر و منزلت کے مطابق اور مشابہ ہوتے تو جیسے مسمیٰ یعنی ذات بابرکات سے احیاء موتیٰ (مردے جلانے) کا معجزہ ظہور میں آیا ایسے ہی اسم مبارک سے مردہ تو کیا مرزی گلی ہڈیوں میں جان آ جانی چاہیے تھی۔

کچھ لوگوں سے اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے یہ کہا کہ حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اس شعر میں سرکار اقدس ﷺ سے مطلقاً احیائے موتیٰ کے معجزہ کے ظہور کا انکار کیا ہے، انہوں نے امام بوصیری پر اعتراض کیا کہ ان کا یہ شعر آنے والے درج ذیل شعر کے مخالف ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں:

وَكُلُّ آيٍ اَتَى الرُّسْلُ الْكِرَامُ بِهَا   فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهِ بِهِمِ

(یعنی تمام رسولان عظام سے جن معجزوں کا ظہور ہوا وہ سب آپ ہی کے نور سے ان کو ملے ہیں)۔

تو درحقیقت معجزۂ احیاء موتیٰ ہمارے نبی ہی کا معجزہ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو یہ ہمارے نبی کے پرتو سے ملا ہے۔

ایسے لوگوں پر تنقید کرتے ہوئے علامہ عمر بن احمد خرپوتی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

ومن فهم من هذا البيت ان مراد الناظم ان احياء الموتى لم يعط له عليه الصلوة والسلام اصلاً فقال معترضاً على الناظم ان هذا البيت مخالف لما سيأتي من قوله: وكل آي اتى الرسل الخ إذ يفهم منه ان احياء الموتى اعطى اليه عليه السلام اذ كان معجزة لعيسى عليه السلام وهذه المعجزة اتصلت الى عيسى عليه السلام من نور نبينا عليه الصلوة والسلام انتهى. فقد خبط خبط عشواء، وركب متن عمياء، اذ ليس مراد الناظم انه لم تعط عليه السلام بعد وفاته الى يوم القيامة والا فهو عليه السلام جامع لجميع المعجزات التي ظهرت في ايدي سائر الانبياء مع معجزات خاصة به عليه الصلوة والسلام (عصيدة الشهدة شرح قصيدة البردة ص ۹۶)

ترجمہ: (جس نے اس شعر کا یہ مطلب سمجھا کہ اِحیاے موتیٰ کا معجزہ سرکارِ اقدس ﷺ کو عطا نہیں کیا گیا، پھر ناظم قصیدہ حضرت بوصیری پر یہ اعتراض جڑ دیا کہ یہ شعر آنے والے درج ذیل شعر کے خلاف ہے، وَ كُلُّ آيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا الخ کیوں کہ اس شعر سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مردوں کو جلانے کا معجزہ سرکار کو عطا ہوا تھا، کیوں کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا اور یہ معجزہ انہیں ہمارے نبی ﷺ کے نور کے پرتو سے ملا ہے، جس نے بھی شعر کا وہ مطلب سمجھ کر اعتراض کیا اس نے بے ہدایت اور بے بصیرت کام کیا، ناظم قصیدہ کی اس شعر سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ حضور کو معجزۂ اِحیاے موتیٰ عطا نہیں ہوا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ معجزہ بعد وصال حضور کو قیامت تک کے لیے نہیں دیا گیا، ورنہ تو آپ کی ذاتِ مقدسہ ان تمام خوارق و معجزات کی جامع ہے جو دیگر انبیاے کرام کو عطا کیے گئے، ساتھ ہی کچھ معجزات ایسے بھی عطا ہوے جو آپ کے ساتھ خاص تھے)۔

رہ گئی یہ بات کہ بعد وفات اِحیاے موتیٰ کا معجزہ سرکار کو کیوں نہ عطا ہوا تا کہ حضور کے نام نامی کی برکت سے جب چاہتے مردہ زندہ کر لیتے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ معجزہ بعد وفات بھی ظہور میں آتا رہتا تو بعد میں ایمان لانے والوں کا ایمان، ایمان بالمشاہدہ ہو جاتا اور امت محمدیہ کو ایمان بالغیب کی نعمت لازوال نہ ملتی، جب کہ قرآن کریم میں ایمان بالغیب کی بنا پر مومنین کی مدح آئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۞ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (البقرہ: آیت ۲،۳)۔

ترجمہ: (وہ بلند رتبہ کتاب، کوئی شک کی جگہ نہیں، اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو، وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں)۔

اور ایمان بالغیب بہر حال ایمان بالمشاہدہ سے افضل و بہتر ہے، اسی بنا پر وفات

کے بعد قیامت تک کے لیے یہ معجزہ مخفی رکھا گیا۔

محاسن بلاغت: (۱) الرِّمَمُ سے بطور مجاز مرسل مردہ مراد ہے، کیوں کہ جز یعنی الرِّمَم بول کر کل یعنی میت مرادلیا گیا۔

لَمْ يَمْتَحِنَّا بِمَا تَعْيَى الْعُقُوْلُ بِهٖ
حِرْصًا عَلَيْنَا فَلَمْ نَرْتَبْ وَلَمْ نَهِمِ (۴۷)

ترجمہ: انہوں نے ہماری بھلائی کے پیش نظر ایسے دین اور شریعت سے ہمیں امتحان میں نہ ڈالا جس کے فہم سے عقلیں عاجز ہوں، یہی وجہ ہے کہ ہم کسی شک اور وہم کا شکار نہ ہوئے۔

لغات: لَمْ يَمْتَحِنَّا: نفی جحد بلم، از امتحان بمعنی آزمانا، آزمائش میں ڈالنا، ''نَا'' ضمیر منصوب متصل، مفعول بہ۔ تَعْيَى: مضارع معروف از عَيِيَ يَعْيٰى عَيًّا وَعَيَاءً (س) بمعنی عاجز وقاصر ہونا۔ حِرْصًا عَلَيْنَا: اَیْ عَلٰى هِدَايَتِنَا ، لَمْ يَمْتَحِنْ کا مفعول لہٗ ہونے کے بنا پر منصوب ہے۔ لَمْ نَرْتَبْ: نفی جحد بلم از اِرْتِيَاب بمعنی شک کرنا۔ لَمْ نَهِمْ: نفی جحد بلم از وَهَمَ يَهِمُ وَهْمًا (ض) بمعنی وہم ہونا، شبہ ہونا، غلط خیال ہونا، یا از هَامَ يَهِيْمُ هَيْمًا وَهَيَمَانًا (ض) بمعنی حیران وسرگرداں ہونا، پریشان ومتردد ہونا۔

تشریح: شعر کا مطلب یہ ہے کہ سرکارِ اقدس ﷺ برابر اس فکر میں رہتے کہ ہماری امت ایمان لے آئے اور راہِ راست پر آجائے، اسی بنا پر آپ جو دین لے کر تشریف لائے وہ خالص انسانی مذاق سلیم اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، اس میں نہ محیر العقول قسم کے معمے ہیں نہ ناقابل عمل قسم کے مجاہدات کا حکم ہے کہ انسان کی قوت اور فہم سے بالا امتحان ہوتا، جس پر دو چار ہی پورے اتر پاتے، یا بالکل کوئی انسان بھی کامیاب نہ ہوتا، بلکہ آپ جو دین لائے وہ عملی ہے، سمجھ میں آنے والا ہے اور ہر شخص کے لیے قابل عمل ہے، کوئی فکر یا کوئی عقل خواہ کسی پیمانے کی ہو سب اس کو سمجھ سکتے ہیں، کوئی پیچیدہ فلسفہ نہیں ہے جس کو چند بہت اعلیٰ درجے کے ذہین انسان تاویلوں کے ذریعہ سمجھ سکیں اور پوری انسانی آبادی اس کے فہم سے

عاری ہو، ارشاد رسالت ہے:

تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْمَحَجَّةِ الْبَيْضَاءِ، لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا.

(ہم نے تمہیں ایسے راستے پر چھوڑا ہے جو اتنا روشن اور صاف ہے کہ اس کی راتیں بھی دن کی طرح تاباں و درخشاں ہیں)۔

اسی لیے دین اسلام کو دین حنیف بھی کہتے ہیں، کہ سیدھا، قابل فہم، قابل عمل دین ہے۔

امام بوصیری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہمیں ایسا دین اور ایسی شریعت عطا فرمائی جس کے سمجھنے، قبول کرنے اور جس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمیں کسی امتحان سے نہیں گزرنا پڑا، اسی لیے نہ ہم شک و وہم میں مبتلا ہوے اور نہ راہ سے بھٹکے۔

محاسن بلاغت: (۱) "حرصا علینا" میں ایجاز حذف ہے، کیوں کہ اصل عبارت "حرصا علیٰ هدایتنا" ہے۔

(۴۸)

اَعْيَى الْوَرٰى فَهْمُ مَعْنَاهُ فَلَيْسَ يُرٰى
لِلْقُرْبِ وَالْبُعْدِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْفَحِمٖ

ترجمہ: آپ کی حقیقت کے ادراک نے ساری خلقت کو عاجز کر دیا تو دور و نزدیک کہیں ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو عاجز و درماندہ نہ ہو۔

لغات: اَعْيٰى: عاجز کر دیا، فعل ماضی معروف از اِعْيَاءٌ بمعنی عاجز و درماندہ کرنا۔ اَلْوَرٰى: مخلوق، معنیٰ: حقیقت (ج) معانی۔ مُنْفَحِمٌ: دلیل سن کر عاجز یا لا جواب ہو جانے والا۔

تشریح: اس شعر کا گزشتہ شعر سے معنوی ربط یہ ہے کہ گزشتہ شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا لایا ہوا دین قابل فہم اور قابل عمل ہے، جس میں انسان کو شک و وہم اور تردد نہیں ہوتا، اس میں کوئی بات معمہ نہیں، جس سے کسی ظاہر بین کو یہ وہم ہو سکتا تھا کہ آپ ﷺ کی حقیقت اور کمالات باطنی کا ادراک بھی ایسے ہی آسان ہوگا، اس شعر میں اس وہم کا ازالہ فرماتے ہوے امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جہاں تک آپ کے دین کا تعلق

ہے وہ تو قابل فہم وادراک ہے، لیکن آپ کی ظاہری وباطنی بلندیوں، آپ کے صوری و معنوی کمالات کی تہ تک رسائی اور آپ کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور آپ کی حقیقت کے ادراک ومعرفت سے ساری خلقت عاجز ہے تو ساری مخلوق میں کہیں کوئی نظر نہیں آتا جو عاجز ودرماندہ نہ ہو، خواہ اس کا زمانہ آپ کے زمانے سے قریب ہو یا دور، یعنی صحابی اور غیر صحابی سبھی اس میں برابر کے شریک ہیں، اسی بنا پر آپ نے اپنے سب سے چہیتے اور قریب ترین صحابی اور یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

یا ابا بکر! لَمْ یَعْرِفْنِي حَقِیْقَةً غَیْرُ رَبِّي.

(اے ابوبکر! مجھے حقیقتاً میرے رب کے سوا کسی نے نہیں پہچانا)۔

یوں ہی وہ آپ ﷺ سے دور کسی جگہ کا رہنے والا ہو یا قریب کا، یعنی مکی ومدنی اور ان کے سوا دیگر شہروں کے باشندے، سبھی آپ کی حقیقت کی معرفت سے قاصر ہیں، یوں ہی وہ قدر ومنزلت اور رتبہ کے لحاظ سے آپ سے قریب ہو یا دور، یعنی رسولان اولوالعزم، ملائکہ مقربین، حاملین عرش اور عوام الناس سبھی اس عموم میں شامل ہیں۔

امام بدرالدین زرکشی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

لھٰذا لم یتعاط فحول الشعراء المتقدمین کأبي تمام والبحتري وابن الرومي مدحه علیه السلام مع کونهم مسومین بالفصاحة والبلاغة بین الأنام؛ لأن مدحه علیه السلام کان من اصعب ما یحاولونه فان المعاني دون مرتبته والأوصاف دون وصفه وکل علو في حقه تقصیر فیضیق علی البلیغ وصفه. (عصیدة الشهدة ص ۹۵)

(اسی بنا پر ابوتمام، بحتری اور ابن رومی جیسے بلند پایہ قادرالکلام شعرائے متقدمین نے فصاحت وبلاغت میں نمایاں اور ممتاز ہونے کے باوجود سرکار کی نعت نہیں لکھی، کیوں کہ نعتِ نبوی ان اصناف میں سب سے مشکل ترین ہے، جن میں شعرا طبع آزمائی کرتے ہیں،

(مطلب یہ ہے کہ سارے معانی سرکار کے رتبہ سے اور سارے اوصاف آپ سے مختص ہیں اور ہر رفعت و بلندی آپ کے حق میں کوتاہی اور کمی ہی کے مترادف ہے۔ اس کا دائرہ وسیع ہے، صاحبِ زبان انسان کو بھی اس کا بیان کرنا دشوار ہوتا ہے)۔

علامہ قرطبی "تذکرہ" میں فرماتے ہیں:

لم یظهر کمال حسنه علیه السلام والا لما اطاقت اعین الصحابة رضی الله تعالیٰ عنهم النظر الیه. (حوالہ سابق)

(ترجمہ: حضور کا کمال حسن ظاہر ہی نہیں ہوا، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی آنکھوں میں تاب نہ تھی کہ آپ کی طرف دیکھ سکتے)۔

محاسن بلاغت: (۱) "وریٰ" اور "یریٰ" کے درمیان تجنیس لاحق ہے۔ (۲) "اغنی" کی اسناد "فهم معناه" کی جانب مجاز عقلی ہے کیوں کہ تقدیر عبارت "اغنی اللّٰہُ الوریٰ عن فهمِ مَعْنَاهُ" ہے۔

(۴۹)

كَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَيْنَيْنِ مِنْ بُعُدٍ
صَغِيْرَةً وَتُكِلُّ الطَّرْفَ مِنْ اَمَمٍ

ترجمہ: جیسے سورج دور سے آنکھوں کو چھوٹا نظر آتا ہے اور قریب سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

لغت: تُكِلُّ: تھکا دیتا ہے اور خیرہ کر دیتا ہے، مضارع معروف از اِکلال بمعنی تھکا دینا، عاجز کر دینا۔ الطَّرْف: آنکھ (ج) اَطْرَاف۔ اَمَم: قرب، نزدیکی۔

تشریح: یہ شعر معنوی حیثیت سے شعر سابق سے مربوط ہے، یعنی ساری مخلوق دور کی ہو یا نزدیک کی، سرورِ کائنات ﷺ کی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہے، اس طرح آپ کی مثال بلحاظ ظہور آفتاب کی سی ہے جو زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا بتایا جاتا ہے، مگر اس کی حقیقت کا صحیح ادراک مشکل ہے، اگر دور سے دیکھو تو گول شیشے یا ڈھال کے برابر نظر آتا

ہے اور قریب سے دیکھنے کی کوشش کرو تو آنکھیں خیرہ ہو جائیں، لہٰذا باوجود کمال ظہور کے اس کی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا، گو دور سے دکھائی دیتا ہے، اسی طرح سرکار مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا، اگرچہ آپ کے کمالات واوصاف کی صورت مشاہدہ میں آتی ہے، اس مفہوم کو امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے ''قصیدۂ ہمزیہ'' میں یوں ادا فرمایا ہے:

اِنَّمَا مَثَّلُوْا صِفَاتِکَ لِلنَّاسِ کَمَا مَثَّلَ النُّجُوْمَ الْمَاءُ

ترجمہ: (انہوں نے لوگوں کو صرف آپ کے اوصاف کی صورت دکھائی ہے، جس طرح پانی ستاروں کی صورت دکھا دیتا ہے)۔

یعنی حضور اکرم ﷺ کے جو اوصاف، حلیہ نگاروں نے بیان کیے ہیں وہ دراصل آپ کے اوصاف کی حقیقت نہیں، کیوں کہ آپ کی ذاتِ مقدسہ ہی کی طرح آپ کی صفات کی حقیقت بھی بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اس کی مثال پانی اور ستاروں کی سی ہے، پانی میں صرف ستاروں کی صورت نظر آتی ہے مگر وہ صورت ستاروں کی حقیقت نہیں۔

محاسن بلاغت: (۱) ''کَالشَّمْسِ'' میں ایجاز حذف ہے، کیوں کہ تقدیر عبارت ''ھُوَ کَالشَّمْسِ'' ہے، (۲) اور یہ تشبیہِ مرسل ہے، (۳) ''بُعد'' اور ''اَمَم'' کا اجتماع طباق ایجاب ہے۔

(۵۰)
وَکَیْفَ یُدْرِکُ فِي الدُّنْیَا حَقِیْقَتَهٗ
قَوْمٌ نِیَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

ترجمہ: وہ خوابیدہ افراد آپ کی حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں جنہوں نے ایک تصور وخیال سے ہی تسلی کر لی ہے۔

لغات: کَیْفَ: استفہام انکاری کے لیے ہے۔ نِیَامٌ: نائم کی جمع، سونے والے۔ تَسَلَّوْا عَنْهُ: ماضی معروف از باب تفعل، تسکین پا گئے۔ الحُلُمُ: خواب، تصور وخیال (ج) اَحلام۔

تشریح: اس شعر میں ''حلم'' سے مراد یا تو تصور وخیال ہے، تو مطلب یہ ہوگا وہ خوابیدہ

افراد آپ کی حقیقت اور قدر و منزلت کا کما حقہٗ ادراک کیسے کر سکتے ہیں جنہوں نے احادیث میں آپ کا حلیہ پڑھا یا سنا اور اس سے سرکار کے حلیہ کا ایک تصور و خیال ان کے ذہن و دماغ میں رچ بس گیا اور اسی سے انہیں تسلی مل گئی، کیوں کہ احادیث و سیر کی کتابوں میں سرکارِ اقدس ﷺ کے حسن و جمال اور فضل و کمال کا ایک اجمالی خاکہ پیش ہوا، آپ کی قدر و منزلت سے اس کے بیان کرنے والے خود کما حقہٗ واقف نہیں۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''حُلم'' کو خواب کے معنی میں لیا جائے تو شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ خوابیدہ افراد سرکار کی قدر و منزلت سے کما حقہٗ کیسے واقف ہو سکتے ہیں جنہوں نے سرکار کا خواب میں دیدار کیا اور اسی پر تسلی کر لی، کیوں کہ خواب میں اگر چہ سرکار علیہ السلام کا دیدار مومنین صالحین کو نصیب ہوتا ہے اور یہ حدیث سے ثابت ہے:

مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَآنِي حَقًّا.

(جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے واقعتاً مجھی کو دیکھا)۔

اور دوسری روایت میں ہے:

مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَاى الْحَقَّ، فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي.

(جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے سچ مچ مجھی کو دیکھا، کیوں کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا)۔

لیکن خواب دیکھنے والا سرکار کی صورت ظاہری کا ایک اجمالی خاکہ ہی دیکھ پاتا ہے، آپ کی حقیقت کا صحیح ادراک جب بیداری میں بار بار قریب سے دیکھنے والے صحابہ کو نہیں ہوا تو خواب میں چند لمحوں کے دیدار سے کیسے ہوسکتا ہے۔

دونوں صورتوں میں شعر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقیقت کا ادراک صحیح معنوں میں کسی کو نہیں ہوسکتا، البتہ آخرت میں آپ کی قدر و منزلت کی حقیقت سب پر کھل جائے گی، کیوں کہ وہاں سب کی بصیرت اور بصارت کامل ہو جائے گی،

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

النَّاسُ نِیامٌ فَاِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوْا.

(سب لوگ نیند میں ہیں، جب مریں گے تو جاگ اٹھیں گے)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں نِیَام اور حُلُم کا اجتماع مراعاۃ النظیر ہے، (۲) اور اس میں حدیث پاک النَّاسُ نِیامٌ فَاِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوْا کی جانب تلمیح ہے۔

(۵۱)

فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِیْهِ اَنَّهُ بَشَرٌ
وَاَنَّهُ خَیْرُ خَلْقِ اللّٰهِ کُلِّهِمِ

ترجمہ: تو حضور ﷺ کے بارے میں لوگوں کے علم کی انتہا یہی ہے کہ آپ انسان ہیں اور خلق خدا میں سب سے بہتر ہیں۔

لغات: مَبْلَغ: منتہیٰ، آخری حد، جہاں تک رسائی ہو (ج) مَبالِغ۔ خَلْق: مخلوق۔

تشریح: مصرعِ اول میں آپ کو بشر کہنا ذات اور شخصیت کے اعتبار سے ہے اور مصرعِ ثانی میں آپ کو خلق خدا میں سب سے افضل و بہتر کہنا صفات کے اعتبار سے ہے، یعنی انسان کو جو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے اس کے اعتبار سے اس کے فہم وادراک کی پرواز جہاں تک ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ آپ کی ذات انسانوں میں سے ایک ذات ہے، آپ جنوں یا فرشتوں یا دیگر مخلوقات میں سے نہیں ہیں اور آپ کی صفت یہ ہے کہ آپ ساری مخلوق خدا میں سب سے افضل واعلیٰ اور بہتر وبرتر ہیں: ع

بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر

اس شعر کے طرز بیان سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ شاید کچھ اور بات کہنا چاہتے ہیں، کیوں کہ فرما رہے ہیں کہ: سرکار کے بارے میں لوگوں کا مبلغ علم تو بس اسی قدر ہے کہ آپ بشر ہیں اور تمام خلق خدا سے افضل و بہتر ہیں، مگر حقیقت میں آپ......؟ اس جملہ اور طرز تعبیر سے یہ وہم ہوتا ہے کہ آپ سرکار کے لیے بشریت سے ماورا کوئی اور درجہ تجویز کرنا چاہتے ہیں، لیکن سابقہ اشعار کے تسلسل اور سیاق و

سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منشا یہ نہیں ہے، بلکہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرکارِ دو جہاں ﷺ کے بارے میں انسانی علم کی پرواز اسی حد تک ہے کہ آپ اپنی ذات کے اعتبار سے بشر اور صفات کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے افضل و برتر ہیں اور اس کے بعد عند اللہ آپ کے درجات کیا ہیں وہ انسان کے علم و ادراک سے باہر ہیں، وہ صرف علمِ الٰہی میں ہیں، ان کا صحیح علم دینے والا خدا جانے اور پانے والے محبوب خدا جانیں۔

علامہ عمر بن احمد خرپوتی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تالیف ''عصیدۃ الشهدة شرح قصیدۃ البردۃ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ جب خواب میں سرورِ کائنات ﷺ کو قصیدہ سناتے ہوئے اس شعر پر آئے تو مصرعِ اول ''فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِيهِ اَنَّهُ بَشَرٌ'' پڑھ کر خاموش ہو گئے، مصرعِ ثانی مجھ سے موزوں نہ ہو سکا، تو سرکار نے فرمایا: پڑھو ''وَاَنَّهُ خَيْرُ خَلْقِ اللّٰهِ كُلِّهِمِ'' تو امام بوصیری نے فوراً یہ مصرع قصیدہ میں شامل کر لیا اور فرطِ شوق سے ہر شعر کے بعد یہ مصرع دہراتے، قصیدۂ بردہ کی ''الشفا'' نامی شرح میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ (ایضا، ص ۴)

محاسن بلاغت: (۱) لفظ ''خَلق'' مجاز مرسل ہے کیوں کہ وہ اصل میں مصدر ہے اور اس سے یہاں اسم مفعول یعنی مخلوق کے معنی مراد ہیں اور معنی حقیقی و مجازی کے درمیان ''تعلق اشتقاقی'' ہے۔

(۵۲) وَكُلُّ آيٍ اَتَى الرُّسْلُ الْكِرَامُ بِهَا
فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهٖ بِهِمِ

ترجمہ: تمام رسولانِ کرام سے جن معجزوں کا ظہور ہوا وہ آپ ہی کے نور سے ان کو ملے ہیں۔

لغات: آيٍ: آیۃ کی جمع ہے، معجزات۔ اَتَى بِهَا: لائے، فعل ماضی از اِتیانٌ: ''بِهَا'' میں باء برائے تعدیہ، مصاحبت کے معنی میں بھی ہو سکتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمام رسولان عظام اپنی امتوں کی ہدایت کے واسطے جو بھی معجزات لے کر آئے اور ان کا اظہار کر کے رشد و ہدایت کا فریضہ سرانجام دیا یہ سب سرکار دو عالم ﷺ کے نور پاک کا پرتو اور آپ کے معجزات کا صدقہ تھے، کیوں کہ نورِ محمدی تمام مخلوقات کی اصل ہے، آسمان و زمین، جنت و دوزخ، لوح و قلم، عرش و کرسی، جن و انس، حور و غلماں اور فرشتے، غرضے کہ دونوں جہان کی ساری چیزیں سرورِ کونین ﷺ کے نورِ پاک سے پیدا ہوئیں، خود انبیاے کرام و رسولان عظام کا وجود بھی سرکار کے نور ہی سے ہوا، جیسا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری ﷺ کی روایت میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، جس کو امام عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، تو پھر تمام انبیاے کرام کے معجزات کیوں کر نہ سرکار کے نور کا پرتو ہوں گے۔

فَإِنَّهُ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا
يُظْهِرْنَ أَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ (۵۳)

ترجمہ: کیوں کہ حضور ﷺ آفتابِ فضل و کمال ہیں اور انبیاے کرام ستارے ہیں جو اسی آفتاب کی روشنی انسانوں کو تاریکیوں میں دکھاتے رہے ہیں۔

لغات: كَوَاكِبَ: کوکب کی جمع، ستارے۔ الظُّلَم: ظلمت کی جمع بمعنی تاریکی۔

تشریح: یہ شعر سابقہ شعر کی تعلیل ہے، امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ اس میں سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سورج سے اور دیگر انبیاے کرام کو ستاروں سے تشبیہ دے رہے ہیں، مطلب یہ کہ حضور ﷺ خورشیدِ فضل و کمال ہیں اور دیگر انبیاے عظام اس خورشید کے نجوم و کواکب، جس طرح سورج سے روشنی حاصل کرنے والے ستارے سورج کی روپوشی میں شبِ تاریک میں چمکتے اور روشنی پھیلا کر ظلمتوں کو کافور کرتے ہیں اور جب سورج اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ آسمان پر آتا ہے تو یہ سب چھپ جاتے ہیں، اسی طرح انبیاے کرام نے سرکار علیہ السلام سے اکتسابِ فیض کیا، جب تک آپ اس فرشِ گیتی پر جلوہ فرما نہ ہوئے وہ آپ سے

حاصل ہونے والے نورِ علم اور نورِ ایمان وہدایت سے کفر وجہالت کی ظلمتوں کو کافور کرتے رہے اور جب آپ تشریف لائے تو وہ سب چھپ چکے تھے۔

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے المواہب اللدنیہ میں سرکار کے ناموں میں ''الشمس'' کو بھی شمار کرایا ہے، فرماتے ہیں:

أما الشمس فسمي بها صلى الله عليه وسلم لكثرة نفعه وعلو رفعته و ظهور شريعته و جلالة قدرهٖ و عظم منزلتهٖ لأنه لايحاط بكماله حتىٰ لايسع الرائي أن ينظر اليه ملأ عينه اِجلالاً لهٗ كما أن الشمس في الرتبة أرفع من أنواع الكواكب لأنها في السماء الرابعة و الانتفاع بها أكثر من غيرها، كمالايخفىٰ، و أيضاً لما كان سائر الكواكب يستمد من نورها ناسب تسميته صلى الله عليه وسلم لأن نور الأنبياء استمد من نورهٖ عليه السلام. (عصیدۃ الشہدۃ ص۱۰۱)

ترجمہ: (''شمس'' (سورج) حضور کا نام پاک اس لیے ٹھہرا کہ کثرتِ منفعت، علوِ رفعت ظہورِ شریعت، جلالتِ قدرت اور رفعتِ قدر ومنزلت میں آپ کا وہ مقام ومرتبہ ہے کہ اس کا صحیح احاطہ کرنا محال ہے، یہاں تک کہ دیکھنے والا تعظیم کی بنا پر حضور کا آنکھ بھر کر مشاہدہ نہیں کرسکتا، جیسے سورج دیگر ستاروں کی بہ نسبت بلند رتبہ ہے کیوں کہ وہ آسمان چہارم سے نور پاشی کرتا ہے اور ستاروں کی بہ نسبت اس سے زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے، نیز چوں کہ سارے ستارے سورج ہی کے نور سے اکتسابِ فیض کرتے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ سرکار کا نام ''شمس'' ہو، کیوں کہ انبیاے کرام کا نور سرکار ﷺ ہی کے نور سے مقتبس ہے۔)

محاسن بلاغت: (۱) سرکار کی شمس سے تشبیہ، تشبیہِ مؤکد ہے، یوں ہی انبیاے کرام کی کواکب سے تشبیہ بھی تشبیہِ مؤکد ہے، (۲) انوار اور ظُلَم کو ایک ہی شعر میں جمع کرنا صنعت طباق ہے، (۳) شمس، کواکب اور انوار کا یک جا ذکر صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے۔

حَتّٰی اِذَا طَلَعَتْ فِی الْاُفُقِ عَمَّ هُدَا
(۵۴)
هَا الْعَالَمِیْنَ وَاَحْیَتْ سَائِرَ الْاُمَمِ

ترجمہ: یہاں تک کہ جب افق کائنات پر وہ آفتاب طلوع ہوا تو اس کی ہدایت سارے جہانوں میں پھیل گئی اور اس نے بہت ساری قوموں کو حیات عطا کر دی۔

لغات: الْأُفُق: آسمان کا کنارہ جو زمین سے ملا ہوا معلوم ہوتا ہے (ج) آفاق۔ عَمَّ: (ن) ماضی معروف از عموم بمعنی پھیلنا، عام ہونا۔ الْأُمَم: امت کی جمع، قومیں۔

تشریح: یہ شعر قصیدۂ بردہ شریف کے بعض نسخوں میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام علامہ ابراہیم باجوری (م۱۲۷۶ھ) نے اپنی شرح بردہ میں ضمناً اسے ذکر کیا ہے، اس پر تفصیلاً کلام نہیں فرمایا، ہم نے اس شعر کو محض اس لیے ذکر کر دیا تا کہ قصیدہ بردہ کے تمام نسخوں کے اشعار جمع ہو جائیں۔

بہر حال یہ شعر مفہوم کے لحاظ سے گزشتہ شعر کا بیان ہے، اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ انبیاے سابقین کے واسطے سے گزشتہ امتوں کے بھی رسول ہیں اور انبیاے سابقین آپ کے نائب وخلیفہ ہیں، ارشاد ربانی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (آل عمران: ۸۱، ۸۲)

ترجمہ: (اور یاد کرو اے محبوب! جب خدا نے عہد لیا پیغمبروں سے کہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تمہارے پاس آئے وہ رسول جو تمہاری کتاب کی تصدیق فرمائے، تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا، پھر فرمایا: کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا؟ سب انبیا نے عرض کی کہ ہم نے اقرار کیا، فرمایا: تو ایک دوسرے

پر گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں، اب جو اس کے بعد پھرے گا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔)

امام ابوجعفر طبری وغیرہ محدثین اس آیت کی تفسیر میں مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کرتے ہیں:

لم يبعث الله نبياً من آدم فمن دونه الا أخذ عليه العهد في محمد صلى الله تعالىٰ عليه وسلم لئن بعث وهو حيٌّ ليؤمننَّ به ولينصرنَّه ويأخذ العهد بذلک علی قومه.

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر آخر تک جتنے انبیا بھیجے سب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں عہد لیا کہ اگر یہ اس نبی کی زندگی میں مبعوث ہوں تو وہ ان پر ایمان لائے اور ان کی مدد فرمائے اور اپنی امت سے اس مضمون کا عہد لے۔)

اسی طرح کا مضمون حبر امت، سید المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی منقول ہے۔(رواه ابن جرير و ابن عساكر رضی الله تعالىٰ عنهما)

اسی بنا پر حدیث میں آیا، حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذي نفسي بيده لو أن موسىٰ كان حياًّ اليوم ماوسعهُ الا ّأن يتبعني.

(أخرجه الامام أحمد والدارمی والبيهقی في شعب الايمان عن جابر بن عبدالله رضی الله تعالىٰ عنهما وأبو نعيم في دلائل النبوة واللفظ لهُ عن أمير المومنين عمر الفاروق رضی الله تعالىٰ عنه).

ترجمہ: (قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، آج اگر موسیٰ دنیا میں ہوتے تو میری پیروی کے سوا ان کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوتی۔)

اور یہی وجہ ہے کہ جب قیامت کے قریب حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نزول فرمائیں گے، منصبِ نبوت ورسالت پر رہتے ہوئے حضورِ پُرنور سید المرسلین صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کے امتی بن کر رہیں گے اور حضور ہی کی شریعت پر عمل کریں گے، حضور کے ایک امتی اور نائب حضرت امام مہدی کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

كيف أنتم اذا نزل ابن مريم فيكم و امامكم منكم۔

(أخرجه الشيخان عن ابي هريرة رضى الله عنه)۔

ترجمہ: (کیسا حال ہوگا تمہارا جب ابن مریم تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔)

علامہ ابوالحسن علی بن عبدالکافی سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں ایک عمدہ اور بیش قیمت رسالہ ''التعظيم و المنة في لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّه'' تحریر فرمایا اور اس میں اسی آیت سے ثابت فرمایا کہ ہمارے حضور ﷺ سب انبیا کے نبی ہیں اور تمام انبیا و مرسلین اور ان کی امتیں سب حضور کے امتی ہیں، حضور کی نبوت و رسالت ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے روزِ قیامت تک تمام خلقِ خدا کو عام اور شامل ہے اور حضور کا ارشاد ''كُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ'' (یعنی میں اس وقت نبی تھا جب کہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے) اپنے معنیٰ حقیقی پر ہے، اگر ہمارے حضور ﷺ حضرت آدم و نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں ظہور فرماتے تو ان پر فرض ہوتا کہ آپ پر ایمان لاتے اور آپ کے مددگار ہوتے، اسی کا اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد و پیمان لیا تھا اور آپ کے سید المرسلین ہونے ہی کی بنا پر شبِ معراج تمام انبیا و مرسلین نے حضور کی اقتدا کی اور اس کا پورا ظہور قیامت کے دن اس وقت ہوگا جب حضور کے جھنڈے تلے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک سارے انبیا و مرسلین جمع ہوں گے۔

پھر ذرا غور سے دیکھیے کہ قرآن عظیم نے اس مضمون کو اس آیتِ کریمہ میں کتنے اہتمام اور کتنی تاکیدوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

(۱) سارے انبیا علیہم الصلوٰۃ والثناء معصوم ہیں، وہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی کریں

اس کا احتمال بھی نہیں، تو ان کے حق میں صرف اتنا کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرماتا کہ "اگر وہ نبی تمہارے پاس آئے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا"، مگر صرف اتنے ہی پر اکتفانہ فرمایا، بلکہ ان سے عہد و پیمان لیا، یہ عہد، عہدِ "اَلَسْتُ بِرَبِّکُم" کے بعد دوسرا پیمان تھا جیسے کلمۂ طیبہ میں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ تاکہ ظاہر ہو جائے کہ تمام مخلوق پر پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر ایقان واذعان رکھے، پھر اسی کے برابر محمد ﷺ کے رسول ہونے پر ایمان رکھے۔

(۲) اس عہد و پیمان کو لامِ تاکید کے ذریعہ مؤکد اور پختہ کیا کہ فرمایا: لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (یعنی تم ضرور ضرور اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا)، جس طرح نوابوں سے بیعتِ سلاطین پر قسمیں لی جاتی ہیں، امام سبکی فرماتے ہیں: شاید بیعت پر قسم لینا اسی آیت سے لیا گیا ہے۔

(۳، ۴) اور نونِ تاکید اور وہ بھی نونِ ثقیلہ لا کر تاکید کے ثقل و وزن کو اور دو بالا فرمادیا۔

(۵) پھر اس کے سلسلے میں حد درجہ اہتمام فرمایا کہ حضراتِ انبیاے کرام ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ خود ہی سبقت فرما کر ان سے سوال ہوتا ہے: ءَ اَقْرَرْتُمْ؟ (کیا اس بات کا اقرار کرتے ہو؟) ملاحظہ کیجیے، کس درجہ عجلت اور پختگی مقصود ہے۔

(۶) پھر اسی قدر پر بس نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد ہوا: وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِيْ۔ خالی اس عہد و پیمان کا اقرار ہی نہ کرو بلکہ اس پر میرا بھاری ذمہ بھی لو۔

(۷) "عَلَیْهِ" یا "عَلٰی هٰذَا" کی جگہ "عَلٰی ذٰلِکُم" فرمایا، ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ اسمِ اشارہ بعید مشار الیہ کی رفعت و عظمت کو بتاتا ہے۔

(۸) اس تاکید اور پختگی میں مزید ترقی کرتے ہوئے فرمایا: "فَاشْهَدُوْا" ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ، حالانکہ اقرار کر کے مکر جانا ان پاک، تقدس مآب اور معصوم ہستیوں کا شیوہ نہیں۔

(۹) پختگی کا کمال ملاحظہ کیجیے کہ صرف ان مقدس ہستیوں کی گواہی پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ ارشاد فرمایا: وَاَنَا مَعَکُمۡ مِّنَ الشّٰہِدِیۡنَ o (میں خود بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں)۔

(۱۰) پھر اس عہد و پیان کی پختگی کو نقطۂ کمال تک یوں پہنچایا کہ انبیاے کرام جیسی معصوم ہستیوں کو ایسی زبردست تاکیدوں کے باوجود سخت تہدید بھی فرمادی گئی کہ فَمَنۡ تَوَلّٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ o (اب جو اس اقرار سے پھرے گا فاسق ٹھہرے گا)۔ اللہ! اللہ! اس سرورِ رسولاں کی شانِ عظمت کا اقرار کرانے اور اس پر ایمان لانے کا عہد و پیان کرانے کے سلسلے میں وہی اعلیٰ درجہ کا اہتمام کیا گیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے بارے میں فرمایا کہ معصوم فرشتوں کے بارے میں ارشاد ہوا: وَمَنۡ یَّقُلۡ مِنۡہُمۡ اِنِّیۡۤ اِلٰہٌ مِّنۡ دُوۡنِہٖ فَذٰلِکَ نَجۡزِیۡہِ جَہَنَّمَ ؕ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الظّٰلِمِیۡنَ o

ترجمہ:- جو ان میں سے کہے گا میں اللہ کے سوا معبود ہوں اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے اور ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح میرے نزدیک ایمان کے جزءِ اول ''لا الٰہ الا اللہ'' کی بڑی اہمیت ہے اسی طرح جزءِ دوم ''محمد رسول اللہ'' کی بھی حد درجہ اہمیت ہے، میں سارے جہاں کا خدا کہ ملائکۂ مقربین بھی میری بندگی سے سر نہیں پھیر سکتے اور میرا محبوب سارے عالم کا رسول و مقتدا کہ انبیا و مرسلین بھی اس کی بیعت و خدمت کے محیط دائرے میں داخل ہوئے۔

اسی لیے اکابر علماے اسلام نے لکھا ہے کہ جس کا خدا خالق ہے محمد ﷺ اس کے رسول ہیں، عاشق مصطفےٰ، علامہ محقق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ والرضوان ''مدارج النبوۃ'' میں فرماتے ہیں:

''چوں بود خلق آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اعظم الاخلاق بعث کرد خداے تعالیٰ اورا بسوے کافۂ ناس، ومقصور نہ گردانید رسالت اورا بر ناس، بلکہ عام گردانید

جن وانس را، بلکہ بر جن وانس نیز مقصور نہ گردانید تا آنکہ عام شد تمامہ بعالمین را پس ہر کہ اللہ تعالیٰ پروردگار اوست محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رسول اوست"۔

(چوں کہ آں حضرت ﷺ کی تخلیق ساری تخلیقوں سے بڑھ کر تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف بھیجا، اور آپ کی رسالت صرف انسانوں میں منحصر نہ فرمائی جن وانس دونوں کے لیے عام رکھی، بلکہ صرف جن وانس میں بھی محدود نہ فرما کر سارے جہانوں کے لیے عام فرمائی، تو اللہ تعالیٰ جس کا پروردگار ہے محمد ﷺ اس کے رسول ہیں)۔

مجدد اسلام امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ نے اس مسئلہ کی نہایت شاندار تحقیق اپنے رسالہ "تجلی الیقین بأنّ نبینا سید المرسلین" میں فرمائی ہے، جسے مزید تفصیل درکار ہو وہ اس رسالہ کا مطالعہ کرے۔ کیوں کہ اس مسئلے کی اس سے اچھی تحقیق شاید کسی کتاب میں یک جا نہ مل سکے۔

(۵۵) اَکْرِمْ بِخَلْقِ نَبِیٍّ زَانَہٗ خُلُقٌ
بِالْحُسْنِ مُشْتَمِلٍ بِالْبِشْرِ مُتَّسِمِ

ترجمہ: نبی اکرم ﷺ کی ظاہری صورت کیا ہی خوب ہے، جس میں آپ کے حسن سیرت نے چار چاند لگا دیے ہیں، جو حسن و جمال کے پیکر اور خندہ روئی سے متصف ہیں۔

لغات: اَکْرِمْ: فعل تعجب، کیا ہی خوب ہے۔ خَلْق: ظاہر، صورت۔ خُلُق: سیرت، باطن، اخلاق، (ج) اَخلاق۔ البِشْر: شگفتہ روئی، خندہ پیشانی۔ مُتَّسِم: متصف۔

تشریح: اس شعر کے اندر سرورِ کونین ﷺ کی تین صفتیں ذکر کی گئی ہیں، (۱) حسن صورت (۲) جمال سیرت (۳) خندہ روئی، یعنی سرکار علیہ السلام کی ذات میں حسن صورت کے ساتھ جمالِ سیرت اور خوبیِ اخلاق بھی پائی جاتی تھی اور آپ ہمیشہ شگفتہ روئی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے آپ کے حسن صورت کا ذکر تو متعدد احادیث میں آیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ما رَاَیْتُ اَحسنَ مِن رسول اللّٰہ ﷺ کَانَّ الشمسَ تجریْ فِیْ وَجھِہٖ
(رواہ الترمذی واحمد والبیھقی عن ابی ھریرۃ)

(میں نے سرکار سے بڑھ کر کسی کو حسین وجمیل نہیں دیکھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سورج آپ کے چہرۂ انور میں رواں دواں ہے)۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

کَان رسولُ اللّٰہ ﷺ احسنَ النَّاسِ وجھاً وَ اَحسنُھم خُلُقاً.
(رواہ البخاری ومسلم وغیرھما)

(اللہ کے رسول ﷺ سب سے زیادہ خوب صورت تھے اور سب سے بڑھ کر خوش اخلاق بھی)۔

ابوعبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ربیعہ بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے عرض کی:

صِفِيْ لنا رسولَ اللّٰہ ﷺ۔

(ہمیں سرکار کے حلیے سے آگاہ کیجئے)۔

انہوں نے کہا:

لو رایْتَہٗ لَقُلْتَ الشمسُ طالعۃٌ. (رواہ الدارمی والبیھقی وابونعیم والطبرانی)

(اگر تو حضور کو دیکھتا تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا کہ سورج طلوع ہو رہا ہے)۔

(السیرۃ النبویۃ للعلامۃ زینی دحلان، ج۳،ص۱۹۶)

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ سرکار کا حلیۂ مُبارک میرے سامنے بیان کیجئے، آپ نے جواب دیا:

کان رسولُ اللّٰہ ﷺ فخمًا مفخمًا یتلألأُ وجھُہٗ تلألُأَ القمرِ لیلۃَ البدر.

(شمائل ترمذی ص ۲۳)

(حضور عظیم الشان اور باشوکت تھے اور چہرۂ انور اس طرح چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند)۔

اور آپ ﷺ کے حسنِ سیرت اور خوش اخلاقی کا خطبہ خود قرآن پڑھتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

انَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْمٍ ٥ (القلم:۴)

(بیشک آپ بلند اخلاق پر فائز ہیں)۔

اور آپ کی شگفتہ روئی کا ذکر تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ کی زبان سے سنیے، فرماتے ہیں:

ما رأیتُ أحداً أکثَرَ تبسُّماً مِن رَسُولِ الله ﷺ (رواہ الترمذی)

(میں نے حضور اکرم ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا)۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں:

کان دائِمَ البِشرِ، سَهلَ الخُلقِ، لَیِّنَ الْجانِبِ. (شمائل ترمذی ص ۲۴)

(آپ ہمیشہ خندہ روئی، نرم خوئی، اور نرم دلی کے پیکر رہے)۔

فائدہ: علامہ عمر بن احمد خرپوتی فرماتے ہیں: یہ شعر ان چھ اشعار میں چوتھا شعر ہے جنھیں سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرطِ مسرت سے جھومنے لگے تھے، اس لیے قصیدہ پڑھنے والے پر لازم ہے کہ اس شعر کو کم از کم تین بار دہرائے۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص ۱۰۵)

محاسن بلاغت: (۱) خَلق اور خُلُق کے درمیان تجنیس محرّف ہے۔

(۵۶)

کَالزَّهرِ فِیْ تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِیْ شَرَفٍ
وَالْبَحرِ فِیْ کَرَمٍ وَالدَّهرِ فِیْ هِمَمٖ

ترجمہ: آپ تازگی میں کلی کی مانند ہیں، اوج و رفعت میں ماہ کامل کے مثل، جود و سخا میں سمندر کی طرح، اور عزم و حوصلہ میں زمانہ کی مانند ہیں۔

لغات: الزَّهرُ: کلی، پھول۔ (ج) أزهار۔ تَرَف: لطافت، تازگی۔ البَدْر: چودھویں

رات کا چاند، ماہ کامل۔ (ج) بُدُوْرٌ۔ شَرَف: رفعت وبلندی۔ کَرَم: جودوسخاوت، دریا دلی، فیاضی۔ الدَّھر: زمانہ (ج) دُھُوْر۔ ھِمَم: ھِمَّۃ کی جمع، عزم وحوصلہ، عالی ہمتی۔

تشریح: حضوراکرم ﷺ کی ذات مقدسہ میں تازگی، شرف وبلندی، جودوسخا، عزم وحوصلہ غایت درجہ پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ آپ تازگی اور لطافت میں کلی کی مانند ہیں، شرف وبلندی میں بدر کامل کی طرح، جودوسخاوت میں سمندر کی طرح اور ہمت وپامردی میں زمانہ کی مانند ہیں۔

سرکار کے جسمِ اقدس کی تازگی، لطافت اور نرمی کا اندازہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی درج ذیل روایت سے ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

مَا مَسِسْتُ حَرِيْرًا وَلَا دِيبَاجاً أَلْيَنَ مِنْ كَفِّ النَّبِيِّ ﷺ۔

(میں نے نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک سے زیادہ نرم نہ ریشم کو پایا نہ دیباج کو)۔

سرورِ کونین ﷺ کی سخاوت وفیاضی اس درجہ کمال پر تھی کہ آپ نے کسی سائل کے جواب میں "نہیں" نہیں فرمایا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

مَا سُئِلَ النبيُّ ﷺ عن شَيْءٍ وَقَالَ "لَا". (رواہ البخاری)

(الشفاج ۱ص ۸۲ مطبوعہ بیروت)

(ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبی کریم ﷺ سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ نے جواب میں "نہیں" فرمایا ہو)۔

امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ اس کی ترجمانی یوں فرماتے ہیں:

واہ کیا جود وکرم ہے شہِ بطحا تیرا
"نہیں" سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

مانگیں گے مانگے جائیں گے منہ مانگی پائیں گے
سرکار میں نہ "لا" ہے نہ حاجت "اگر" کی ہے

عربی کا مشہور شاعر فرزدق کہتا ہے:

مَا قَالَ "لَا" قَطُّ اِلَّا فِی تَشَھُّدِہٖ لَوْلَا التَّشَھُّدُ کَانَتْ لَاءُہٗ نَعَمُ

ترجمہ: (میرے ممدوح نے تشہد کے بغیر کبھی "نہیں" نہیں کہا۔ اور اگر تشہد میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنا ضروری نہ ہوتا تو ان کا لا بھی نعم ہوتا)۔ (لا بمعنی نہیں ہے اور نعم بمعنی ہاں)۔

اس مفہوم کی ترجمانی فارسی کے اس شعر میں کی گئی ہے:

نرفت لا بزبانِ مبارکش ہرگز مگر باشھدان لا الٰہ الا اللہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لو ان لی مثل جبال تہامة ذهباً لقسمته بینکم ثم لا تجدونی کذوباً و لا بخیلاً. (سبل الهدی ج ۷ ص ۸۸)

(اگر میرے پاس اتنا سونا ہوتا جتنے تہامہ کے پہاڑ ہیں تو سارے سونے کو میں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا، پھر تم نہ مجھے جھوٹا پاتے، نہ بخیل)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ألا أُخبِرُکم عن الأَجوَدِ، اللّٰهُ الأَجوَدُ وأنا أجودُ وُلدِ آدم.

(سبل الهدی ج ۷ ص ۸۴)

(کیا میں تمہیں یہ نہ بتادوں کہ سب سے زیادہ سخی کون ہے، پھر خود فرمایا، اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سخی ہے اور اولادِ آدم میں سب سے زیادہ سخی میں ہوں)۔

"وَالدَّھْرِ فِی ھِمَمٖ" کا مطلب یہ ہے کہ ہمت و پامردی اور شدائد و مصائب کا مقابلہ کرنے میں آپ کی مثال دہر یعنی زمانہ جیسی تھی، عرب قدیم عقائد کی بنا پر مصائب و شدائد کی نسبت زمانہ کی طرف کرتے تھے، جیسے فارسی اور اردو کے شعرا آسمان کی طرف مصائب و آلام اور حوادث و نوازل کا انتساب کرتے ہیں، کسی مصیبت زدہ کو کہتے ہیں وہ

"فلک گزیدہ" ہے، آسمان اس پر ظلم ڈھا رہا ہے، یہ بات اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے غلط ہے، کیونکہ آسمان وزمین سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، ان میں بذاتِ خود یہ طاقت نہیں کہ کسی کو نقصان یا فائدہ پہنچا سکیں، البتہ اس کی ایک تاویل یہ ہے کہ ظرف بول کر مظروف مراد لینا ایک عام طریقہ ہے، جیسے اردو میں بولتے ہیں: پرنالہ بہ رہا ہے، نہر جاری ہے، حالانکہ درحقیقت پرنالہ نہیں بہتا بلکہ اس میں پانی بہتا ہے، یونہی نہر نہیں جاری ہوتی ہے، بلکہ نہر میں پانی جاری ہوتا ہے، عربی میں بولتے ہیں: نهارهٔ صائمٌ و ليلهٗ قائمٌ (اس کا دن روزہ دار ہے اور اس کی رات حالت قیام میں ہے) حالانکہ سب جانتے ہیں کہ دن روزہ نہیں رکھتا، رات قیام نہیں کرتی بلکہ دن کو آدمی روزہ رکھتا ہے اور رات میں قیام کرتا ہے، مگر یہ طرزِ تعبیر اور طریق ادا ہے، عرب زمانہ کی طرف بدحالی، سختی اور مصیبت کی نسبت اس لیے کر دیتے ہیں کہ زمانہ کی تبدیلی سے ان کا وجود اور مشاہدہ ہوتا ہے۔

اب امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی ہمت و پامردی ایسی تھی جیسے زمانہ ہو، جو ہر وار برداشت کر لیتا ہے مگر اپنے مقصد سے نہیں ہٹتا۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں چاروں تشبیہات، تشبیہ مرسل، مفصل ہیں، (۲) پہلے مصرع میں ایجاز حذف ہے کیونکہ اس میں وجہِ شبہ محذوف ہے اور پوری عبارت، "هو كالزهر في ترف" ہے۔ (۳) اور اس میں محسنات بدیعیہ میں سے صنعت تشطیر ہے، (۴) اور اس میں سجعِ مرصّع بھی ہے، (۵) ترف اور شرف کے درمیان تجنیس لاحق ہے۔

كَأَنَّـــهُ وَهُوَ فَـرْدٌ فِيْ جَلَالَتِهٖ
(۵۷)
فِيْ عَسْكَرٍ حِيْنَ تَلْقَاهُ وَ فِيْ حَشَمِ

ترجمہ: جب بھی حضور ﷺ سے تنہائی میں ملاقات کیجیے تو عظمت وجلالت کے باعث ایسا محسوس ہوگا کہ آپ فوج کے درمیان تشریف فرما ہیں یا خدّام کے جھرمٹ میں ہیں۔

لغات: فَرْدٌ: منفرد، یکتا (ج) اَفْرَادٌ۔ جَلَالَةٌ: عظمت ومہابت۔ عَسْكَرٌ: لشکر (ج)

عَساکِرُ۔ حَشَمٌ: نوکر چاکر، خدام (ج) اَحْشَامٌ۔

تشریح: اس قصیدہ کے بعض گزشتہ اشعار میں سرکار اقدس ﷺ کی خندہ پیشانی، شگفتہ روئی، خوش اخلاقی کو بیان کیا گیا ہے جس سے سننے والے کو یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ آپ کی ذات ہیبت اور رعب ودبدبہ سے خالی تھی، اس لیے اس شعر میں اسی شبہہ کو دور کیا گیا ہے اور فرمایا گیا کہ حضور اکرم ﷺ کی خوش اخلاقی، خندہ روئی اور نرم مزاجی کے باوجود، عظمت وجلالت، وقار وہیبت اور رعب ودبدبہ کا عالم یہ تھا کہ اگر وہ تنہا بھی ہوتے تو معلوم ہوتا کہ ایک لشکر جرار کے درمیان پورے جاہ وجلال کے ساتھ سپہ سالار کی حیثیت سے یا خدام کے جھرمٹ میں ایک شہنشاہ کی حیثیت سے جلوہ فرما ہیں۔

آپ کی ہیبت وجلالت اور رعب ودبدبے کی شہادتیں کتب حدیث وسیرت میں بکثرت موجود ہیں۔ امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز ہم لوگ سرکار کی مجلس میں حاضر تھے، آپ نے ایک آدمی سے گفتگو فرمائی تو وہ ایسا مرعوب ہوا کہ کانپنے لگا تو سرکار نے اس کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

هَوِّنْ عَلَيْکَ، فَاِنِّی لَسْتُ بِمَلِکٍ، اِنَّما أنا ابنُ امرأةٍ مِنْ قُرَیشٍ کَانَتْ تَاکُلُ القَدِیْدَ. (سبل الھدی ج ۷ ص ۱۲۰)

(مت خوف زدہ ہو، میں کوئی بادشاہ نہیں، میں تو قریش کی ایک خاتون کا بیٹا ہوں جو دھوپ میں خشک کیا ہوا گوشت کھاتی تھی)۔

شیخ زادہ نے سورۂ ماعون کی تفسیر میں لکھا: کہ ابوجہل کے پاس ایک یتیم تھا اور اس کا تمام مال ابوجہل کے قبضہ میں تھا، یہ یتیم جب اپنا مال لینے ابوجہل کے پاس آیا تو ابوجہل نے اسے دھکے دے کر باہر کر دیا اور کچھ نہ دیا، جب یتیم ناامید ہو کر واپس ہوا تو اکابر قریش نے اس سے کہا: محمد سے کہہ، اگر وہ تیری سفارش کر دیں گے تو امید ہے کہ کام بن جائے گا، انہوں نے یہ استہزاءً کہا تھا، مگر وہ یتیم ان لوگوں کے طرزِ کلام سے ان کے مقصد کو بھانپ نہ

سکا، بہر حال وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے اس کی گزارش کی، سرکار
عادتِ کریمہ یہ تھی کہ آپ کسی سائل اور ضرورت مند کو خالی واپس نہ فرماتے تھے، یتیم کی
گزارش سن کر آپ اس کے ہم راہ ابوجہل کے پاس تشریف لے گئے، ابوجہل سرکار کو دیکھتے
ہی تعظیماً سروقد کھڑا ہو گیا اور آپ کا خیر مقدم کیا اور سرکار کی سفارش پر یتیم کا سارا مال اس
کے حوالے کر دیا، قریش نے ابوجہل کو عار دلاتے ہوئے کہا: اَصَبَوْتَ؟ کیا تو نے دین بدل
دیا؟ تو ابوجہل کہنے لگا:

لَا وَاللّٰہِ مَاصَبَوْتُ وَلٰکِنْ رَاَیْتُ عَنْ یَمِیْنِہٖ وَعَنْ یَسَارِہٖ حَرْبَۃً فَخِفْتُ اِنْ لَمْ اُجِبْہُ یَطْعَنُنِیْ۔ (عصیدۃ الشھدۃ ص ۱۰۷)

(بہ خدا! میں نے مذہب نہیں بدلا، لیکن میں نے ان کے دائیں اور بائیں برچھی بردار دیکھے تو مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں حکم کی تعمیل نہ کروں گا تو یہ مجھے برچھیوں سے مار دیں گے)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ مرسل و مفصل ہے، کیوں کہ حرفِ تشبیہ اور وجہِ تشبیہ مذکور ہیں۔

(۵۸)

كَاَنَّمَا اللُّؤلُؤُ الْمَكْنُوْنُ فِيْ صَدَفٍ
مِنْ مَعْدِنَيْ مَنْطِقٍ مِنْهُ وَمُبْتَسَمِ

ترجمہ: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیپ میں پوشیدہ موتی آپ کے تکلم اور تبسم کی کانوں سے ہیں۔

لغات: كَاَنَّمَا: کَاَنَّ تشبیہ کے لیے ہیں اور ''ما'' کافہ ہے۔ اَللُّؤْلُؤُ: چمکتا موتی (ج) لآلی۔ اَلْمَكْنُوْنُ: چھپا ہوا، پوشیدہ۔ صَدَف: سیپ، موتی کا خول، اس کا واحد صَدَفَۃٌ ہے (ج) اَصْدَاف۔ مَعْدِنٌ: کان (ج) مَعَادِنُ۔ مَنْطِقٌ: مصدر میمی بمعنی نطق و تکلم۔ مُبْتَسَمٌ: مصدر میمی بمعنی تبسم، مسکراہٹ۔

تشریح: معدنِ تکلم دل ہے، جس سے کلام بہ ذریعہ زبان ظاہر ہوتا ہے، عہدِ بنی امیہ کا مشہور عربی شاعر کہتا ہے:

اِنَّ الْکَلَامَ لَفِي الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَی الْفُؤَادِ دَلِیْلاً

ترجمہ: (کلام درحقیقت دل میں ہوتا ہے، زبان کو دل کا ترجمان بنادیا گیا ہے)۔

اور معدنِ تبسم (مسکراہٹ کی کان) منہ ہے جس سے دانت ظاہر ہوتے ہیں، اس شعر میں تشبیہ مقلوب ہے، عموماً شان دار کلام اور خوب صورت دانتوں کو حسن و جمال اور آب وتاب میں موتیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے، مگر امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس آب دار موتیوں کو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام اور دندان مبارک سے تشبیہ دی ہے، تشبیہ کی یہ قسم عام تشبیہات سے عمدہ اور بلیغ ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ سرکار کا کلام اور دندان مبارک حسن و دل کشی اور آب وتاب میں آب دار موتیوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

علامہ حیاتی نے شرح التحفہ میں تحریر کیا ہے کہ: ''صدف'' ایک دریائی جانور ہے، جو اکثر بحر ہند اور بحر چین میں پایا جاتا ہے، جب ماہِ نیسان یعنی کنوار کا مہینہ آتا ہے تو یہ سمندر کی سطح پر آکر ابرِ نیساں کا منتظر رہتا ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو یہ اپنا منہ کھول دیتا ہے، اگر اس کے منہ میں ایک قطرہ گرا تو یہ اس کے پیٹ میں نہایت بیش قیمت موتی بن جاتا ہے، اس موتی کو ''دریتیم'' کہتے ہیں اور اگر دو قطرے گرتے ہیں تو دو موتی بن جاتے ہیں تو ان کو ''اخوان'' کہا جاتا ہے، ان کی قیمت ''دریتیم'' سے کم ہوتی ہے اور اگر تین یا چار قطرے گرتے ہیں تو تین یا چار موتی بنتے ہیں، غرضے کہ جتنے قطرے اس صدف کے منہ میں چلے جاتے ہیں اتنے ہی موتی اس کے شکم میں تیار ہوجاتے ہیں، لیکن موتیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے ان کی قیمت اتنی ہی گھٹتی اور کم ہوتی جاتی ہے، پھر یہ صدف سمندر کی تہ میں جاکر درخت کی طرح ایک جگہ جم جاتا ہے اور پتھر کی صورت اختیار کرلیتا ہے جسے سیپ کہا جاتا ہے۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص ۱۰۸)

اس شعر میں موتی کو ''سیپ میں پنہاں'' ہونے کی صفت کے ساتھ متصف کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ موتی جب تک سیپ کے شکم میں پنہاں ہوتا ہے وہ باہر کی فضائی آلودگی

اور لوگوں کے دست برد سے محفوظ ہوتا ہے اور میلا نہیں ہوتا، اس کی تابانی اور آب وتاب اپنے نقطۂ عروج پر ہوتی ہے اور باہر آ جانے کے بعد دیکھنے والوں کے ہاتھوں سے اور فضا میں تیرے ہوئے گرد وغبار کے ذرات سے اس کی چمک دمک کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہو جاتی ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ مقلوب ہے، جیسا کہ تفصیل سے گزرا (۲) اَللُّؤلُؤ الْمَکْنُوْنُ سے کنایتاً محفوظ اور آب دار موتی مراد ہے، (۳) مَعْدِنُ مَنطِقٍ اور معدِنُ مُبْتَسَمٍ منھ سے کنایہ ہے۔

(۵۹)

لَا طِیْبَ یَعْدِلُ تُرْباً ضَمَّ اَعْظُمَهٗ
طُوْبیٰ لِمُنْتَشِقٍ مِّنْهُ وَمُلْتَثِمِ

ترجمہ: کوئی خوشبو اس مہکتی خاک کی ہم سر نہیں جس میں سرکار کا جسم اطہر ہے، مژدہ ہے اس کے لیے جسے اس کا سونگھنا یا چومنا نصیب ہو۔

لغات: طِیْب: خوشبو (ج) أطیاب وطُیُوبٌ۔ یَعْدِلُ: (ض) مضارع معروف از عَدْل، بمعنی مساوات اور برابر ہونا۔ تُرْب: مٹی۔ اَعْظُم: عَظْمٌ کی جمع ہے بمعنی ہڈی اور یہاں اس سے مراد پورا جسم اطہر ہے۔ طُوْبیٰ: سعادت، خوش خبری۔ مُنْتَشِقٌ: سونگھنے والا۔ مُلْتَثِمٌ: چومنے والا۔

تشریح: سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خصائص سے یہ بھی ہے کہ ابتدائے ولادت سے لے کر آخر تک خوشبو استعمال کیے بغیر آپ کے جسم معنبر سے ایسی خوشبو پھوٹتی تھی کہ دنیا کی کوئی خوشبو اس کے ہم پلّہ نہ تھی، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

مَا شَمِمْتُ مِسْکاً وَلَا عَنْبراً اَطْیَبَ مِنْ رِیْحِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

(میں نے کسی مشک یا عنبر کی خوشبو کو سرکار کی خوشبو سے بہتر نہ پایا)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جب آقائے کونین ﷺ کا مدینہ طیبہ کے کسی کوچے سے گزر ہوتا تو گزر جانے کے بعد بھی آنے جانے والوں کو اس کوچہ سے خوشبو آتی اور

وہ سمجھ جاتے کہ یہاں سے سرکار کا گزر ہوا ہے، امام احمد رضا قادری بریلوی فرماتے ہیں:

بھینی خوشبو سے مہک جاتی ہیں گلیاں واللہ
کیسے پھولوں میں بسائے ہیں تمہارے گیسو

گزرے جس راہ سے وہ سیدِ والا ہوکر
رہ گئی ساری زمیں عنبرِ سارا ہوکر

آپ کی تربتِ انور میں بھی یہ خوشبو بسی ہوئی ہے کہ وہ ہر وقت اس خوشبو کے منبع ذاتِ انور سے فیض یاب ہورہی ہے، اسی کو امام بوصیری نے اس شعر میں ذکر فرمایا ہے، یہ خوشبو کبھی ختم نہیں ہوتی، آج بھی مدینہ منورہ کے درودیوار سے وہ خوشبوئیں آرہی ہیں جنہیں عشاقِ رسول شامۂ محبت سے سونگھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ حضرت اشبیلی فرماتے ہیں کہ خاکِ مدینہ میں ایک عجیب وغریب مہک ہے جو دنیا کی کسی خوشبو میں نہیں۔ حضرت یاقوت کہتے ہیں کہ: مدینہ منورہ کے خصائص میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں کی ہوا بھی خوشبودار ہے، وہاں کی بارش میں بھی وہ خوشبو ہوتی ہے جو اور جگہ کی بارش میں نہیں ہوتی۔ ابوعبداللہ عطار علیہ الرحمہ نے بہت خوب کہا ہے:

بِطِیْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ طَابَ نَسِیْمُهَا   فَمَا الْمِسْکُ مَا الْکَافُوْرُ مَا الصَّنْدَلُ الرُّطَبُ

ترجمہ: (اللہ کے رسول ﷺ کی خوشبو سے ہوائے مدینہ بھی خوشبودار ہوگئی، تو کیا ہے مشک، کیا ہے کافور، کیا ہے تروتازہ عود وصندل)۔

علمائے کرام فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی قبرِ انور تمام روئے زمین بلکہ بیت المقدس، بلکہ کعبۂ معظمہ، بلکہ عرش وکرسی سے بھی افضل ہے۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص۱۱۰)

حضرت ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری ''الزبدۃ العمدۃ فی شرح البردۃ'' میں فرماتے ہیں:

صرح العلماء رحمهم الله بأن ضريحهٗ ﷺ أفضل من الكعبة، وانما الخلاف المشهور بين مكة والمدينة ــ زادهما الله شرفا وتعظيما ــ بل روي عن الغزالي: أنّ تربة لصقت بجسدہٖ من الفرش أعلیٰ رتبة من العرش. (ص۸۸، مطبوعہ خیر پور، سندھ، پاکستان)۔

(علما نے تصریح فرمائی ہے کہ سرکار کا مزار مبارک کعبہ سے بھی افضل ہے اور افضلیت کے بارے میں مشہور اختلاف مکہ اور مدینہ ہی کے بارے میں ہے، بلکہ امام غزالی علیہ الرحمہ سے منقول ہے کہ فرشِ زمین کی جو مٹی سرکار کے جسم پاک سے لگی ہوئی ہے وہ عرش اعظم سے بھی بلند مرتبہ ہے)۔

اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ انسان کی پیدائش اسی خاک سے ہے جس میں وہ دفن ہوتا ہے، تو وہ خاکِ اطہر جس میں حضور آرام فرمارہے ہیں حضور کے جسدِ اطہر کا جز ہوئی اور حضور کے صدقہ تمام عالم، لوح وقلم، عرش وکرسی عالم وجود میں آیا تو اس سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ سرکار کا مزار انور تمام عالم سے افضل ہے۔

اس شعر میں حضرت سیدہ فاطمہ زَہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درج ذیل اشعار کی جانب اشارہ ہے جو انہوں نے سرکار کے وصال کے بعد آپ کے مرثیہ میں کہے تھے:

مَاذَا عَلیٰ مَنْ شَمَّ تُرْبَةَ اَحْمَدَا   اَنْ لَّا یَشَمَّ مَدَی الزَّمَانِ غَوَالِیَا

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ، لَّوْ اَنَّهَا   صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ، صِرْنَ لَیَالِیَا

ترجمہ:- (جو شخص رسول اللہ ﷺ کی تربتِ اطہر کو سونگھ لے اس پر لازم ہے کہ پوری زندگی عمدہ سے عمدہ خوشبو بھی نہ سونگھے۔ مجھ پر ایسی زبردست مصیبتیں ڈال دی گئی ہیں کہ اگر ان کو دنوں پر ڈال دیا جاتا تو وہ رات ہو جاتے)۔

محاسن بلاغت: (۱) طِیب اور طُوبیٰ کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۲) أَعْظُم مجاز مرسل ہے، کیوں کہ اس سے مراد جسم ہے جو أَعْظُم کا کل ہے (۳) اور طِیب اور مُنْتَشِق اجتماع مراعاۃ النظیر ہے۔

الفصل الرابع
في مولده ﷺ

اَبَانَ مَوْلِدُهُ عَنْ طِيْبِ عُنْصُرِهٖ
يَا طِيْبَ مُبْتَدَءٍ مِّنْهُ وَمُخْتَتَمِ (٦٠)

ترجمہ: حضور کی ولادتِ طیبہ نے آپ کے خاندانی شرف اور نسبی طہارت کو عیاں کر دیا، اللہ رے آپ کی ابتدا وانتہا کی پاکیزگی یا خوشبو۔

لغات: اَبَانَ: ماضی معروف از اِبَانَةٌ بمعنی ظاہر کرنا، عیاں کرنا۔ مَوْلِدُہٗ: ''مولد'' یا تو مصدر میمی ہے بمعنی ولادت، پیدائش، یا ظرف مکان ہے بمعنی جائے ولادت، یا ظرف زمان ہے بمعنی وقتِ ولادت۔ طِیْب: طہارت، پاکیزگی، خوشبو۔ عُنْصُر: اصل (ج) عناصر۔

تشریح: اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ولادتِ طیبہ کے وقت بہت سے خوارقِ عادات اور عجائب وغرائب کا ظہور فرما کر آپ کے خاندانی شرف اور نسب کی پاکیزگی اور طہارت کو عیاں فرما دیا، جن میں سے ایک وصف یہ تھا کہ کوئی خوشبو استعمال کیے بغیر جسم اطہر سے عجیب وغریب بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی تھی جس سے گلی کوچے معطر ہو جاتے اور بعد وصال بھی یہ خوشبو تربتِ انور سے پھوٹتی ہے جسے اہل دل اور اربابِ باطن عشاق رسول محسوس کرتے ہیں اور بعض خوارق وکرامات کا ذکر آئندہ اشعار میں آرہا ہے، شعر کا یہ مفہوم اس وقت ہوگا جب کہ ''طیب'' بمعنی خوشبو ہو اور ''مبتدا'' سے مراد ولادت اور ''مختتم'' سے مراد وصال ہو، اور اگر طیب بمعنی طہارت و پاکیزگی ہو اور ''عنصر'' بمعنی اصل ہو، جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عبداللہ تک سرکار کے آبائے کرام ہوں اور ''مبتدا'' سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ''مختتم'' سے مراد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہوں تو شعر

کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی ولادتِ مقدسہ کے وقت ظاہر ہونے والے خوارقِ عادات نے آپ کے آبائے کرام کی طہارت و پاکیزگی کو عیاں کر دیا اور ثابت کر دیا کہ آپ کے پورے سلسلۂ نسب کے آغاز اور پہلی کڑی حضرت آدم علیہ السلام بھی پاک اور سلسلۂ آبا کے انجام اور آخری کڑی حضرت عبداللہ بھی کفر وشرک کی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک تھے، یعنی پاک وصاف، صحیح، ثابت النسب اور پاکیزہ خاندانوں سے گزرتا ہوا آپ ﷺ کا خاندان حضرت آدم سے لے کر حضرت عبداللہ تک پہنچا، اس صورت میں اس شعر میں اس حدیثِ پاک کی جانب اشارہ ہوگا جس کو ابونعیم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

لم أزل أنتقل من أصلاب الطاهرين الىٰ أرحام الطاهرات.

(میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک شکموں میں منتقل ہوتا رہا)۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "مبتدا" سے مراد خود حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا آغاز اور "مختتم" سے مراد آپ کی وفات شریف ہو، تو اب شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ سرکار کی ولادت طیبہ نے آپ کی اصل اور ذات کی پاکیزگی ظاہر کر دی، کیوں کہ آپ بوقتِ ولادت ان آلائشوں اور گندگیوں سے پاک وصاف تھے جو پیدائش کے وقت عام بچوں میں ہوتی ہیں، آپ پیدائشی مختون اور ناف بُریدہ تھے اور آپ کی حیاتِ طیبہ کے آغاز کی طرح اس کا انجام بھی پاکیزہ ہے، اس صورت میں اس شعر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی جانب اشارہ ہوگا جو انہوں نے سرکار کے وصال کے موقع پر کہا تھا:

وَا خَلِيْلاه! بِأَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ، طِبْتَ حَيًّا وَمَيِّتًا.

(اے میرے خَلیل! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ زندگی میں بھی پاکیزہ تھے اور بوقتِ وصال بھی پاکیزہ)۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ندا برائے تعجب ہے، عربوں کا طریقہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو بہت باعظمت اور عظیم الشان پاتے ہیں تو حیرت واستعجاب کے دریا میں غرق ہوکر

اسے پکار اٹھتے ہیں، تا کہ اس کی موجودگی سے اپنی حیرت وتعجب کو دور کرنے کا سامان کریں۔

سرکار کی ولادتِ طیبہ کے وقت بہت سے خوارق اور عجائبات رونما ہوے۔

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب فرماتی ہیں کہ: بوقت ولادت میں حضور کی دایہ تھی، میں نے دیکھا کہ حضور کے جسدِ اطہر کا نور چراغ کی روشنی پر غالب ہے اور اس رات میں نے چھ عجائبات دیکھے:

اول: یہ کہ جب آپ شکم مادر سے باہر آے تو آپ نے سجدہ کیا۔

دوم: یہ کہ سر مبارک اٹھا کر حضور نے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فرمایا۔

تیسرے: یہ کہ آپ کے جسم اطہر کے نور سے پورا گھر منور ہو گیا۔

چوتھے: یہ کہ میں نے حسبِ دستور جب حضور کو غسل دینا چاہا تو غیبی ندا آئی کہ اے صفیہ! یہ یدِ قدرت سے غسل کیے ہوے ہیں تم تکلیفِ غسل نہ کرو۔

پانچویں: یہ کہ آپ ختنہ شدہ اور ناف بریدہ تھے۔

چھٹے: یہ کہ جب میں نے چاہا کہ حضور کو پیراہن پہناؤں تو آپ کی پشتِ انور پر دونوں شانوں کے درمیان ایک گول نشان پایا جس پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ لکھا ہوا تھا۔ (شرح شیخ زادہ علیٰ ھامش عصیدۃ الشھدۃ ،ص۱۲۲)

حضرت سہل بن عبداللہ تُستَرِی فرماتے ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے نور محمدی بطن آمنہ میں منتقل فرمایا وہ رجب کا مہینہ اور جمعہ کی رات تھی، اس رات خازن جنت کو حکم ہوا کہ فردوسِ اعلیٰ کھول دے اور مُنادی زمین وآسمان میں ندا دے رہا تھا کہ وہ نورِ مخزون جس سے نورِ نبی ہادی ظاہر ہونے والا تھا اس رات شکم آمنہ میں قرار پا چکا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ قریش ان ایام میں نہایت تنگی اور قحط سالی میں مبتلا تھے، درخت سوکھ گئے تھے، جانور دبلے ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے رحمتِ عالم ﷺ کے ورودِ مسعود کی تقریب میں موسلا دھار بارش برسائی جس سے وادیاں بھر گئیں، نالے بہ نکلے، درخت

سرسبز وشاداب ہوگئے، جانور فربہ اور تنومند ہوگئے، اسی خیر و برکت کی بنا پر اہل عرب نے اس سال کا نام ''سنة الفرح والابتهاج'' (خوشی ومسرت کا سال) رکھا۔

(اشرف السیر از علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی، ص ۱۳۱، ۱۳۲)۔

شرح شیخ زادہ میں ہے کہ: استقرارِ حمل کی صبح سارے بت، بتکدوں میں اوندھے پڑے تھے اور تختِ شیطان بھی الٹ دیا گیا تھا اور شیطان لعین اس غم میں چالیس دن تک دریاؤں میں غوطہ لگاتا رہا، پھر بھاگ کر جبل ابوقبیس پر آیا اور ایک ایسی چیخ ماری کہ اس کی تمام ذریت جمع ہوگئی تو ان سے شیطان نے کہا:

ويلكم هلكتُم هذه المرة هلاكاً لم تهلكوا مثله، قالوا: وما القصة؟ فقال: هذا محمد بن عبدالله بن عبدالمطلب المبعوث بالسيف القاطع الذي لا حيلة بعدهٗ يبطل عبادة اللات والعزىٰ وسائر الأصنام ولا تأتي موضعا الا وجدنا فيه ذكر الوحدانية علانية وهٰذه هي الأمة التي لعنني ربي من أجلها وجعلني شيطانا رجيما وسيأتي من هذا النبي مايحزن قلبي ويستخن عيني. (شرح شیخ زاده علىٰ هامش عصيدة الشهدة ص ۱۱۱)

(تم پر افسوس! اس دفعہ تم ایسے برباد ہورہے ہو کہ ایسی بربادی اس سے پہلے کبھی نہ تم پر آئی تھی، ذریتِ ابلیس نے کہا کہ: قصہ تو بتا، کیا مصیبت آگئی؟ شیطان نے کہا: عنقریب اسی جگہ محمد بن عبداللہ آرہے ہیں جو اللہ کی طرف سے شمشیر براں لے کر آرہے ہیں، ان کی آمد کے بعد ہماری کوئی چال نہ چل سکے گی، وہ لات وعزیٰ اور تمام بتوں کی پوجا ختم کرادیں گے اور وہ جہاں بھی جائیں گے توحید کا آوازہ بلند ہوگا، یہی وہ امت ہے جس کی بنا پر رب تعالیٰ نے مجھ پر لعنت کی اور مجھے شیطان مردود قرار دیا، اور اس کی بعثت کے بعد ہماری آنکھیں پتھرا جائیں گی اور ہمارے دل غم زدہ ہوں گے)۔

محاسن بلاغت: (۱) ''مبتدا'' اور ''مختتم'' کا اجتماع طباق ایجاب ہے (۲) کلمہ ''یا'' مجاز لغوی ہے، کیوں کہ وہ یہاں ندا کی بجائے اظہار تعجب کے لیے ہے (۳) اس میں صنعتِ تلمیح ہے، جیسا کہ اس شرح میں اس کا بیان گزر چکا۔

یَوْمٌ تَفَرَّسَ فِیْهِ الْفُرْسُ اَنَّهُمْ
قَدْ اُنْذِرُوْا بِحُلُوْلِ الْبُؤْسِ وَالنِّقَمِ (۶۱)

ترجمہ: آپ کی ولادتِ باسعادت کا دن وہ تھا جب اہل فارس نے تاڑ لیا کہ نکبت و مصیبت کی آمد کی انہیں وارننگ دی گئی ہے۔

لغات: یومٌ: دن، یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی "ھذا یومٌ" یا "یومُ ولادتک یومٌ" الخ (ج) ایام۔ تَفَرَّسَ: ماضی معروف از باب تفعل، بھانپ لیا، تاڑ لیا، فراست سے جان لیا۔ الفُرس: اہل ایران، فارس کے باشندے۔ اُنْذِرُوْا: ماضی مجہول از انذار بمعنی ڈرانا، وارننگ دینا۔ حُلُول: مصدر از باب نصر بمعنی نزول، اترنا۔ البُؤس: بختی وبلا۔ النِّقَم: نُقمة کی جمع، عذاب۔

تشریح: جمہور علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سرکار ﷺ کی ولادتِ طیبہ بارہ ربیع الاول کو ہوئی، علامہ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ میں لکھتے ہیں:

والمشهور انه ﷺ ولد يوم الاثنين ثاني عشر ربيع الأول وهو قول محمد بن اسحٰق بن يسار امام المغازي وقول غيره، قال ابن كثير : وهو المشهور عند الجمهور، وبالغ ابن الجوزی و ابن الجزار فنقلا فيه الاجماع وهو الذی عليه العمل۔

ترجمہ: مشہور یہ ہے کہ سرکارِ اقدس ﷺ دوشنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، یہی امام مغازی محمد بن اسحٰق وغیرہ کا قول ہے، ابن کثیر نے کہا: جمہور کے نزدیک یہی مشہور ہے، حتّٰی کہ ابن جوزی اور ابن جزار نے تو بطور مبالغہ اس پر اجماع کا اطلاق فرمایا اور اسی پر امت کا عمل ہے۔

تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف کے ساتھ ساتھ دن کے بارے میں امت کا اجماع ہے، کہ وہ دوشنبہ ہی تھا، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، متعدد احادیث سے اس کا ثبوت ہے، سید المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

ولد علیه السلام یوم الاثنین، وأنزل علیه النبوة یوم الاثنین، وخرج مهاجرا یوم الاثنین، ودخل المدینة یوم الاثنین، ووضع القبر یوم الاثنین، وکذا فتح مکة یوم الاثنین، وأنزل علیه سورة المائدہ یوم الاثنین.

ترجمہ: سرکارِ دوجہاں ﷺ کی وِلادت پیر کو ہوئی، آپ کی نبوت کا اظہار بھی اسی دن ہوا، سرکار نے ہجرت بھی اسی دن فرمائی، مدینہ منور میں تشریف آوری بھی دوشنبہ کو ہوئی، مزارِ اقدس میں بھی اسی دن آرام فرما ہوے، فتح مکہ بھی دوشنبہ ہی کو ہوئی اور آپ پر سورہ مائدہ کا نزول بھی اسی دن ہوا۔

اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کو مورخین اور اصحاب سیر نے روایت کیا ہے: کہ جس رات کی صبح حضور اکرم ﷺ اس خاک دانِ گیتی میں جلوہ فرما ہوئے، شاہ ایران نوشیرواں نے ایک پریشان کن اور حیرت ناک خواب دیکھا، تو اس نے اپنی سلطنت کے سارے کاہنوں، جادوگروں اور نجومیوں کو جمع کیا اور ان کے ساتھ یہودیوں کے اَحبار اور علما کو بھی بلایا اور ان لوگوں سے کہا کہ میں نے رات کو بہت حیران کن خواب دیکھا ہے، اس کے بارے میں تم لوگوں کو بتانا ہے، ان لوگوں نے بادشاہ سے کہا کہ آپ اپنا خواب بیان کیجیے تاکہ ہم لوگ اس کی تعبیر بتائیں، نوشیرواں نے کہا کہ مجھے ایسے اطمینان نہیں ہوگا میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے خواب سنے بغیر خواب اور اس کی تعبیر دونوں بتائیں، یہ سن کر وہ سب حیرت میں پڑ گئے اور نوشیرواں کی فرمائش پوری نہ کر سکے، پھر ان ہی میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو آپ سطیح کے پاس کسی شخص کو بھیج کر دریافت کرائیں، وہ سب کچھ صحیح صحیح بتا دے گا۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص ۱۱۳)

سطیح ایک عجیب الخلقت کاہن تھا، اس کے بدن میں کہیں جوڑ نہ تھا، اور نہ کھوپڑی اور انگلیوں کے سوا کہیں ہڈی تھی، سر، گردن میں کوئی امتیاز نہ تھا، سینہ میں منھ تھا، اس کی عمر تقریباً چھ سو سال تھی، علم کہانت میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا، تمام کاہنوں کا سربراہ تھا۔

(اشرف السیر ملخصا، ص ۱۳۹)۔

نوشیرواں نے اس کے پاس عبدالمسیح کو بحرین بھیجا، سطیح سال بھر میں صرف ایک بار باہر نکلتا تھا، اسے سونے کے پتر پر رکھا جاتا تو وہ آنے والے سال کے احوال بتاتا تھا اور لوگ انہیں لکھتے جاتے تھے، عبدالمسیح نے بحرین پہنچ کر اس کے باہر آنے کا انتظار کرنا شروع کردیا، جب وہ باہر آیا تو اس نے سب سے پہلے نوشیرواں کا خواب بیان کیا اور کہا کہ نوشیرواں نے حیرت ناک خواب دیکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ عربی گھوڑے اس کے تمام شہروں میں بھر گئے ہیں اور عراقی اونٹوں کو ہانک رہے ہیں اور انہیں نکال رہے ہیں، یہ نبی عربی امی ہاشمی کی ولادت کی علامت ہے، جن کا نام نامی محمد ہے، جو اولادِ ابراہیم میں سب سے افضل و برتر ہیں، ان کی تعریف توریت وانجیل میں آئی ہے، اور اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ عربی گھوڑے اسی نبی کے اصحاب و رفقا ہیں جو بلادِ فارس میں داخل ہو کر ملکِ فارس کو فتح کریں گے اور آل ساسان سے سارے شہر چھین لیں گے، اتنا کہ کر سطیح رو دیا۔ اس سے جب رونے کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگا: میں اس لیے روتا ہوں کہ میری زندگی کے تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں، افسوس کہ میں اس نبی کا زمانہ نہ پاسکوں گا، یہ سننے کے بعد عبدالمسیح وہاں سے واپس ہوا اور آل ساسان کو اس پیشین گوئی سے باخبر کیا، ساسانیوں کو یہ بات اچھی نہ لگی اور انہوں نے سطیح کو قتل کرنے کا فرمان جاری کردیا، جس کے نتیجہ میں اسے قتل کر کے اس کا سر پھاڑ ڈالا گیا۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص۱۱۳، ۱۱۴)۔

محاسن بلاغت: (۱) "تفرّس" اور "فُرس" کے درمیان تجنیسِ شبہِ اشتقاق ہے (۲) اور پہلے مصرع میں ایجاز حذف ہے، کیوں کہ مبتدا محذوف ہے (۳) اس میں صنعت تلمیح بھی ہے۔

(۶۲)

وَبَاتَ اِيْوَانُ كِسْرىٰ وَهُوَ مُنْصَدِعٌ
كَشَمْلِ اَصْحَابِ كِسْرىٰ غَيْرَ مُلْتَئِمِ

ترجمہ: نوشیرواں کا محل اس کے اعوان وانصار کے شیرازہ کی طرح شکستہ ہو گیا جسے پھر جوڑا اور درست کیا نہ جاسکا۔

لغات: بَاتَ: فعل ناقص بمعنی صَارَ: یعنی ہو گیا۔ اِیْوَان: محل (ج) اِیْوَانات وَأَوَاوِیْن۔ کِسْریٰ: خسرو کا معرب ہے، یہ شاہانِ فارس کا لقب ہے، اس کی جمع "أَکَاسِرَۃٌ" ہے، جیسے قیصر شاہِ روم کا، نجاشی شاہِ حبشہ کا، تُبّع شاہ یمن کا، خاقان شاہان ترک کا اور فرعون شاہِ مصر کا لقب تھا۔ مُنْصَدِعٌ: اسم فاعل از انصداع بمعنی پارہ پارہ ہونے والا، پھٹنے والا۔ شَمْل: جمعیت، شیرازہ۔ مُلْتَئِمٌ: اسم فاعل از التئام بمعنی مجتمع۔

تشریح: ولادت نبوی کے مبارک موقع پر جو خوارق رونما ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسریٰ شاہ ایران کے محل میں زبردست زلزلہ آیا جس کے جھٹکوں سے اس کے چودہ کنگرے ٹوٹ کر گر پڑے اور آٹھ باقی رہے، بنی ساسان کے شہنشاہ نوشیرواں نے کثیر دولت صرف کر کے یہ دنیا کا مشہور و معروف محل بنوایا تھا، اس کی تعمیر نوے برس میں مکمل ہوئی تھی، یہ اتنا پائیدار تھا کہ ہارون رشید نے اس کے دفینے حاصل کرنے کے لیے اسے ڈھوا کر کھودنا چاہا، کام شروع کرا دیا، مگر کامیاب نہ ہو سکا، زلزلے اور کنگروں کے ٹوٹنے سے نوشیرواں کے دل میں خوف و ہراس پیدا ہوا، لیکن خود کو قابو میں رکھ کر اس کو چھپائے رکھا، کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

بائیس میں سے چودہ کنگروں کے گر جانے اور آٹھ کے باقی رہنے میں اس طرف اشارہ تھا کہ اب ساسانی خاندان کے صرف آٹھ حکمراں اس سلطنت پر حکمرانی کریں گے، چنانچہ اس سلطنت کا آخری بادشاہ یزدگرد بن شہریار ہوا، اس نے رستم بن فرخ زاد کو سونا چاندی، زر و جواہر اور اسلحہ دے کر اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا اور اس سے کہا کہ کسی طرح مجھ سے عربوں کا شر دفع کر، رستم دو لاکھ کا لشکر جرار لے کر بلادِ عراق سے ہوتا ہوا چلا، اس نے وہاں کے ذمیوں کو عہد شکنی پر اکسایا، یہاں تک کہ انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اپنا عہد توڑ لیا، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی اور جو فوجیں عراق میں تھیں ان کو بھی حکم بھیج دیا کہ حضرت سعد کی

اطاعت کریں، میدان قادسیہ میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں، جس وقت مقابلہ شروع ہوا حضرت ہلال بن علقمہ تیمی نے ایسا نشانہ سادھا کہ پہلے ہی تیر میں رستم مارا گیا، سپہ سالار کا قتل ہونا تھا کہ ایرانیوں کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، وہ سب بھاگ کر مدائن پہنچے اور یزدگرد سے ملے، حضرت سعد نے ان کا تعاقب کیا اور ان کی جمعیت کو پراگندہ کر دیا، یزدگرد مدائن سے حُلوان کی طرف بھاگ گیا، اس کے بعد اہل ایران ایسے تتر بتر ہوئے کہ پھر کبھی منظم نہ ہوسکے، آخرکار یزدگرد ۳۱ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مَرْو میں مارا گیا اور تمام ملک فارس مسلمانوں کے زیر نگیں ہو گیا۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر میں ان ہی واقعات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سرکار اقدس ﷺ کی ولادتِ طیبہ کے وقت شاہ ایران کے محل میں ایسا زلزلہ آیا کہ اس کا پائیدار اور آہنی محل بھی شکستہ ہو گیا، جس طرح اس کے اعوان وانصار کا شیرازہ ایسا منتشر ہوا کہ پھر کبھی اسے جوڑا نہ جاسکا۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں تشبیہِ مرسل ہے (۲) اور صنعتِ تلمیح بھی۔

(۶۳)

وَالنَّارُ خَامِدَةُ الْاَنْفَاسِ مِنْ اَسَفٍ
عَلَيْهِ وَالنَّهْرُ سَاهِي الْعَيْنِ مِنْ سَدَمِ

ترجمہ: ایوان کسریٰ کے غم میں آتش کدہ کے شعلے سرد پڑ گئے اور مارے ندامت اور رنج و غم کے دریائے فرات اپنا سرچشمہ بھول گیا۔

لغات: اَلنَّارُ: آگ، اس میں الف ولام عہد خارجی کے لیے ہے، اس لیے یہاں اس سے مراد آتش کدۂ فارس ہے، جو ایرانی مجوسیوں کا سب سے بڑا عبادت خانہ تھا (ج) نِیْرَانٌ۔ خَامِدَةٌ: بجھنے والی، اسم فاعل از خمود، بمعنی شعلوں کا سرد پڑ جانا، بجھ جانا۔ اَنْفَاسٌ: نَفَسٌ کی جمع، یہاں مراد شعلے۔ اَسَفٌ: غم وافسوس۔ اَلنَّهْرُ: دریا، ندی، اس میں الف ولام عہد خارجی کا ہے، مراد دریائے فرات (ج) اَنْهَارٌ وَاَنْهُر۔ سَاهِيْ: بھولنے والا، اسم فاعل

از سہو۔ **الْعَيْنُ**: چشمہ (ج) عیون۔ **سَدَم**: ندامت جس کے ساتھ غم واندوہ ہو۔

تشریح: ولادتِ نبوی کے وقت ظہور میں آنے والے خوارق عادات میں سے ایک یہ تھا کہ آتش کدۂ فارس جسے گستاشپ نے زردشت کی تحریک پر مجوسیت اختیار کرنے کے بعد ہزار سال پہلے قائم کیا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک نہ بجھا تھا، دفعتاً سرد پڑ گیا، اور دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ دریائے فرات جو کہ کوفہ کے قریب ہے اور جس پر نوشیرواں نے پل بنا کر بڑی عالی شان اور پرشوکت عمارتیں اور کلیسے اس کے ارد گرد بنوائے تھے، اپنا راستہ بھول کر بارِ یہ سماوہ میں جا گرا، جو کہ کوفہ اور دمشق کے درمیان ایک لق ودق صحرا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) "اَلنَّارُ" میں استعارۂ مکنیہ اصلیہ ہے، یوں ہی "اَلنَّهر" میں بھی (۲) اور انفاس کا نار کے لیے اثبات استعارۂ تخییلیہ ہے، اسی طرح عین کا نہر کے لیے اثبات بھی (۳) اس میں حسن تعلیل بھی ہے جیسا کہ شعر کے مفہوم سے ظاہر ہے۔

(۶۴)

وَسَاءَ سَاوَةَ اَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُهَا
وَرُدَّ وَارِدُهَا بِالْغَيْظِ حِيْنَ ظَمِيْ

ترجمہ: اور اہل ساوہ کو یہ غم پہنچا کہ ان کی جھیل خشک ہو گئی اور اس پر آنے والے پیاسے کو غم وغصہ کے ساتھ واپس ہونا پڑا۔

لغات: **سَاءَ تْ**: ماضی معروف از باب نصر، غم زدہ کر دیا۔ **غَاضَتْ**: ماضی معروف از غیض بمعنی پانی کا زمین کی تہ میں اتر جانا، خشک ہو جانا۔ **وَارِدٌ**: پانی کے لیے چشمہ پر جانے والا۔ **ظَمِيْ**: ماضی مطلق معروف از ظَمِیءَ یَظْمَأُ ظَمأً وَظَمَاءً وَظَمَاءَةً بمعنی پیاس لگنا، سخت پیاسا ہونا، ضرورتِ شعری کی وجہ سے ظَمِیءَ کا ہمزہ ساکن کر کے یا سے بدل دیا گیا۔

تشریح: "ساوہ" ہمدان اور رَے کے درمیان بلادِ فارس ہی میں ایک شہر تھا، دونوں سے اس کی دوری تین فرسنگ تھی، (معجم البلدان ج ۳) وہاں ایک بہت بڑی جھیل تھی، جو "بحیرۂ ساوہ" کے نام سے مشہور ہے، یہ جھیل چھ میل لمبی اور چھ ہی میل چوڑی تھی، اس میں کشتیاں

پانی تھیں جن کے ذریعہ لوگ ساحلی شہروں کا سفر کیا کرتے تھے، اس کے ارد گرد بہت سے گرجا گھر اور آتش پرستوں کے عبادت خانے تھے، تمام مجوسی اس مقام کو مقدس اور متبرک خیال کرتے تھے۔ (شرح الباجوری وغیرہ)

سرورِ کونین ﷺ کی ولادتِ طیبہ کے دن اہل ساوہ کو بڑا رنج ہوا، کیوں کہ عظیم الشان اور وسیع وعریض جھیل جوان کے عبادت خانوں کی رونق کا سامان اور ان کی زندگی کا دارومدار تھی اچانک خشک ہوگئی اور اس کا سارا پانی زمین کی گہرائیوں میں ایسا جذب ہوگیا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا، جس سے کوئی پیاسا اپنا حلق ہی تر کرلیتا:

آ گئی ساوہ کی شامت سوکھا دریا اس کا کیا — پھر گئے آ آ کے پیاسے غیظ میں الٹے قدم

محاسن بلاغت: (۱) ''سَاءَ'' اور ''سَاوَۃَ'' کے درمیان تجنیس غیر تام ہے، (۲) ''سَاوَۃَ'' مجاز مرسل ہے، کیونکہ اس سے مراد اہل ساوہ ہیں، تو ظرف بول کر مظروف مراد لیا گیا ہے، یا اس میں ایجاز حذف ہے، اس طرح کہ اس کا مضاف محذوف ہے، اصل میں ''اَهْلُ سَاوَۃَ'' تھا، جیسے یہ دونوں تاویلیں آیت کریمہ وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ میں کی جاتی ہیں، (۳) وِرْدٌ اور وَارِدٌ کے درمیان بھی تجنیس غیر تام ہے، (۴) بُحیرۃ میں ظرف بول کر مظروف یعنی پانی مراد لیا گیا ہے، اس لیے یہ بھی مجاز مرسل ہے۔

كَأَنَّ بِالنَّارِ مَا بِالْمَاءِ مِنْ بَلَلٍ
(۶۵)
حُزْناً وَبِالْمَاءِ مَا بِالنَّارِ مِنْ ضَرَمٍ

ترجمہ: گویا غم کے باعث آگ میں پانی کی سی تری آ گئی اور پانی میں آگ کی سی سوزش پیدا ہوگئی۔

لغت: بَلَل: تری۔ ضَرَمٌ: سوزش، شعلہ زنی۔

تشریح: اس شعر کا معنوی تعلق گزشتہ شعر سے ہے، بلکہ یہ اسی کا تکملہ ہے، اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آتش کدۂ ایران ایسا سرد ہوا گویا اس میں پانی کی خاصیت (سردی اور نمی) آ گئی اور بحیرۂ

ساوہ ایسا خشک ہوا گویا اس میں آگ کی خاصیت (خشکی اور سوزش) پیدا ہو گئی اور غم سے مراد
یہ ہے کہ جب دریا سے اس کی روانی اور تری اور آتش کدہ سے اس کی گرمی اور سوزش چھین لی
گئی تو اس کو اپنی قلبِ ماہیت کا صدمہ پہنچا۔

فصل رابع

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ مرسل ہے (۲) اور حسن تعلیل بھی ہے (۳) پہلے
مصرع میں النار، الماء اور بلل کو ذکر کرنا، پھر دوسرے مصرعہ میں ان کے مقابل الماء،
النار اور ضرم کو اسی ترتیب سے ذکر کرنا صنعتِ مقابلہ ہے۔

(۶۶)

وَالْجِنُّ تَهْتِفُ وَالْاَنْوَارُ سَاطِعَةٌ
وَالْحَقُّ يَظْهَرُ مِنْ مَّعْنىً وَّمِنْ كَلِمٖ

ترجمہ: اور اس دن جن آواز دے رہے تھے، انوار چمک رہے تھے، اور حق لفظ و معنی سے
آشکارا ہو رہا تھا۔

لغات: تَهْتِفُ: مضارع معروف از هَتَفَ بمعنی غیب سے آواز دینا۔ سَاطِعَةٌ: چمکنے والا
الحَقّ: سچائی صداقت، مراد آپ کی نبوت و رسالت۔ كَلِم: کلمہ کی جمع بمعنی الفاظ۔

تشریح: "جن" آگ سے پیدا ہونے والی وہ مخلوق ہے جسے مختلف شکلیں بدلنے کی طاقت
حاصل ہوتی ہے، انہیں "جن" اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں، جس
لفظِ عربی کا مادہ اور اصلی حروف جیم، نون اور نون ہوں اس میں چھپنے، پوشیدہ رہنے اور نگاہوں
سے اوجھل رہنے کا مفہوم پایا جاتا ہے، چنانچہ "جَنِين" اس بچہ کو کہتے ہیں جو ماں کے شکم میں
ہو، "جَنَان" دل کو کہتے ہیں، "جَنَّة" اس باغ کو کہتے ہیں جو چہار دیواری میں محصور اور مستور ہو،
"جنون" پاگل پن اور دیوانگی کو کہتے ہیں، جس میں عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے، یوں ہی "جِنَّة"
بھی دیوانگی کو کہا جاتا ہے، "مِجَنّ" اور "مِجَنَّة" ڈھال کو کہتے ہیں جو انسان کو دشمن سے
چھپاتی اور اس کے وار سے بچاتی ہے، "جُنَّة" پردہ کو کہتے ہیں، فرشتے بھی ہماری نگاہوں سے
پوشیدہ ہیں، مگر یہ اپنے غایت حسن و جمال کی وجہ سے، اس لیے کہ ہم اگر انہیں ان کی اصلی

صورت اور نورانی شکل میں دیکھ لیں تو ہیبتِ حسن سے ہماری عقلیں جاتی رہیں، یا روح جسم سے پرواز کر جائے، اور ''جن'' چوں کہ حد درجہ بدصورت ہیں اس لیے یہ اللہ تعالیٰ کا انسانوں پر احسان عظیم ہے کہ انہیں نگاہوں سے پوشیدہ رکھا، اس لیے اگر کوئی انسان انہیں ان کی اصلی صورت میں دیکھ لے تو غایتِ خوف سے مرجائے، یا پاگل ہو جائے۔

جن کی تین قسمیں ہیں: (۱) وہ جو پروں سے ہوا میں اڑتے ہیں (۲) وہ جو سانپ اور کتوں کی شکل میں رہتے ہیں (۳) وہ جو ادھر ادھر سفر اور کوچ کرتے رہتے ہیں۔

علماے کرام نے لکھا ہے کہ جس طرح انسانوں میں مختلف مذاہب اور فرقے ہوتے ہیں اسی طرح جنوں میں بھی مختلف مذاہب اور فرقے ہوتے ہیں، ان میں یہودی، عیسائی، مجوسی، ہندو اور مسلم، مبتدع اور متدین، سنی، رافضی، وہابی، دیوبندی سبھی ہوتے ہیں، کچھ اچھے ہوتے ہیں اور کچھ عیاش، آوارہ اور برے، البتہ بروں کی تعداد بہ نسبت انسانوں کے ان میں زیادہ ہوتی ہے۔

سرکارِ اقدس ﷺ کی ولادتِ طیبہ کے دن جن آپ کی آمد آمد کی خوش خبری دے رہے تھے، مواہب لدنیہ میں ہے کہ ولادتِ طیبہ کے دن مشرق کے جن مغرب کے جنوں کو اور مغرب کے جن مشرق کے جنوں کو سرکار کی ولادت کی خوش خبری دے رہے تھے، اس کے علاوہ اور بہت سی روایتوں میں ہے کہ جنوں نے سرکار کے ''ظہورِ قدسی'' کی بشارتیں دیں۔

اور شفا شریف میں ہے کہ: حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

لما ولدتهٔ علیه السلام خرج من رحمي نور أضاء لهٔ قصور الشام.

(آپ کی ولادت کے وقت میرے رحم سے ایک ایسا نور نکلا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے)۔

بہر حال سرکار کی ولادت کے دن آپ کی نبوت اور حقانیت لفظ اور معنی دونوں طرح سے آشکارا ہو گئی، لفظاً تو جنوں کی خوش خبری سے اور معنیً اس طرح کہ آپ کی ولادت

کے وقت ایسا نور چمکا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔

عثمان بن العاص ﷺ کی والدہ فرماتی ہیں کہ میں اس وقت موجود تھی، میں نے دیکھا کہ تمام گھر انوار سے درخشاں ہے اور ستارے جھکے آرہے ہیں، معلوم ہوتا ہے زمین پر ٹوٹ کر آگریں گے۔

محاسن بلاغت: (۱) ''الحق'' کنایہ ہے نبوت ورسالت سے (۲) اس شعر میں لف ونشر غیر مرتب ہے، کیوں کہ معنی کا تعلق انوار سے ہے اور ''کلم'' کا تعلق ''تھتف'' سے ہے (۳) اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے جیسا کہ شرح میں گزرا۔

(۶۷)

عَمُوْا وَصَمُّوْا فَاِعْلَانُ الْبَشَائِرِ لَمْ
تُسْمَعْ وَبَارِقَةُ الْاِنْذَارِ لَمْ تُشَمِ

ترجمہ: منکرین حق اندھے اور بہرے ہو گئے تو خوش خبریوں کے اعلان انہیں سنائی نہ دیے اور ڈرانے والی بجلیاں انہیں نظر نہ آئیں۔

لغات: عَمُوْا: وہ اندھے ہو گے، صیغہ مذکر غائب، فعل ماضی معروف از عَمِيَ یَعْمٰی (س)۔ صَمُّوْا: وہ بہرے ہو گئے۔ اَلْبَشَائِرُ: بشارۃ کی جمع، خوش خبریاں۔ بَارِقَةٌ: بجلی (ج) بَوارِق۔ اَلْاِنْذَارُ: ڈرانا۔ لَمْ تُشَم: نہ دیکھی گئیں، نفی جحد بلم، مجہول از شَامَ الْبَرْقَ أوِ السَّحَابَ یَشِیْمُ شَیْماً بادل اور بجلی کو یہ جاننے کے لیے دیکھنا کہ بارش کہاں ہو گی۔

تشریح: بشارتوں کا اعلان، ہواتف غیبی کی صدائیں اور جنوں کی خوش خبریاں تھیں اور ڈرانے والی بجلی وہ انوار تاباں تھے جو سرکار کی اس خاک دانِ گیتی پر آمد آمد کے وقت نمودار ہوئے، یہ شعر دراصل ایک سوال مقدر کا جواب ہے جو گزشتہ شعر سے پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کہا جارہا ہے کہ ولادتِ باسعادت کے وقت جنوں نے خوش خبری دی اور سارا عالم انوار سے روشن وتابندہ ہو گیا، تو پھر کفارِ مکہ نے ان دلائل اور نشانیوں سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا؟ اور کفر وشرک وبت پرستی پر کیوں جمے رہے؟

اس سوال کا جواب اس شعر میں یہ دیا گیا کہ روشنی تو یقیناً موجود تھی مگر دشمنانِ دین کی نگاہوں کو قلب کی ظلمتوں نے اندھا کر دیا تھا تو وہ دیکھ نہ سکے اور بشارتوں کے اعلان بھی ہوئے لیکن ان کے کفر و شرک کی شامت اور نحوست کی وجہ سے کانوں پر بھی پردے پڑ گئے تھے، جس کی بنا پر اعلانِ حق سننے کی ان میں قوت نہ تھی، قرآنِ کریم نے ان کفار و مشرکین کی بڑی سچی تصویر کھینچی ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (اعراف، پارہ ۹، آیت ۱۷۹)

(ان کے دل ایسے ہیں جن میں سمجھ نہیں اور آنکھیں ایسی ہیں جن سے دیکھتے نہیں اور کان ایسے ہیں جن سے سنتے نہیں، وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ، وہی غفلت میں پڑے ہیں)۔

اور دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۔

(البقرۃ آیت ۷)

(اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (البقرۃ آیت ۱۸)

(وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، تو پھر آنے والے نہیں)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے، کیوں کہ عَمُوْا کا تعلق مَعْنَی سے ہے جو گزشتہ شعر میں ہے اور صَمُّوْا کا تعلق کَلِم سے ہے (۲) اور لَمْ تُسْمَعْ "صَمُّوْا" سے متعلق ہے اور "لَمْ تُشَمْ" عَمُوْا سے متعلق ہے جن میں ترتیب بدل گئی ہے، اس لیے اس میں لف و نشر غیر مرتب ہے۔

مِنْ بَعْدِ مَا اَخْبَرَ الْاَقْوَامَ کَاهِنُهُمْ
(۶۸)
بِاَنَّ دِیْنَهُمُ الْمُعْوَجَّ لَمْ یَقُمِ

ترجمہ: اس کے بعد کہ ان کے کاہنوں نے انہیں بتادیا تھا کہ ان کا دین ناحق قائم نہ رہےگا

لغات: کَاهِنٌ: غیب دانی کا دعوے دار (ج) کَهَنَةٌ وَ کُهَّانٌ۔ اَلْمُعْوَجُّ: اسم فاعل از اِعْوِجَاجٌ، ٹیڑھا، کج، مراد ناحق اور باطل۔

تشریح: یہ شعر گزشتہ شعر سے مربوط ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کا قبول حق سے انکار اس کے بعد ہوا کہ ان کے کاہنوں نے تمام لوگوں کو بتادیا تھا کہ ان کا دین ناحق اس نبی برحق کی آمد آمد کے بعد قائم وباقی نہ رہ سکے گا، بلکہ نیست ونابود ہو جائے گا، اس حقیقت کے جان لینے کے بعد بھی ان کا قبول حق سے انکار، ان کی ضد، ہٹ دھرمی اور اڑیل رویے کو بتا رہا ہے۔

کاہن: وہ لوگ ہوا کرتے تھے جو عموماً جنات وشیاطین کی مدد سے غیب کی خبریں دیا کرتے تھے، شیاطین آسمانوں پر جا کر چوری چھپے فرشتوں کی باتیں سن کر آتے اور کاہنوں کو بتادیا کرتے تھے اور سچی اور واقعی باتوں میں اپنی طرف سے بہت سی جھوٹی اور غیر واقعی باتیں بھی ملا دیا کرتے تھے، اسی لیے ان کی ہر بات صحیح نہیں اترتی تھی، بلکہ کوئی صحیح ہوتی تو کوئی غلط، مگر کفار ومشرکین کاہنوں کی ہر بات آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیتے اور اس کے سچ ہونے کا یقین کر لیتے، اسی لیے سرکار نے ان کے طرزِ عمل کی مخالفت کرتے ہوئے اور ان کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

من أتیٰ عرّافا أو کاهنا فصدقه بما قال فقد کفر بما أنزل الله علی محمد.

(جو کسی نجومی یا کاہن کے پاس آیا اور اس کی بات کو سچ سمجھا اس نے اس کی تکذیب کی جو اللہ تعالیٰ نے محمد پر نازل فرمایا)۔

سرکارِ اقدس ﷺ کی ولادتِ طیبہ کے وقت یا اس سے کچھ پہلے بہت سے کاہنوں اور نجومیوں نے آپ کی ولادتِ باسعادت کی اطلاع دی تھی، جن کی تفصیلات امام جلال

الدین سیوطی کی خصائص کبریٰ، علامہ قسطلانی کی المواہب اللدنیہ اور دیگر سیرت نبوی کی کتابوں میں موجود ہیں۔

المواہب اللدنیہ میں ہے کہ: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک یہودی مکہ معظمہ میں بسلسلۂ تجارت رہتا تھا، شبِ ولادت کی صبح اس نے پوچھا: "اے قریش! کیا اس رات تم میں کوئی لڑکا پیدا ہوا ہے؟ لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی، اس نے کہا: **فانظروا فانهٔ ولد في هذه الليلةنبي هذه الأمة، بين كتفيه علامة**

ترجمہ: (جاؤ دیکھو اس رات اس امت کا نبی پیدا ہوا ہے، جس کے دونوں شانوں کے درمیان نشان ہے)۔

اہل قریش کے تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے گھر فرزند ارجمند پیدا ہوا ہے، وہ یہودی کے پاس گئے اور اسے اس سے باخبر کیا، وہ ان کے ساتھ حضرت آمنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سرکار کی زیارت کی، جب شانہ اقدس کے درمیانی حصہ پر اس کی نظر پڑی تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا، ہوش میں آنے کے بعد بولا:

ذهبت النبوة من بني إسرائيل يا معشر قريش! أما والله ليسطونّ بكم سطوة يخرج خبرها من المشرق والمغرب.

(اب بنی اسرائیل سے نبوت گئی، اے اہل قریش! بخدا تم پر اس کی سطوت ایسی ہوگی جس کا چرچا مشرق و مغرب میں پھیل جائے گا)۔

اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جسے تفصیل مطلوب ہو وہ علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی کی کتاب "حجة الله على العالمين فى معجزات سيد المرسلين" کا مطالعہ کرے۔

محاسن بلاغت: (۱) "أقوام" اور "لم يقم" میں تجنیس شبہ اشتقاق ہے، (۲) اور "لم يقم" کو شعر کے آخر میں لانا اور "أقوام" مصرعۂ اولیٰ کے بیچ میں لانا صنعتِ ردالعجز علی الصدر ہے۔

(۶۹) وَبَعْدَ مَا عَايَنُوْا فِي الْاُفُقِ مِنْ شُهُبٍ
مُنْقَضَّةٍ وَفْقَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ صَنَمٍ

ترجمہ: اور انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ افق سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے جیسے زمین کے بت اوندھے ہو ہو کر گرے۔

تشریح: اس شعر میں ولادتِ نبوی کے وقت رونما ہونے والے دو واقعات کا ذکر ہے:
اول: آسمان سے ستاروں کا ٹوٹ کر گرنا۔ دوم: زمین پر بتوں کا اوندھے منہ گرنا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے شیاطین ساتوں آسمانوں پر آتے جاتے تھے، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوگئی تو ان کی رسائی صرف نیچے کے چار آسمانوں تک رہ گئی، اگر وہ ان چار سے آگے بڑھتے تو فرشتے انہیں آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں اور انگاروں سے مار کر بھگاتے تھے جنہیں عربی میں ''شہابِ ثاقب'' اور اردو میں ''ستارہ ٹوٹنا'' کہتے ہیں، مگر جب ہمارے سرکار اس دنیا میں تشریف لائے تو ان چار سے بھی شیاطین کا آنا جانا بند ہوگیا، اب اگر شیاطین اوپر جانا چاہتے ہیں تو فرشتے ان پر آگ کے شعلے برساتے ہیں جس سے وہ بے تحاشا بھاگتے ہیں، اس کا تذکرہ قرآن کریم کی ان آیاتِ کریمہ میں موجود ہے:

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَساً شَدِيْداً وَّشُهُباً o وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَاباً رَّصَداً o (الجن پارہ ۲۹، آیت ۵)

اور یہ کہ ہم نے آسمان کو چھوا تو اسے پایا کہ سخت پہرے اور آگ کی چنگاریوں سے بھر دیا گیا ہے اور یہ کہ ہم پہلے آسمان پر سننے کے لیے کچھ موقعوں پر بیٹھا کرتے تھے، تو اب جو کوئی سنے وہ اپنی تاک میں آگ کا شعلہ پائے)۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُوْماً لِّلشَّيَاطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا

لہم عذابَ السَّعیرِ ○ (الملک پارہ ۲۹، آیت ۵)

(اور بے شک ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے لیے مار کیا اور ان کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار فرمایا)۔

اور بہ وقتِ ولادت دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ تمام روئے زمین کے بت اس رات اوندھے منہ گر پڑے۔

حضرت عبدالمطلب فرماتے ہیں کہ میں شب ولادت کعبہ کے قریب تھا، آدھی رات کے بعد میں نے دیکھا کہ کعبہ نے مقام ابراہیم کی جانب سجدہ کیا اور یہ تکبیر پڑھی:

اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر، اللّٰہ رب محمدن المصطفیٰ الاٰن قد طھرني ربي من أنجاس الأصنام وأرجاس المشركين.

(اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ محمد مصطفیٰ کا پروردگار ہے، اب مجھے میرے پروردگار نے بتوں کی نجاست اور مشرکین کی گندگی سے پاک کیا)۔

غیب سے ایک آواز آئی: رب کعبہ کی قسم! سب لوگ سن لو، حق تعالیٰ نے کعبہ کو برگزیدہ کر دیا اور آنے والے شہنشاہِ رسالت کا کعبہ کو قبلہ اور مسکن بنایا، کعبہ کے اردگرد جتنے بت تھے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور سب سے بڑا بت ہبل منہ کے بل اوندھا گر پڑا، ایک ندا آئی آمنہ کے بطن مبارک سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالمِ امکان میں ابرِ رحمت لیے جلوہ فرما ہو گئے۔

حضرت عبدالمطلب کا چشم دید واقعہ اوپر گزرا، قریش اپنے بت کے استھان پر سالانہ میلہ لگاتے تھے، اتفاق سے یہ ایام میلے کے تھے، قریش نے اس رات دیکھا کہ یہ بت اپنی جگہ سے گر پڑا، جلدی سے دوڑے گئے اور اسے اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا، لیکن پھر گر پڑا، دوبارہ اٹھایا، رکھا، مگر پھر گر پڑا، لیکن قریش نے تیسری مرتبہ اس کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اس کی جگہ نصب کیا، اب اس کے جوف سے آواز آئی:

تَرَدّٰی بِمَـوْلُـوْدٍ اَضَاءَ تْ بِنُوْرِہٖ جَمِیْعُ فِجَاجِ الْاَرْضِ فِي الشَّرْقِ وَالْغَرْبِ

وَخَرَّتْ لَـهُ الْاَوْثَانُ طُرًّا وَارْعَدَتْ   قُـلُوْبُ مُلُوْكِ الْاَرْضِ مِنَ الرُّعْبِ

(ہلاک ہو گئے اس بچہ کی ولادت سے جس کے نور سے شرق وغرب کا چپہ چپہ روشن ہو گیا اور سارے بت اس کے حضور گر پڑے اور اس کی ہیبت سے روئے زمین کے تمام بادشاہوں کے دل لرز اٹھے۔) (اشرف السیر ،۱۴۰، دائرۃ البرکات، گھوسی)۔

حَتّٰى غَدَا عَنْ طَرِيْقِ الْوَحْيِ مُنْهَزِمٌ
(۷۰)
مِنَ الشَّيَاطِيْنِ يَقْفُوْ اِثْرَ مُنْهَزِمِ

ترجمہ: یہاں تک نزول وحی کی راہ سے شکست خوردہ اور ناکام ہو کر شیاطین ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے۔

لغات: غَدَا: بمعنی أعرض، یعنی پھرے، لوٹے۔ طَرِيْقُ الْوَحْيِ: نزول وحی کا راستہ، مراد آسمان، کیوں کہ حضرت جبریل اسی راستے سے وحی لے کر اترتے تھے۔ مُنْهَزِمٌ: اسم فاعل از انہزام، شکست خوردہ، ناکام، بھاگنے والا۔ يَقْفُوْ: مضارع معروف از قَفَا يَقْفُوْ قَفْوًا بمعنی کسی کے پیچھے چلنا۔ اِثْرٌ: پیچھے، بعد۔

تشریح: گزشتہ شعر میں شیاطین پر آسمان سے آگ اور شعلوں کے برسنے کا ذکر تھا، اس شعر میں یہ تفصیل ہے کہ جب فرشتے انہیں آگ کے شعلوں اور انگاروں سے مارتے ہیں تو وہ کس طرح بے تحاشا بھاگتے ہیں، علامہ عمر بن احمد خرپوتی لکھتے ہیں کہ: شیاطین ایک کے اوپر ایک سوار ہو کر آسمان تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر وہاں تک رسائی سے پہلے ہی ان پر آگ کے شعلے برسنے لگتے ہیں، تو وہ بے تحاشا ایک کے پیچھے ایک بھاگتے ہیں اور وہ شعلے نشانے سے چوکتے نہیں، وہ ان تک پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں، پھر ان میں کچھ تو جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں اور کچھ کے بعض اجزا ہی جلتے ہیں اور کچھ دیوانے ہو جاتے ہیں۔

سوال: شیاطین تو ناری مخلوق ہیں، ان کی پیدائش تو آگ ہی سے ہوئی ہے، تو پھر آگ کے شعلوں سے یہ کیسے جل سکتے ہیں، بھلا آگ، آگ کو کیا جلائے گی؟

جواب: شیاطین کی تخلیق آگ سے ضرور ہوئی ہے، مگر صرف آگ سے نہیں، جیسے انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے مگر خالص مٹی سے نہیں، بلکہ اس میں اور بھی عناصر شامل ہیں، علاوہ ازیں طاقت ور اور کمزور آگ کو یک جا کر دیا جائے تو طاقت ور آگ کمزور آگ کو کھا جاتی ہے، اسی طرح خدائی آگ جو ''شہابِ ثاقب'' کی شکل میں شیطانوں پر برستی ہے وہ شیطانی آگ پر غالب آجاتی ہے اور انہیں جلا دیتی ہے۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص ۱۲۳)

محاسن بلاغت: (۱) ''طریق الوحی'' آسمان سے کنایہ ہے (۲) اور ''منہزم'' کو مصرعہ اولیٰ کے اخیر میں پھر شعر کے آخر میں لانا صنعت ردالعجز علی الصدر ہے۔

كَأَنَّهُمْ هَرَبًا أَبْطَالُ أَبْرَهَةٍ
(۷۱)
أَوْ عَسْكَرٌ بِالْحَصَى مِنْ رَّاحَتَيْهِ رُمِي

ترجمہ: بھاگنے میں وہ (کعبہ پر حملہ آور) ابرہہ کے سپاہیوں کی طرح تھے یا اس لشکر کی طرح جس پر سرکار نے جنگ میں اپنے ہاتھوں سے کنکریاں پھینکیں۔

لغات: هَرَبًا: بھاگنا۔ اَبْطَال: بہادر، بَطَل کی جمع۔ عَسْكَرٌ: لشکر (ج) عساکر۔ اَلْحَصیٰ: حَصَاةٌ کی جمع، کنکریاں۔ رَاحَةٌ: کفِ دست، ہتھیلی (ج) رَاح۔ رُمِيَ: پھینکی گئی، ماضی مجہول از رَمیٰ یَرْمِيْ رَمْیًا ''یا'' وقف کی وجہ سے ساکن ہوگئی۔

تشریح: اس شعر کا تعلق گزشتہ شعر سے کچھ یوں ہے، گزشتہ شعر میں آگ کے شعلوں کی مار سے شیاطین کے آسمان سے بے تحاشا بھاگنے کا تذکرہ ہے، چوں کہ وہ ایک غیر محسوس اور عقلی چیز تھی اس لیے سامعین کے ذہنوں میں اسے خوب اچھی طرح جاگزیں کرنے کے لیے اسے محسوس چیزوں سے تشبیہ دی، اس شعر میں شیاطین کو دو چیزوں سے تشبیہ دی، اول: ابرہہ کے جنگ جو سپاہیوں سے، دوم: لشکرِ کفار سے اور شعر کا مطلب ہے کہ سرکار کی ولادتِ طیبہ کے وقت شہابِ ثاقب کی مار سے شیاطین ایسے حواس باختہ ہو کر بھاگنے لگے جیسے یمن کے بادشاہ ابرہۃ الاشرم کے بہادر لشکری، جو کعبۃ اللہ کو ڈھانے کی نیت سے آیا تھا یا ان کافر جنگجوؤں کی

مانند سراسیمہ ہو کر بھاگے جو جنگ بدر وحنین میں سرکارِ اقدس ﷺ کے مقابلہ میں آئے اور سرکار کی مٹھی بھر کنکریوں کی مار کی تاب نہ لاکر بے تحاشا میدان جنگ سے بھاگے۔

پہلا واقعہ "قصہ فیل" کے نام سے مشہور ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

بیت اللہ (کعبہ) کی وجہ سے اہل مکہ خصوصاً قریش کو عزت نصیب تھی اس پر اردگرد کے بادشاہوں کو بھی رشک وحسد تھا، مکہ کی اس دینی مرکزیت کو ختم کرنے کے لیے یمن کے بادشاہ "ابرہۃ الاشرم" نے "صنعا" میں ایک معبد بنوایا "قصر بلقیس" کے ملبہ سے قسم قسم کے رنگین پتھر منگائے، سفید، زرد، سرخ، سیاہ، چتی دار، ان سے عمارت تیار کر کے سونے، چاندی، جواہر سے منقش کیا، اس میں صلیب آویزاں کی، ہاتھی دانت اور آبنوس کا منبر بنوایا، اس کا نام "قلیس" رکھا، اتنا اونچا تھا کہ دیکھنے والوں کی ٹوپیاں گر پڑتی تھیں، اس کی چھت سے "عدن" دکھائی پڑتا تھا۔

جب یہ کلیسا بن کر تیار ہو گیا تو ابرہہ نے اپنے ماتحت علاقہ میں منادی کرادی کہ اب کوئی حج کرنے کے لیے مکہ نہ جائے، مکہ کے بہ جائے "صنعا" کے "قلیس" کا حج کریں، اس کا علم جب اہل مکہ کو ہوا تو رقیبانہ جذبہ سے مشتعل ہو کر ایک کنانی نے جا کر "قلیس" میں پاخانہ کر کے اسے گندہ کردیا، بعض روایتوں میں ہے کہ "نفیل خثعمی" نے اس میں مردے ڈالے اور کچھ لوگوں نے اسے جلایا، اس پر ابرہہ آگ بگولا ہو گیا اور قسم کھائی کہ کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھاڑ کر دم لوں گا، اس ناپاک مقصد کے لیے ساٹھ ہزار کا ایک لشکر جرار تیار کر کے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑا، راستہ میں یمن کے ایک رئیس ذونفر نے روکنا چاہا، نوبت جنگ تک پہنچ گئی، ذونفر شکست کھا کر زندہ گرفتار ہوا، پھر نفیل بن حبیب خثعمی نے مزاحمت کی، یہ بھی پسپا ہو کر گرفتار ہوا، ابرہہ نے اسے قتل کرنا چاہا تو اس نے جان بچانے کے لیے کہا: مجھے قتل مت کر، عرب تک رہبری کا کام انجام دوں گا، ابرہہ نے جان بخشی کی، اس کی رہنمائی میں ابرہہ جب طائف پہنچا تو وہاں کا رئیس مسعود بن معتب ثقفی

کچھ آدمیوں کے ساتھ ملا اور اظہارِ اطاعت کے بعد ابورغال کو ہم راہ کیا کہ ابرہہ کو مکہ تک پہنچائے، یہ غدار مغمس پہنچ کر مر گیا، وہیں اس کی قبر ہے، اہل عرب جب اس کی قبر سے گزرتے ہیں تو اس پر پتھر برساتے ہیں۔

ابرہہ نے مغمس پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا، یہیں سے اسود بن مقصود کے ہم راہ کچھ سوار بھیجے جو اہل مکہ کے مویشی پکڑ لائے، جن میں حضرت عبدالمطلب کے بھی چار سو اونٹ تھے، حضرت عبدالمطلب کو جب اس کی خبر ملی تو ابرہہ کے پاس تشریف لے گئے، ان کی بارعب، پُرشکوہ صورت کو دیکھتے ہی ابرہہ تخت سے اتر پڑا، فرشِ زمین پر بیٹھا اور حضرت عبدالمطلب کو بھی اپنے برابر بٹھایا، آمد کی غرض پوچھی، حضرت عبدالمطلب نے اپنے اونٹوں کے لیے کہا، ابرہہ نے حیرت سے کہا: میں سمجھتا تھا کہ مکہ کا سردار کوئی ذی عقل انسان ہوگا، تم تو نرے احمق نکلے، میں کعبہ ڈھانے آیا ہوں جو تمہارا معبد اور شان وشوکت کا مرکز ہے، اس کی فکر نہیں، مویشیوں کی فکر ہے، حضرت عبدالمطلب نے فرمایا: اونٹ میرے ہیں، اس لیے مجھے ان کی فکر ہے، کعبہ رب العالمین کا ہے وہ خود اس کی حفاظت فرمائے گا، اس جواب سے ابرہہ بہت متاثر ہوا اور ان کے اونٹ واپس کر دیے، حضرت عبدالمطلب نے ان تمام اونٹوں کو قلادے پہنائے، ان پر جل ڈالے، ان کے کوہان پر نشان بنائے اور انہیں حرم میں قربانی کے لیے چھوڑ دیا۔

ابرہہ کی لشکرکشی سے قریش کو سخت تشویش تھی، ابرہہ سے مقابلہ کی ان میں تاب نہ تھی، کہاں ایک باقاعدہ منظم ساٹھ ہزار فوج جرار اور کہاں یہ مٹھی بھر تہی دست بے سروسامان؟ اہل مکہ نے حسبِ دستور پہاڑ پر جا کر حضرت عبدالمطلب کے وسیلے سے دعا مانگی، اثنائے دعا حضرت عبدالمطلب کی پیشانی پر ہلالی شکل کی تجلی پیدا ہوئی، اتنی تیز کہ اس کی کرنیں بیت اللہ پر پڑیں، اسے دیکھ کر عبدالمطلب نے فرمایا: یہ نشان ظفر ہے، اطمینان رکھو، اب کوئی اندیشہ نہیں، پھر سب اہل مکہ کو ہدایت کی کہ یہ پہاڑوں میں چلے جائیں، خود مکہ ہی میں رہے، نشان ظفر دیکھنے کے بعد بھی حضرت عبدالمطلب کو چین نہ تھا، در کعبہ کا حلقہ ہاتھ میں لے کر نہایت رقت کے ساتھ یہ دعا مانگی:

(۱) لاھم ان المرء یمنع رحلۂ فامنع رحالک

(اے اللہ ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما)۔

(۲) وانصر علیٰ اٰل الصلیب وعابدیه الیوم الک

(صلیب کے پجاریوں کے مقابلہ میں اپنے اطاعت شعاروں کی مدد فرما)۔

(۳) لایغلبن صلیبهم ومحا لهم ابداً محالک

(ان کی صلیب اور فوج تیری فوج پر ہرگز غالب نہ آئے)۔

(۴) جروا جمیع بلادهم والفیل کي یسبو عیالک

(اپنی پوری آبادی اور ہاتھی گھسیٹ لائے ہیں تاکہ تیرے ظل حمایت میں رہنے والوں کو گرفتار کریں)۔

(۵) عمدوا حماک بکیدهم جهلاو رقبوا جلالک

(اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے مکر کے ساتھ تیرے حرم کا انہوں نے قصد کیا اور تیرے جلال سے نہ ڈرے)۔

دعا کے بعد حضرت عبد المطلب ایک اونچی جگہ کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے؟ ''زرقانی'' میں ہے کہ ابو مسعود ثقفی بھی عبد المطلب کے ساتھ تماشا دیکھنے کے لیے کھڑا تھا۔

ابرہہ نے صبح تڑکے لشکر درست کر کے ایک آزمودہ کار سردار ''حناطہ حمیری'' کی سرکردگی میں مکہ کی طرف بھیجا، آگے آگے ہاتھیوں کا جھنڈ تھا جن کا سرخیل فیل سفید ''محمود'' نامی تھا، یہ دل بادل جب مکہ کے قریب پہنچا اور سالار لشکر کی نظر عبد المطلب کے پرشکوہ چہرے پر پڑی تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور یوں چیخنے لگا جیسے ذبح کے وقت جانور چلاتا ہے، ہوش میں آنے کے بعد حضرت عبد المطلب کے سامنے سجدہ میں گر پڑا اور کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ تم قریش کے سردار ہو، یہی حال فیل سفید کا ہوا، جیسے ہی حضرت عبد المطلب کے

ردو ہوا، بیٹھ گیا، پھر سجدہ میں گر گیا، حالاں کہ یہ اتنا سرکش تھا کہ کبھی ابرہہ کے بھی آگے
نہیں جھکا تھا، جب کہ دوسرے ہاتھی اسے سلامی میں سجدہ کیا کرتے تھے، اللہ عزوجل نے
پل سفید کو گویائی عطا فرمائی، اس نے نور محمدی پر سلام پڑھا، پھر اُڑ گیا، ہر چند آنکس مارے
ئے مگر نہ اٹھا، مکہ کے علاوہ جدھر موڑتے بھاگتا، جب مکہ کی طرف پھیرتے، بیٹھ جاتا،
ب مہادت نے بہت دق کیا تو یمن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، امیہ بن صلت نے کہا:

(۱) اِنَّ اٰیاتِ رَبِّنَا بَیِّنٰتٌ مَایُمَارِیْ بِهِنَّ اِلَّا الْکَفُوْرُ

(ہمارے پروردگار کی نشانیاں بالکل ظاہر ہیں جن کا انکار سوائے کافر کے کوئی نہیں کرتا)۔

(۲) جَلَسَ الْفِیْلُ بِالْمُغَمَّسِ ظَلَّ یَحْبُوْ کَاَنَّهٗ مَعْقُوْرٌ

(مغمس میں ہاتھی بیٹھ گیا، یوں گھسٹنے لگا گویا اس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں)۔

ان عظیم نشانیوں کے دیکھنے کے بعد بھی جب ان متمردین کے ارادے تبدیل نہ
ہوئے تو وقت آگیا کہ انہیں پوری سزا دی جائے، اس کے لیے قادر مطلق نے سمندر کی طرف
سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کی فوج بھیجی جن کے چنگلوں اور چونچوں میں مسور کے برابر
کنکریاں تھیں، ان پرندوں نے ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری کی، جس سے تمام لشکر پامال ہو گیا،
سنگ ریزہ سر پر پڑتا، خود کو پھاڑ کر سر میں گھستا اور بدن کو چیر کر پار ہو جاتا، یہی نہیں، سواروں کے
بد سواریوں کو چھیدتا ہوا زمین پر پہنچتا، ہر سنگ ریزہ پر اس کا نام کندہ تھا جس کے حصہ کا وہ ہوتا،
برہہ کا حصہ بھی اس کے سر پر پڑا، اس کے اثر سے اسے چیچک نکل آئی، پور پور سڑ گل کر گرا، اخیر
ں دل پھٹا اور زمانہ تک رسوائی اور طرح طرح کی اذیت کے بعد ہلاک ہوا، اس عذاب الٰہی کی
تاب نہ لا کر پوری فوج سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی، مگر بھاگ کر کہاں جاتی؟

اَیْنَ الْمَفَرُّ وَ الْاِلٰهُ الطَّالِبُ وَالْاَشْرَمُ الْمَغْلُوْبُ لَیْسَ الْغَالِبُ

(بھاگنے کی جگہ نہیں، اللہ پکڑنے والا ہے، ہونٹ کٹا، نکٹا، شکست خوردہ ہے)۔

سب کے سب وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے، کعبہ ڈھانے کا حوصلہ رکھنے والے سورماؤں

کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے وادی مکہ پٹ گئی، نعوذ باللہ من غضبہ وغضب رسولہ۔

صرف ابرہہ کا وزیر ان کی تباہی کی داستان سنانے کے لیے حبشہ واپس ہوا، نجاشی کے دربار میں پہنچا، سب کیفیت بیان کی، ایک پرندہ اس کے ساتھ ساتھ تھا، جب پوری داستان سنا چکا، اس نے سنگ ریزہ مارا اور یہ بھی وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ فیل سفید اور اس کا مہاوت اور سائیس بچ گے، یہ دونوں زندہ تو رہ گے مگر مردہ سے بدتر، اندھے، اپاہج ہو گئے، مکہ میں عرصہ تک عبرت کی تصویر بن کر بھیک مانگ مانگ کر زندگی کے دن پورے کیے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے خود ان کو اس حال میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔

جب ابرہہ اور اس کی فوج کا کام تمام ہو گیا تو حضرت عبدالمطلب اپنے آدمیوں کے ساتھ گئے اور ان کے اموال اور مویشی پر قبضہ کر لیا، اللہ عزوجل نے سیلاب بھیجا، جس نے ان کی ناپاک لاشوں کو بہا کر سمندر میں پھینک دیا۔

ارہاصات نبوت کی فہرست میں اصحاب فیل کی تباہی سب سے اعظم و روشن ہے، اسی لیے قرآن کریم نے اس کی طرف خاص طور سے متوجہ فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ۝ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ ۝

(اے محبوب! کیا تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کا کیا حال کیا؟ کیا ان کا داؤں برباد نہ کر ڈالا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ بھیجے جنہوں نے انہیں سنگ ریزوں سے مار مار کر چبائے ہوئے بھس کی طرح کر ڈالا)۔

(اشرف السیر از مفتی محمد شریف الحق امجدی)

اس شعر کے دوسرے مصرع میں سرورِ کونین ﷺ کے اس معجزہ کی جانب اشارہ ہے جو

کشف بردہ جنگِ بدر اور حنین میں ظاہر ہوا، واقعہ یوں ہے کہ جب جنگِ بدر کے دن کافروں کا لشکرِ جرار پوری تیاری اور قوت کے ساتھ حملہ آور ہوا تو سرکار نے ایک مٹھی کنکریاں لے کر کفارِ قریش پر پھینکیں اور فرمایا: شَاهَتِ الْوُجُوْهُ (چہرے بگڑ جائیں) اور صحابۂ کرام کو حملہ کرنے کا حکم دیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ مشرکین میدان چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے لگے، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کر کے کچھ کو قتل کیا اور کچھ کو گرفتار کیا، اس طرح مسلمانوں کی کھلی ہوئی فتح اور مشرکوں کی شکستِ فاش کے ساتھ اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآن مجید میں یوں فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى○ (انفال، پارہ ۹، آیت ۱۷)

(اے محبوب! وہ کنکریاں جو تم نے پھینکیں تم نے نہ پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکیں)۔

شعر کے اخیر میں "رُمِــي" بصیغۂ مجہول استعمال کر کے امام بوصیری اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایک مشت کنکریوں سے مشرکین کے لشکرِ جرار کا رخ پھیر دینا اور اسے میدان چھوڑنے پر مجبور کر دینا درحقیقت قوتِ خداوندی سے تھا، بہ ظاہر کنکریاں سرکار نے پھینکیں، مگر فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ تھا، جس نے اپنی قوت کا مظاہرہ دستِ محبوب سے کرایا اور پردۂ محبوب میں اپنی لامحدود قوت و توانائی کی شان دکھائی۔

اسی سے ملتا جلتا واقعہ جنگِ حنین کا ہے کہ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے اور گھمسان کا رن پڑا تو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے دراز گوش سے اترے اور زمین سے مٹھی بھر مٹی لے کر کافروں کے منہ پر پھینکی اور فرمایا: شَاهَتِ الْوُجُوْهُ (چہرے مسخ ہو جائیں) تو ان میں سے کوئی کافر نہ بچا جس کی آنکھوں مین مٹی نہ پڑی ہو، اس کا اثر یہ ہوا کہ کفار فوراً ہی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ (رواہ مسلم عن سلمة بن الأكوع)

محاسن بلاغت: (۱) اس میں تشبیہ مرسل ہے (۲) اور صنعتِ تلمیح بھی

نَبْذًا بِهٖ بَعْدَ تَسْبِيْحٍ بِبَطْنِهِمَا
نَبْذَ الْمُسَبِّحِ مِنْ اَحْشَاءِ مُلْتَقِمِ (۷۲)

ترجمہ: سرکار کے کفِ دست میں کنکریوں کی تسبیح کے بعد دشمنوں پر انہیں ڈالنا ایسے ہی تھا جیسے تسبیح کرنے والے نبی (حضرت یونس علیہ السلام) کو لقمہ بنانے والی مچھلی کے شکم سے باہر کرنا

لغات: نَبْذاً: مصدر از باب ضرب بمعنی پھینکنا، یہ گزشتہ شعر میں واقع ''رَمِيٌ'' کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور نَبْذَ الْمُسَبِّحِ میں ''نَبْذ'' بھی ''رَمِيٌ'' کا مفعول مطلق نوعی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَلْمُسَبِّح: تسبیح کرنے والا، مراد حضرت یونس بن متی علیہ السلام۔ اَحْشَاءٌ: انتڑیاں وغیرہ جو شکم میں ہیں، یہ ''حَشَا'' کی جمع ہے۔ مُلْتَقِم: اسم فاعل از التقام، نگلنے والی، لقمہ بنانے والی، مراد مچھلی جو حضرت یونس کو نگل گئی تھی۔

تشریح: اس شعر سے پہلے اعلان نبوت سے پہلے کے واقعات اور خوارقِ عادات کا ذکر تھا، اب یہاں سے اعلانِ نبوت کے بعد رونما ہونے والے واقعات و معجزات کا ذکر شروع کرتے ہیں۔

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگِ بدر کے موقع پر مٹھی بھر کنکریاں لیں اور قریش کی جانب منہ کر کے فرمایا: شَاهَتِ الْوُجُوْهُ (چہرے بگڑ جائیں) یہ کہہ کر کنکریاں ان پر پھینکیں یوں ہی بعض روایتوں کے مطابق جنگِ حنین کے موقع پر بھی سرکارِ اقدس ﷺ نے مشرکین پر کنکریاں پھینکیں، لیکن کنکریوں کا کفار کی جانب پھینکنا دستِ اقدس میں ان کے تسبیح پڑھنے کے بعد تھا، اس کا ثبوت احادیث کی کتابوں میں نہیں ملتا، ہاں! سرکار کے دستِ اقدس میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا دوسرے موقع پر مروی ہے، جب کہ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کنکریوں کی سرکار کے دستِ اقدس میں تسبیح خوانی ان کے پھینکنے ہی کے موقع پر ہوئی، ممکن ہے اس طرح کی کوئی روایت حضرت بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں رہی ہو، جس کی بنا پر انہوں نے اس مفہوم کو یہاں شعر کے قالب میں ڈھالا ہے، یا اس بنا پر فرمایا ہے کہ: اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (القرآن)۔

اس شعر کا رشتہ گزشتہ شعر سے ہے اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ شیاطین شہاب ثاقب کی مار سے ایسے بھاگے جیسے ابرہہ کے فوجی یا مشرکین کے وہ سپاہی بھاگے تھے جن پر سرکار

نے اپنے دستِ اقدس سے کنکریاں پھینکی تھیں اور سرکار کے کفِ دست میں کنکریوں کی تسبیح کے بعد دشمنوں پر انہیں ڈالنا ایسے ہی تھا جیسے تسبیح پڑھنے والے نبی حضرت یونس علیہ السلام کو لقمہ بنانے والی مچھلی کے شکم سے باہر کرنا۔

حضرت یونس علیہ السلام موصل کے قریب شہر نینوا میں مبعوث ہوئے تھے، انہوں نے اپنی قوم کو بہت سمجھایا مگر وہ آپ پر ایمان نہ لائی، آخر کار آپ نے انہیں عذاب الٰہی کے آنے کی اطلاع دی، جب عذاب میں تاخیر ہوئی تو آپ اپنی قوم سے چھپ کر نکل آئے اور سمندر کے کنارے آکر ایک کشتی میں سوار ہو گئے، بیچ دریا میں کشتی ٹھہر گئی، جب کہ اس کے ٹھہرنے کا کوئی ظاہری سبب موجود نہ تھا، ملّاحوں نے کہا اس کشتی میں اپنے مولیٰ سے بھاگا ہوا کوئی غلام ہے، قرعہ ڈالنے سے پتہ چل جائے گا، قرعہ ڈالا گیا تو آپ ہی کے نام نکلا، تو آپ نے فرمایا کہ میں ہی وہ غلام ہوں اور آپ پانی میں ڈال دیے گے، کیوں کہ یہی دستور تھا کہ جب تک بھاگا ہوا غلام دریا میں غرق نہ کر دیا جائے اس وقت تک کشتی نہ چلتی تھی، دریا میں جانے کے بعد آپ کو ایک مچھلی نے نگل لیا، یہ آدھی رات کا واقعہ ہے، اس لحاظ سے آپ تہ بتہ تین تاریکیوں میں تھے، ایک تو رات کی تاریکی، دوسری دریا کی تاریکی، تیسری مچھلی کے پیٹ کی تاریکی، ان گھٹاٹوپ تاریکیوں میں بکثرت ذکر الٰہی کرنا اور لَا اِلٰـہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ ۝ پڑھنا شروع کیا، اس دعا پر اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا کہ ہمارے یونس کو محفوظ رکھ، اس طرح ایک مدت تک آپ مچھلی کے پیٹ میں زندہ وسلامت رہے، مچھلی کے پیٹ میں آپ کتنے دن رہے، اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں (۱) ایک دن (۲) تین دن (۳) سات دن (۴) چالیس دن، صحیح ترین روایت چالیس دن کی ہے، بہر حال جب مچھلی گھومتے گھومتے اسی جگہ پہنچی جہاں اس نے آپ کو نگلا تھا تو ساحل پر آکر آپ کو اگل دیا، حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ سورۂ انبیا میں اجمالاً اور سورۂ صافات میں تفصیلاً مذکور ہے۔

محاسن بلاغت:۔(۱) نَبْذَ الْمُسَبِّحِ میں تشبیہ بلیغ ہے (۲) اس شعر میں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی جانب تلمیح ہے (۳) حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کا یہاں ذکر صنعتِ استتباع کے طور پر ہے۔

الفصل الخامس
في معجزاته ﷺ

(۷۳) جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الْاَشْجَارُ سَاجِدَةً
تَمْشِيْ اِلَيْهِ عَلٰى سَاقٍ بِلَا قَدَمِ

(۷۴) كَأَنَّمَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِّمَا كَتَبَتْ
فُرُوْعُهَا مِنْ بَدِيْعِ الْخَطِّ فِي اللَّقَمِ

ترجمہ: آپ کے بلانے پر درخت سجدہ کرتے ہوئے بغیر پاؤں کے اپنے تنوں پر چلتے ہوئے سیدھے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے، ان درختوں نے آتے ہوئے ایک سطر کھینچ دی، کیوں کہ ان کی شاخوں نے راہ میں ایک انوکھی تحریر ثبت کردی۔

لغات: سَاق: تنا۔ سَطَرَتْ: (ن) لکھنا، کھینچنا۔ فُرُوْع: فرع کی جمع، شاخیں۔ بَدِيْع: انوکھا، خوش نما۔ اَلْخَطّ: تحریر، "بدیع الخط" میں صفت کی اضافت موصوف کی جانب ہے، یعنی اصل میں "اَلْخَطُّ الْبَدِيْعُ" ہے، خوش نما اور انوکھی تحریر۔ اللَّقَم: بیچ راستہ، واضح راستہ۔

تشریح: ان اشعار میں سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس معجزہ کا ذکر ہے جو کئی بار آپ سے ظہور میں آیا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ہم راہ سفر میں نکلے، دورانِ سفر ہمارا قیام ایک کشادہ وادی میں ہوا، سرکار قضاے حاجت کے لیے تشریف لے گئے، میں پانی کا برتن لے کر آپ کے پیچھے گیا، آپ نے نگاہ دوڑائی تو وہاں کوئی پردہ کی چیز نظر نہ آئی، جس کی آڑ میں آپ قضاے حاجت

زماتے، البتہ دور وادی کے کنارے پر دو درخت دکھائی دیے جو ایک دوسرے سے فاصلہ پر تھے، آپ ایک درخت کے پاس تشریف لے گئے اور اس کی ایک شاخ پکڑ کر فرمایا:

اِنْقَادِیْ عَلَیَّ بِاِذْنِ اللّٰہِ. (اللہ کے حکم سے میرا حکم مان)۔

تو وہ درخت آپ کے ساتھ ساتھ چل دیا، جس طرح شتربان کے ساتھ نکیل والا اونٹ چل دیتا ہے، پھر دوسرے درخت کے ساتھ یہی معاملہ فرمایا، اور پھر ارشاد فرمایا:

اِلْتَئِمَا عَلَیَّ بِاِذْنِ اللّٰہِ. (اللہ کے حکم سے دونوں مل جاؤ)۔

تو دونوں درخت باہم مل گئے اور سرکار نے رفع حاجت فرمائی، پھر فرمایا، علاحدہ علاحدہ ہو کر اپنی اپنی جگہ چلے جاؤ، حکم پانا تھا کہ وہ اپنی اپنی جگہ چلے گئے۔

امام قاضی عیاض مالکی نے اپنی کتاب شفا شریف میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کوئی معجزہ دکھایئے، آپ نے اس سے ارشاد فرمایا: تم سامنے والے درخت سے جا کر کہہ دو کہ تجھے رسول اللہ ﷺ بلاتے ہیں، اس دیہاتی نے درخت کے پاس جا کر کہا: چل، تجھے اللہ کے رسول ﷺ بلا رہے ہیں، وہ درخت سرکار کا حکم سنتے ہی دائیں جانب جھکا، پھر بائیں طرف مڑا، آگے کی جانب مائل ہوا اور پیچھے کی طرف خمیدہ ہوا اور اس کی جڑیں زمین سے جدا ہو گئیں، پھر اپنی جڑوں کو گھسیٹتے اور زمین کو کھودتے ہوے اس اعرابی کے ساتھ بارگاہ رسول میں حاضر ہو گیا اور عرض کیا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، اعرابی نے کہا آپ اسے اپنی جگہ واپس جانے کا حکم دیجئے، سرکار کا حکم پانے پر وہ پھر اپنی جڑوں کو گھسیٹتے ہوے اپنی جگہ واپس پہنچا اور وہیں جم گیا، اعرابی نے یہ معجزہ دیکھنے کے بعد عرض کیا:

اِئْذَنْ لِیْ اَنْ اَسْجُدَ لَکَ. (آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سجدہ کروں)۔

اس پر سرکار نے فرمایا:

لَوْ اَمَرْتُ اَحَداً اَنْ یَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْأَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِھَا.

(اگر میں کسی انسان کو کسی انسان کا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے)۔

اسی طرح سیرت ابن ہشام میں رکانہ کے واقعہ میں اور مواہب لدنیہ، شفا شریف اور مسند امام احمد بن حنبل میں ابوسفیان کی روایت میں بھی اس معجزہ کا ذکر ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) پہلے شعر میں ''اشجار'' اور ''ساق'' کے جمع ہونے سے صنعتِ مراعاۃ النظیر ہوئی (۲) ''سطرتْ'' اور ''سطراً'' کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۳) سطر، کتابت اور خط کو یک جا کرنا بھی صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے (۴) اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے۔

(۷۵)

مِثْلُ الْغَمَامَةِ أَنّٰى سَارَ سَائِرَةً
تَقِيْهِ حَرَّ وَطِيْسٍ لِلْهَجِيْرِ حَمِيْ

ترجمہ: جس طرح آپ جہاں تشریف لے جاتے ابر کا ٹکڑا آپ کے ساتھ جاتا اور دوپہر کو آفتاب کی سخت تمازت سے آپ کو بچاتا۔

لغات: اَلْغَمَامَة: بادل کا ٹکڑا۔ تَقِيْ: (ض) بچاتا، حفاظت کرتا، مضارع معروف از وِقایة۔ حَرّ: گرمی تپش، تمازت۔ وَطِيْس: تنور، مگر یہاں اس سے مجازاً سورج مراد ہے، (ج) اَوْطِسَة و وُطُس۔ اَلْهَجِيْرُ: دوپہر۔ حَمِيْ: فعل ماضی معروف، از حَمِيَ يَحْمٰى حَمْياً وَحُمِيًّا بمعنیٰ سخت گرم ہونا، اس کی یا وقف کی بنا پر ساکن ہوگئی۔

تشریح: یہ شعر گزشتہ شعر سے معنیً مربوط ہے اور مفہوم یہ ہے کہ درخت آپ کے حکم پر آپ کی بارگاہ قدس میں یوں آجاتے جیسے بادل جو آپ پر سایہ فگن رہتا اور آپ جہاں بھی تشریف لے جاتے وہ آپ کے ہم راہ جاتا اور دوپہر کے وقت چلچلاتی دھوپ سے آپ کی حفاظت کرتا۔

بادل کا سرکار اقدس ﷺ پر سایہ فگن ہونا ان خوارق عادات میں سے ہے جو بہ طور ارہاص اعلان نبوت سے پہلے آپ کی برکت سے رونما ہوئے، بادل کے آپ پر سایہ کرنے

کے متعدد واقعات احادیث وسیر کی کتابوں میں موجود ہیں، ان ہی میں سے وہ مشہور واقعہ ہے جو بارہ برس کی عمر میں ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کرنے کے موقع پر پیش آیا، جب رسول اکرم ﷺ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ قریش کے رؤسا اور سوداگروں کے ایک قافلے میں شام کے لیے چلے تو بحیرا راہب جو کہ کبھی اپنی خلوت سے باہر نہیں نکلتا تھا اس قافلہ کے استقبال کے لیے باہر نکل آیا اور قافلہ کے افراد پر گہری نگاہ ڈالی، اور ان میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر پہچان لیا اور رفقائے سفر کو تاکید کی کہ ان کا خیال رکھنا، یہ سید العالمین ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمانے والا ہے، لوگوں نے کہا آپ کو کس طرح معلوم؟ بحیرا نے جواب دیا: میں نے جو علامتیں نبی آخر الزماں کی سابقہ آسمانی کتابوں میں پڑھی ہیں وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں، آپ کے سر پر بادل کا ٹکڑا سایہ فگن رہتا ہے اور ان کی پشت پر مہر نبوت ہے، بحیرا کی فرمائش پر سرکار نے اپنی پشت دکھائی، راہب نے اسے چوما اور آنکھوں سے لگایا اور کہا یہی وہ نبی ہیں جن کی آمد آمد کی بشارت کتب سماویہ میں موجود ہے، یہ واقعہ سفر السعادۃ، سیرت ابن ہشام، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن ترمذی، مستدرک حاکم، بیہقی، دلائل النبوۃ لأبی نعیم، الخصائص الکبریٰ للسیوطی، وغیرہ کتابوں میں لفظ ومعنی کے قدرے اختلاف کے ساتھ مذکور ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ وہ ہے جسے ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ جب سرکار حلیمہ سعدیہ کے یہاں پرورش پارہے تھے تو ایک دن عین دوپہر کے وقت اپنی رضاعی بہن شیما کے ساتھ جانوروں کے گلہ میں تشریف لے گئے، حلیمہ سعدیہ آپ کی تلاش میں نکل پڑیں تو آپ کو اپنی بیٹی شیما کے ساتھ کڑی دھوپ میں دیکھا تو کہنے لگیں: ایسی دھوپ میں؟ شیما نے جواب دیا میرے بھائی کو تپش محسوس نہیں ہوتی۔

رأيت غمامة تظل عليه، اذا وقف وقفتْ، واذا سار سارت حتى انتهى الى هذا الموضع.

(میں نے دیکھا کہ بادل کا ایک ٹکڑا آپ پر سایہ فگن رہتا تھا، جب یہ ٹھہرتے تو وہ بھی ٹھہر جاتا اور جب یہ چلتے تو وہ بھی چلتا، اسی طرح یہ اس جگہ تک آئے ہیں)۔

حلیمہ سعدیہ نے شیما سے کہا: بیٹی! کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟ اس نے کہا: بخدا! سچ کہہ رہی ہوں۔

لیکن علامہ ابن حجر ہیثمی علیہ الرحمہ نے شرح قصیدۂ ہمزیہ میں لکھا ہے کہ بادل کا سایہ فگن ہونا اعلان نبوت سے پہلے بطور ارہاص تھا، اعلان نبوت کے بعد یہ ختم ہو گیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب ہجرت کے موقع پر سرکار کے ہم راہ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو جہاں سرکار کو دھوپ لگتی وہ آپ پر اپنی چادر سے سایہ کرتے، یوں ہی بہ روایت صحیحہ ثابت ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ جمرۂ عقبہ پر کنکری مار رہے تھے تو آپ پر ایک کپڑا تان کر سایہ کا انتظام کیا گیا تھا، اسی طرح جعرانہ میں بھی آپ کے لیے کپڑا تان کر سایہ کا انتظام کیا گیا، یوں ہی دوران سفر جب صحابۂ کرام کسی سایہ دار درخت کے پاس آتے تو اسے سرکار کے لیے چھوڑ دیتے۔ (العمدۃ شرح قصیدۃ البردۃ مطبوعہ مجلس برکات، ص ۹۱)

محاسن بلاغت: (۱) "مثل الغمامۃ" میں ایجاز حذف ہے، کیوں کہ یہ مبتداے محذوف کی خبر ہے، یعنی "هِيَ مِثْلُ الْغَمَامَةِ" (۲) اور اس میں تشبیہِ مرسل ہے، کیوں کہ یہاں کلمۂ تشبیہ مذکور ہے، (۳) "الوطیس" میں استعارۂ تصریحیہ اصلیہ ہے (۴) "سَارَ" اور "سائِرَة" کے درمیان صنعت اشتقاق ہے (۵) اور اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے۔

(۷۶) اَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ الْمُنْشَقِّ اِنَّ لَهُ
مِنْ قَلْبِهٖ نِسْبَةً مَبْرُوْرَةَ الْقَسَمِ

ترجمہ: قسم ہے شق ہونے چاند کے رب کی، سچی قسم، کہ اسے آپ کے شق ہونے والے قلب مبارک سے ایک نسبت حاصل ہے۔

لغات: اَلْمُنْشَقّ: چاک ہونے والا، اسم فاعل از انشقاق۔ مَبْرُوْرَةَ الْقَسَمِ: سچی قسم۔

بنسبۃ: مناسبت، مشابہت۔

تشریح: اس شعر میں معجزۂ شق القمر اور شق صدر کی جانب اشارہ ہے، شق القمر یعنی چاند کے دوٹکڑے کرنے کا معجزہ نبی کریم ﷺ کے عظیم الشان معجزات میں سے ہے، صحاح کی احادیث کثیرہ میں اس معجزہ کا بیان ہے اور خود قرآن کریم میں سورۂ قمر کی ابتدائی آیات میں اس کا ذکر موجود ہے، اس معجزۂ باہرہ کی خبر اس درجہ شہرت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کا انکار کرنا عقل وانصاف سے دشمنی اور بے دینی ہے، واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ اہل مکہ نے حضور سید عالم ﷺ سے ایک معجزہ کی درخواست کی تھی، تو حضور ﷺ نے انگشت شہادت کے اشارے سے چاند کو شق کر کے دکھایا، چاند کے دو حصے ہو گئے اور ایک حصہ دوسرے سے جدا ہو گیا اور فرمایا: گواہ ہو جاؤ، اس پر قریش نے کہا: محمد (ﷺ) نے جادو سے ہماری نظر بندی کر دی ہے، اس پر ان ہی کی جماعت کے لوگوں نے کہا: اگر یہ نظر بندی ہے تو باہر کہیں بھی کسی کو چاند کے دو حصے نظر نہ آئے ہوں گے، اب جو قافلے آنے والے ہیں ان کی جستجو میں رہو اور مسافروں سے دریافت کرو، اگر دوسرے مقامات سے بھی چاند کا دو ٹکڑے ہونا دیکھا گیا ہے تو بے شک یہ معجزہ ہے، چنانچہ سفر سے آنے والوں سے دریافت کیا، انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے دیکھا کہ اس روز چاند کے دو حصے ہو گئے۔

دوسرا معجزہ شق صدر ہے، حضور سید عالم ﷺ کا سینۂ مبارک چار مرتبہ چاک ہوا، پہلی مرتبہ بچپن میں جب کہ آپ دائی حلیمہ کی پرورش میں تھے، اس موقع پر حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کے سینہ کو چاک کر کے قلبِ مبارک باہر نکالا اور اس میں سے خون کی ایک پھٹکی نکال کر کہا: ھٰذا حظُّ الشیطان منک، یہ شق صدر اس لیے تھا کہ سرکار ان شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہیں جن میں بچے مبتلا ہوا کرتے ہیں اور اخلاق حسنہ اور خصال محمودہ سے آراستہ ہو کر پروان چڑھیں، دوسری مرتبہ دس سال کی عمر میں، تا کہ آپ کامل ترین اوصاف سے مزین ہو کر جوان ہوں، تیسری مرتبہ بعثت کے وقت، تا کہ آپ وحیِ الٰہی کے عظیم بوجھ کو

برداشت کرسکیں، چوتھی مرتبہ شبِ معراج میں، تاکہ آپ مناجاتِ الٰہی کے لیے بھرپور طریقہ سے تیار ہوجائیں۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں اس چاند کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کو سرکار نے انگشت شہادت کے اشارے سے دو ٹکڑے کردیا تھا کہ اس ماہ چاک گریباں کو سرکار کے قلب مبارک سے جس کو فرشتے نے چاک کرکے آب زمزم سے دھوکر نورِ حکمت وایمان سے بھر دیا تھا، ایسی مشابہت ہے کہ اگر کوئی شخص اس مشابہت کے ہونے پر قسم کھالے تو وہ اپنی قسم میں بالکل سچا ہے۔

سوال: اس شعر میں شاعر نے چاند کی قسم کھائی ہے، جب کہ بندوں کے لیے غیر خدا کی قسم کھانا شرعاً ناروا ہے۔

جواب: شعر میں ''القمر'' سے پہلے مضاف محذوف ہے، یعنی ''بربِ القمر'' جس کی جانب میں نے شعر کے ترجمہ میں اشارہ کردیا ہے، لہٰذا اب اعتراض باقی نہ رہا۔

محاسن بلاغت: (۱) ''اَقْسَمْتُ'' اور ''اَلْقَسَم'' کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۲) ان میں سے ایک کا مصرع اول کی ابتدا میں اور دوسرے کا شعر کے آخر میں آنے سے صنعت ردالعجز علی الصدر کا ظہور ہوا (۳) ''بالقَمَر'' میں ایجاز حذف ہے (۴) اس میں دو واقعات کی جانب اشارہ ہونے کی وجہ سے صنعتِ تلمیح بھی ہے۔

(۷۷)
وَمَا حَوَى الْغَارُ مِنْ خَيْرٍ وَّ مِنْ كَرَمٍ
وَكُلُّ طَرْفٍ مِنَ الْكُفَّارِ عَنْهُ عَمِيْ

ترجمہ: اس سراپا خیر اور مجسم کرم کو یاد کرو جنہیں غار ثور نے اپنی آغوش میں لیا تھا جب کہ کافروں کی آنکھیں ان کو دیکھنے سے اندھی ہوگئی تھیں۔

لغات: حَوَى: جمع کیا، احاطہ کیا، ماضی معروف از ضرب، ''مَا حَوَى'' میں مَا موصولہ ''اُذْکُر'' فعل مقدر کا مفعول بہ ہے، اور ''حَوٰی'' کا مفعول بہ ضمیر عائد محذوف ہے، اصل

عبارت "اُذْكُرْ مَاحَوَاهُ" ہے اور "مِنْ خَيْرٍ وَّمِنْ كَرَمٍ" موصول کا بیان ہے، اَلْغَارُ
ہیں الف ولام مضاف الیہ کے عوض میں ہے یا عہد خارجی کا، اس سے مراد غار ثور ہے۔
طَرَف: نگاہ، (ج) اَطْرَاف۔ عَمِيْ: فعل ماضی معروف از باب سمع، اصل میں "عَمِيَ" تھا
وقف کی بنا پر "یا" ساکن ہوگئی، یا یہ فَعِلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے، یا پر ضمہ کے
بعد کسرہ دشوار تھا اس لیے اسے ساکن کر دیا اور وقف کی وجہ سے تنوین نہ آئی تو اجتماع
ساکنین نہ ہوا، اس طرح اس کی "یا" برقرار رہی۔

تشریح: "سراپا خیر" سے مراد حضور اقدس ﷺ ہیں اور مجسم کرم سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، امام بوصیری نے اس شعر سے حضور کی ہجرت کے واقعہ کا بیان شروع کیا ہے کہ جب سرکار اقدس ﷺ کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی تو آپ اپنے جاں نثار صحابی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے اور جلدی جلدی سامان سفر تیار کر کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جَبَل ثَوْر کے ایک غار کے پاس پہنچے اور غار میں داخل ہونا چاہا، حضرت صدیق اکبر نے عرض کیا کہ پہلے میں غار میں داخل ہوں گا، ہوسکتا ہے کہ کوئی سانپ وغیرہ موذی جانور غار میں ہو جو آپ کو ڈس لے، حضرت صدیق پہلے غار میں داخل ہوئے، غار کو صاف کیا اور سوراخوں کو اپنی چادر کے ٹکڑوں سے بند کیا، ایک سوراخ باقی رہا تو اسے اپنے پیر کے انگوٹھے سے بند کرلیا، پھر سرکار کو اندر بلایا، سرکار غار کے اندر تشریف لائے، اس غار میں دونوں نے تین رات قیام فرمایا، کفار قریش نے پائے اقدس کے نشان کے سہارے آپ کا پیچھا کیا اور آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جبل ثور کے قریب پہنچ گے، اللہ کی مرضی دیکھئے کہ جب کفار جبل ثور کے قریب پہنچے تو پائے اقدس کا نشان ان پر مشتبہ ہوگیا، وہ جبل ثور پر چڑھ کر غار ثور کے دہانے تک پہنچ گئے، مگر غار پر اس وقت خدائی پہرہ لگا ہوا تھا، اس کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا اور کنارے پر کبوتروں نے انڈے دے رکھے تھے، ان کو غار کے اندر تو کچھ نظر نہ آیا مگر باہر کی حالت دیکھ کر کہنے لگے کہ اگر محمد

اس میں ہوتے تو مکڑی جالا نہ تنتی اور کبوتر انڈے نہ دیتے، اس لیے وہ ناامید ہوکر وہاں سے واپس ہوگئے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب اکبر ﷺ اور ان کے جاں نثار دوست حضرت صدیق اکبر کی حفاظت فرمائی، اس کا تذکرہ اس شعر میں اور مندرجہ ذیل تین شعروں میں کیا گیا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) ''خَیْرٌ'' اور ''کَرَمٌ'' میں مجاز مرسل ہے، کیوں کہ مصدر بول کر اسم فاعل کا معنی مراد لیا گیا ہے، معنی حقیقی اور مجازی کے درمیان علاقہ ''تعلق اشتقاقی'' ہے یا اس میں ایجاز حذف ہے، اصل میں یہ ذی خیر اور ذی کرم تھا، مضاف کو حذف کرکے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کردیا (۲) اس میں صنعت تلمیح بھی ہے۔

(۷۸)
فَالصِّدْقُ فِي الْغَارِ وَالصِّدِّيْقُ لَمْ يَرِمَا
وَهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا بِالْغَارِ مِنْ اَرِمِ

ترجمہ: تو پیکر صداقت اور صدیق امت دونوں ہی غار میں تھے، جب کہ کفار کہتے رہے کہ غار میں تو کوئی شخص نہیں ہے۔

لغات: الصِّدْقُ: سچائی، راست گوئی، اس سے مراد پیکرِ صداقت رسول اکرم ﷺ ہیں۔ لَمْ يَرِمَا: جگہ سے نہ ہٹے، یہ اصل میں ''لَمْ يَرِيْمَا'' اس کی یا صیغۂ واحد کی تبعیت میں حذف ہوگئی، کیوں کہ اس کا واحد لَمْ يَرِمْ ہے، جس میں اجتماع ساکنین کی وجہ سے یا حذف ہوئی۔ اَرِمْ: کوئی، کہا جاتا ہے: مَافِي الدَّارِ مِنْ اَرِمْ ''یعنی گھر میں کوئی نہیں ہے۔

تشریح: روایت ہے کہ ہجرت کے موقع پر جب مشرکین قریش سرکارِ اقدس ﷺ کو تلاش کرتے کرتے غار ثور کے دہانے تک پہنچ گئے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سرکار سے عرض کیا:

لَوْ اَنَّ اَحَدَهُمْ نَظَرَ اِلٰى قَدَمَيْهِ لَاَبْصَرَنَا.

(اگر ان میں سے کوئی اپنے پیروں پر نگاہ ڈالے گا تو ہمیں ضرور دیکھ لے گا)۔

تو سرکار نے فرمایا: يَا اَبَابَكْرٍ مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا.

(اے ابوبکر! ان دو کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہو)۔

محاسن بلاغت: (۱) ''الصدق'' میں مجاز مرسل ہے، یا ایجاز حذف (۲) ''صدق'' اور ''صدیق'' کے درمیان صنعت اشتقاق ہے (۳) ''یَسِرِ مَا'' اور ''اَدِمْ'' کے درمیان تجنیسِ شبہِ اشتقاق ہے (۴) اوران میں سے ایک کے مصرعۂ اولیٰ کے اخیر میں اور دوسرے کے شعر کے اخیر میں آنے میں صنعت رد العجز علی الصدر ہے۔

(۷۹)

ظَنُّوا الْحَمَامَ وَظَنُّوا الْعَنْكَبُوتَ عَلٰى
خَيْرِ الْبَرِيَّةِ لَمْ تَنْسُجْ وَلَمْ تَحُمِ

ترجمہ: ان کا خیال یہ تھا کہ اگر غار میں اشرف الخلق ﷺ ہوتے تو کبوتروں کی گردش اور مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔

لغات: اَلْحَمَامُ: کبوتر (نر اور مادہ دونوں کے لیے استعمال ہے) واحد حَمَامَةٌ۔ اَلْعَنْكَبُوتُ: (مذکر ومؤنث) مکڑی (ج) عَنْكَبُوتَات وعَنَاكِبُ وعَنَاكِيبُ۔ اَلْبَرِيَّةُ: مخلوق (ج) بَرَايَا۔ لَمْ تَنْسِجْ: (ن،ض) جالا نہیں تنا۔ لَمْ تَحُمْ: (ن) نفی جحد بلم از حَامَ حَوْماً وَحَوَمَاناً معنی منڈلانا، ارد گرد چکر لگانا۔

تشریح: جب مشرکین مکہ ہر سمت سرکار کو تلاش کر چکے اور ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو احتیاطاً غار ثور کی جانب بھی تلاش کرتے ہوئے آئے، غار ثور مکہ کی جنوبی سمت میں اس شاہ راہ کے قریب ہے جو یمن کو جاتی ہے، انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ حضور ادھر بھی جا سکتے ہیں، جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو ناچار ادھر کا رخ کیا، جب ایک ماہر کھوجی انسان کے ہم راہ غار ثور کے قریب پہنچے تو ان کے اس کھوجی نے ایک نشان قدم کو دیکھ کر کہا یہ تو ابو بکر کے پاؤں کا نشان ہے، لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسرا نشان قدم بھی ہے جسے میں پہچان نہیں سکا، یہ اس پاؤں کے نشان سے بڑی مشابہت رکھتا ہے جو مقام ابراہیم پر ہے۔

اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ کفار ادھر ادھر سے مایوس ہو کر نبی اکرم ﷺ کی تلاش میں اس طرف ضرور آئیں گے، چنانچہ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسے حالات پیدا

کر دیے کہ وہ تلاش کرتے کرتے غار کے دہانے تک تو پہنچ جاتے لیکن نہ اس کے اندر داخل ہوتے نہ اس کے اندر جھانکتے، یوں ہی الٹے پاؤں واپس چلے آتے، ہوا یہ کہ غار کے دہانے کے قریب ایک خاردار درخت اگ آیا، اس درخت کو عرب ''ام غیلان'' کہتے ہیں، اس کی بلندی انسانی قد کے برابر ہوتی ہے، اس کی شاخیں بڑی گنجان اور خاردار ہوتی ہیں، اس درخت کی موجودگی میں کسی شخص کا غار کے اندر جانا بہت مشکل ہے، نیز اس غار کے دہانے کے قریب جنگلی کبوتروں کے ایک جوڑے نے گھونسلا بنالیا، وہاں انڈے بھی دے دیے اور ان انڈوں کو سینے کے لیے ایک کبوتری ان پر ڈیرا جما کر بیٹھ گئی۔

المواہب اللدنیہ کے شارح علامہ محمد بن عبدالباقی زُرقانی (م ۱۰۹۹ھ) لکھتے ہیں:

''حرم مکہ میں جو کبوتر ہیں یہ کبوتروں کے اسی جوڑے کی نسل سے ہیں، اس خدمت جلیلہ کا انہیں یہ صلہ دیا گیا ہے کہ ان کی نسل بھی منقطع نہیں ہوئی، صدیوں سے اب تک باقی ہے اور حرم شریف میں انہیں پناہ ملی ہوئی ہے، کوئی انہیں چھیڑ نہیں سکتا، اسی لیے عربی زبان میں یہ کہاوت زبان زدِ خاص وعام ہے ''اٰمَنُ مِنْ حَمَامِ الْحَرَمِ ''یعنی فلاں شخص حرم کے کبوتروں سے زیادہ امن وامان میں ہے''۔

کبوتروں کے انڈے دینے کے ساتھ ہی غار کے منہ پر مکڑی نے ایک گھنا جالا تن دیا، دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ جالا آج کل میں نہیں تنا گیا ہے، بلکہ سالہا سال پہلے کا ہے، یہی وجہ ہے کہ امیہ بن خلف جیسا شقی دشمن رسول جب غار کے دہانے پر پہنچا تو اس کے ایک ساتھی نے اس سے کہا کہ اندر داخل ہو کر تسلی کرلو، امیہ بن خلف کہنے لگا: غار کے اندر جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اِنَّ فِیْہِ لَعَنْکَبُوْتاً اَقْدَمَ مِنْ مِیْلَادِ مُحَمَّدٍ اس کے دہانے پر مکڑی کا ایسا جالا ہے جو محمد کی پیدائش سے بھی پہلے کا تنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب حفاظتی انتظامات اس عظیم طاقت وقوت والے شہنشاہ کی بے پایاں قدرت کا کرشمہ تھے جس کے ایک کلمۂ کُن سے سارا عالم معرضِ وجود میں آگیا، اللہ تعالیٰ نے تارِ عنکبوت اور وحشی جانور

کے ذریعہ اپنے حبیب پاک کی ایسی حفاظت فرمائی جو کہ سیکڑوں آہنی اسلحے اور جنگی جوانوں سے ممکن نہ تھی، صاحبِ زبدہ فرماتے ہیں:

نهی علیه السلام عن قتل العنکبوت و الحمام الکائنین فی الحرم.

(حضور اقدس ﷺ نے حرم کی مکڑی اور کبوتروں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے)۔

جب کہ حرم کے سوا کہیں اور رہنے والی مکڑی کے بارے میں ارشادِ رسالت ہے:

العنکبوت شیطان مسخه الله فاقتلوه. (الجامع الصغیر)

(مکڑی شیطان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسخ فرمادیا ہے، لہٰذا اسے مار ڈالو)۔

ثعلبی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا یہ ارشاد روایت کیا ہے:

طهروا بیوتکم من نسج العنکبوت، فان ترکه فی البیوت یورث الفقر.

(عصیدة الشهدة ص ۱۳۷، ۱۳۸)

(اپنے گھر مکڑی کے جالے سے پاک رکھو، کیوں کہ گھروں میں جالا چھوڑے رہنے سے تنگ دستی پیدا ہوتی ہے)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں صنعتِ لف ونشر غیر مرتب ہے، کیوں کہ "لَمْ تَنْسُجْ" کا تعلق "الْعَنْكَبُوت" سے ہے اور "لَمْ تَحُمْ" کا تعلق "الحَمَام" سے ہے (۲) "الْحَمَام" اور "لَمْ تَحُمْ" کے درمیان تجنیس شبہِ اشتقاق ہے (۳) ان متجانسین میں سے ایک کا شعر کے آخر میں اور دوسرے کو مصرعۂ اولیٰ کے درمیان لانا صنعتِ تصدیر ہے (۴) ظَنُّوا کو دوبار لانے میں صنعتِ تکریر ہے۔

(۸۰)

وِقَايَةُ اللّٰهِ اَغْنَتْ عَنْ مُضَاعَفَةٍ
مِنَ الدُّرُوْعِ وَعَنْ عَالٍ مِّنَ الْاُطُمِ

ترجمه: اللہ تعالیٰ کی حفاظت ونصرت نے انہیں دوہری زرہیں پہننے اور بلند وبالا قلعوں میں پناہ لینے سے بے نیاز کردیا۔

لغات: وِقَايَة: حفاظت، مصدر از باب ضرب۔ اَغْنَتْ: بے نیاز کردیا، ماضی معروف از باب افعال۔ مُضَاعَفَة: دوہری، اسم مفعول از باب مفاعلت۔ دُرُوْع: دِرْع کی جمع، بمعنی زرہ۔ دُرُوْعٌ مُضَاعَفَةٌ: وہ زرہیں جو دو دو حلقہ مل کر بنی ہوں۔ اَلْاُطُم: اُطُمَۃ کی جمع، قلعہ، بلند و بالا مکان۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کی حفاظت و نصرت اپنے ذمہ کرم پر لی تھی، نصرتِ خداوندی ہمہ وقت آپ کی شریک حال رہتی تھی، اس لیے سرکار کو اپنی ذات کے لیے حفاظتی تدبیریں کرنے اور اس کا حد درجہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہ تھی، نہ اس کی حاجت تھی کہ آپ دوہری زرہ پہنیں یا آہنی خود استعمال کریں، بس بہ تقاضائے بشریت کبھی کبھی معمولی سا ظاہری انتظام فرمالیا کرتے تھے مگر بھروسہ اللہ کی ذات پر رکھتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ صحابہ کرام سرکار کی حفاظت کے لیے رات دن نگرانی رکھتے اور سفر میں آپ کے اردگرد پہرہ دیا کرتے تھے، جب آیت کریمہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (پ ۶، رکوع ۱۴، آیت ۶۷) نازل ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے قبۂ اقدس سے سر باہر نکالا اور پہرہ داروں سے فرمایا: تم لوگ چلے جاؤ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت اپنے ذمۂ کرم پر لے لی ہے، ہجرتِ نبوی کا تاریخی واقعہ بھی ظاہری سامان حفاظت سے آپ کی بے نیازی کو واضح کرتا ہے۔

اس شعر میں مذکورہ بالا آیت کے علاوہ درج ذیل آیت کریمہ کی طرف بھی اشارہ ہے جو واقعۂ ہجرت سے متعلق نازل ہوئی:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا. (پ ۱۰، توبہ، ع ۱۲، آیت ۴۰)

(اگر تم محبوب کی مدد نہ کرو تو بے شک اللہ نے مدد فرمائی جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر تشریف لے جانا ہوا، صرف دو جان سے، جب وہ دونوں غار میں تھے جب اپنے

دوست سے فرماتے تھے غم نہ کھا، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، تو اللہ نے اس پر اپنا سکینہ اتارا اور ان فوجوں سے اس کی مدد کی جو تم نے نہ دیکھیں)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں صنعتِ تلمیح ہے جیسا کہ تشریح میں گزر چکا۔

مَاسَامَنِي الدَّهْرُ ضَيماً وَاسْتَجَرْتُ بِهِ
(۸۱)
اِلَّا وَنِلْتُ جِوَارًا مِّنْهُ لَمْ يُضَمِ

ترجمہ: جب بھی زمانہ نے مجھ پر ستم ڈھایا اور میں نے حضور کی پناہ مانگی تو مجھے آپ سے غیر معمولی پناہ ملی۔

لغات: مَاسَامَنِي: مجھے تکلیف نہیں دی، فعل ماضی منفی، از سَامَ يَسُوْمُ سَوْماً وَسَوَاماً (ن) بمعنی تکلیف دینا۔ الدَّهْر: زمانہ (ج) دُهُوْرٌ وَادْهُر۔ ضَيْماً: ظلم، مصدر از ضَامَ يَضِيْمُ (ض)۔ اِسْتَجَرْتُ: میں نے ان سے پناہ مانگی، اسی معنی میں وہ ہے جو قرآن کریم میں آیا ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ یعنی اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ کی درخواست کرے تو اسے پناہ دے دیجیے تاکہ وہ کلامِ الٰہی نے۔ لَمْ يُضَمْ: نفی جحد بلم از ضَامَ يَضِيْمُ ضَيْماً (ض) بمعنی ظلم کرنا۔

تشریح: زمانہ کے ستم ڈھانے سے مراد اہلِ زمانہ کا ستم ڈھانا ہے، اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ جب بھی زمانہ والوں نے مجھ پر ستم ڈھائے اور مجھ پر مصائب وآلام کے حملے ہوئے اور میں نے ان مشکل اوقات اور کٹھن گھڑیوں میں سرکار کو پکارا اور ان کے جوارِ رحمت کی پناہ ڈھونڈی، میری مراد پوری ہوئی اور مجھے ان کی بارگاہِ قدس میں پناہ ملی۔

''جوار'' کا اصل معنی پڑوس ہے، ''جار'' کے معنی پڑوسی کے ہیں اور ''اِسْتِجَار'' کا اصل معنی کسی سے پڑوسی بننے کی درخواست کرنا، کسی کا پڑوس طلب کرنا ہے، اس کا لازمی اور کنائی معنی ہے حفاظت، نگہداشت، ذمہ داری اور دشمنوں کے حملہ کے وقت دفاع کی ذمہ داری، اس کی تفصیل یہ ہے کہ عربوں کی بدویانہ سوسائٹی کا ماحول یہ تھا کہ ان کے گھر بہت

دور دور اور فاصلہ پر ہوتے تھے اور ہر شخص اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور اپنے اہل وعیال اور عفت و ناموس کی حفاظت کا خود ہی ذمہ دار ہوتا تھا، مگر جب دشمنوں سے جان و مال اور عزت و ناموس کو خطرہ لاحق ہوتا اور حملہ کا اندیشہ ہوتا تو کسی قبیلہ کے سردار کے پڑوس میں چلا جاتا تھا جو اس کا حلیف یا ہم نوا ہو جاتا، پھر تو کوئی شخص اسے آنکھ نہیں دکھا سکتا تھا، کیوں کہ جس کے جوار اور پڑوس میں وہ آیا ہے وہ اس کا ایسا ذمہ دار اور محافظ بن جاتا تھا کہ پڑوسی پر حملے کو وہ اپنی ذات پر حملہ سمجھتا تھا اور پڑوسی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کو وہ اپنی توہین وتحقیر کے مترادف گردانتا تھا، اس تاریخی پس منظر سے خوب واضح ہو گیا کہ ''پڑوس طلب کرنے'' کا مطلب ہے کسی سے اپنی حفاظت کی ذمہ داری کی درخواست کرنا اور ''پڑوس میں آنے'' کا مفہوم ہے کسی کے حفظ و امان میں آنا۔

محاسنِ بلاغت: (۱) استجرت اور جوارا کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے، یوں ہی ضیما اور لم یضم کے درمیان بھی (۲) مؤخر الذکر دونوں میں سے ایک کے مصرع اول کے وسط میں اور دوسرے کے شعر کے اخیر میں آنے میں صنعتِ رد العجز علی الصدر ہے۔

(۸۲)
وَ لا الْتَمَسْتُ غِنَى الدَّارَيْنِ مِنْ يَدِهٖ
اِلَّا اسْتَلَمْتُ النَّدٰى مِنْ خَيْرِ مُسْتَلَمِ

ترجمہ: جب آپ سے دنیا یا آخرت کی کوئی بھلائی چاہی، ایک بہتر داتا کے ہاتھوں بخشش کی بھیک پائی۔

لغات: اِلْتَمَسْتُ: طلب کیا، مانگا۔ غِنیٰ: دولت، تونگری، بھلائی۔ یَد: ہاتھ، مگر یہاں اس سے مراد یا تو ذات ہے بطریقِ اطلاق جز وارادۂ کل، یا تو نعمت واحسان مراد ہے۔ اِسْتَلَمْتُ: بوسہ لیا اور بوسہ لینے سے مراد ملنا، حاصل ہونا ہے۔ النَّدیٰ: عطا و بخشش۔ مُسْتَلَم: بوسہ گاہ، بوسہ لینے کی جگہ اور ''خَيْرَ مُسْتَلَمِ'' سے مراد حضور اقدس ﷺ کا دستِ مبارک ہے، کیوں کہ وہ ان تمام ہاتھوں سے افضل ہے جن کا بوسہ لیا جاتا ہے، اس معنی کر یہ

اسم ظرف ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اسم مفعول ہو، اس صورت میں اس کا معنی ہوگا وہ جس کا بوسہ لیا جائے۔

تشریح: "غِنَی الدَّارَیْن" میں غنائے دنیا بہ ظاہر وسعت رزق، صحتِ جسم، سلامتی از مصائب وآلام ہے اور درحقیقت دل کا بے نیاز ہونا اور قناعت پسند ہونا غنائے دنیا ہے، سرکار اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

لیس الغنی من کثرة العرض، انما الغنی غنی القلب.

(سامان کی فراوانی حقیقت میں غنا نہیں، بلکہ درحقیقت دل کی بے نیازی ہی غنا ہے)۔

اسی کی ترجمانی شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی نے "گلستاں" میں یوں کی ہے: تونگری بدل است نہ بمال"۔

اور غنائے آخرت، جہنم سے نجات، جنت میں داخلہ اور دیگر اخروی نعمتوں سے بہرہ مند ہونا ہے اور شعر کا مفہوم واضح ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اِلْتَمَسْتُ اور اِسْتَلَمْتُ کے درمیان تجنیس قلب ہے (۲) اِسْتَلَمْتُ اور مُسْتَلَم کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۳) ان میں سے ایک کے شعر کے آخر میں اور دوسرے کے مصرعۂ ثانیہ کے شروع میں آنے میں صنعتِ تصدیر ہے (۴) یَدِہٖ میں مجاز مرسل ہے اور دونوں معنی کے درمیان علاقہ جزیت یا آلیت کا ہے۔

(۸۳)
لَا تُنْكِرِ الْوَحْيَ مِنْ رُّؤْيَاهُ اِنَّ لَهٗ
قَلْبـاً اِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ لَمْ يَنَمِ

ترجمہ: حضور کے خوابوں کے وحی ہونے کا انکار نہ کر، کیوں کہ ان کا دل اس وقت بھی بیدار رہتا ہے جب کہ آنکھیں سو رہی ہوں۔

(۸۴)
وَذَاكَ حِيْنَ بُلُوْغٍ مِّنْ نُّبُوَّتِهٖ
فَلَيْسَ يُنْكَرُ فِيْهِ حَالُ مُحْتَلِمِ

ترجمہ: اور یہ تو آپ کی نبوت کے بلوغ کا وقت تھا، تو ایسی حالت میں خوابوں کی آمد کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لغات: الرُّؤْیَا: خواب (ج) رُؤًی۔ مُحْتَلِمٌ: خواب دیکھنے والا، مراد عاقل بالغ۔ حَالُ مُحْتَلِمٍ: بالغ کی حالت، مراد خواب دیکھنا۔

تشریح: انبیاے کرام پر نزول وحی کی سات صورتیں ہیں (۱) خواب میں ہو، جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم ہوا (۲) قلب میں اِلقا ہو (۳) جَرَس (گھنٹی) کی آواز کی صورت میں ہو، جیسا کہ بخاری (ج۱، باب کیف کان بدء الوحی) میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اَحْیَاناً یَاْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ (کبھی وحی میرے پاس گھنٹی کی آواز کے مثل آتی ہے) (۴) فرشتہ کسی مرد کی شکل میں آکر کلام ربانی پیش کرے، جیسے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے، یہ صورت بھی بخاری کی مذکورہ حدیث میں مذکور ہے (۵) جبریل امین اپنی ملکوتی شکل میں حاضر ہوں کہ ان کے چھ بازو ہوں جن سے یاقوت اور موتی جھڑتے ہوں (۶) اسرافیل وحی لے کر حاضر ہوں، جیسا کہ امام شعبی نے فرمایا کہ ابتداءً تین سال حضرت اسرافیل علیہ السلام وحی پر مقرر رہے، پھر یہ خدمت جبریل امین کے سپرد ہوئی اور ان ہی کی وساطت سے پورا قرآن نازل ہوا (۷) اللہ عزوجل کا کلام قدیم سنیں خواہ بیداری میں ہو، جیسے کہ شبِ معراج میں سرکار ﷺ نے سنا اور کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے۔ خواب میں، جیسا کہ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے:

اَتَانِیْ رَبِّیْ فِیْ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ فَقَالَ فِیْمَ یَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلیٰ.

(نزھۃ القاری، از علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی، ج۱ ص۱۸۴)

(میرے پروردگار نے مجھ پر بہترین تجلی فرمائی، پھر پوچھا، ملأِ اعلیٰ کس بارے میں بحث کر رہے ہیں)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ وحی کی سات صورتوں میں سے ایک صورت خواب کی بھی ہے، حبر امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا:
رُؤیَا الْاَنْبِیَاءِ – عَلَیْهِمُ السلامُ – وَحْیٌ. (انبیا علیہم السلام کے خواب وحی ہوتے ہیں)۔
حضور اکرم ﷺ پر تیئیس سال چھ مہینے وحی آئی، ان میں ابتدائی چھ مہینے خواب کی شکل میں وحی کا سلسلہ رہا، اس بارے میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث قابل ملاحظہ ہے، جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔
عن عائشة أم المومنين – رضي الله تعالیٰ عنها– أنها قالت اولُ ما بُدِئَ بِهِ رسول الله -صلی الله تعالیٰ عليه وسلم – من الوحيِ الرُّؤیَا الصالحةُ في النوم فكان لا يَرى رؤياً الأجاءت مثل فلق الصُّبح. (بخاری باب بدء الوحی، ج ۱)
(ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا اچھے خوابوں سے ہوئی، جو خواب بھی حضور دیکھتے اس کی تعبیر صبح روشن کی طرح ظاہر ہوتی)۔

پھر فرشتہ بیداری میں آپ کے پاس وحی لانے لگا اور اس سلسلے کا آغاز چالیس سال کی عمر میں ہوا، تو جس طرح بیداری کی صورت میں آنے والی وحی پر مومن کا پختہ اعتقاد ہونا ضروری ہے اسی طرح خواب کی صورت میں آنے والی وحی پر بھی پختہ یقین واعتماد جمانا لازم ہے اور جس طرح بیداری کی صورت میں آنے والی وحی کا انکار ایک مومن کے شایان شان نہیں، اسی طرح خواب کی صورت میں آنے والی وحی کا انکار بھی اس کے ایمان کی تباہی کے لیے کافی ہے، کیوں کہ سرکار کا قلبِ مبارک مہبطِ وحی تھا، جو ہر وقت بیدار ہی رہتا، اگرچہ آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہو جاتا، خود فرماتے ہیں:
عَیْنَایَ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِی. (میری آنکھیں تو سو جاتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا)۔
اور دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں خواب کی شکل میں سرکار پر وحی کی آمد کا

سلسلہ اس لیے تھا کہ آپ اعلان نبوت سے پہلے ہی کمال نبوت تک پہنچ چکے تھے، جیسا کہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

كُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ لَمُنْجَدَلٌ بَيْنَ طِيْنَتِهٖ.

(میں اس وقت نبی تھا جب آدم کا خمیر گوندھا جا رہا تھا)۔

توجب سن بلوغ کو پہنچنے والے لڑکے کا احتلام اور خواب کا دعویٰ مان لیا جاتا ہے تو سرکارِ اقدس ﷺ کے خواب کو وحی کیوں نہ مانا جائے؟

محاسن بلاغت: (۱) پہلے شعر میں نَامَتْ اور لَمْ يَنَمْ کے درمیان طباق سلب ہے (۲) اور جناس اشتقاق بھی (۳) اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے، کیوں کہ اس میں حدیثِ نبوی اِنَّ عَيْنَيَّ تنامانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي اور حدیث رسول الرؤیا الحسنة من الرجل الصالح جزءٌ من ستةٍ واربعین جزءً من النبوة کی طرف اشارہ ہے (۴) دوسرے شعر میں "محتلم" عاقل بالغ سے کنایہ ہے (۵) اور "حال محتلم" سے بطور کنایہ خواب مراد ہے۔

(۸۵)

تَبَارَكَ اللّٰهُ مَا وَحْيٌ بِمُكْتَسَبٍ
وَلَا نَبِيٌّ عَلٰى غَيْبٍ بِمُتَّهَمِ

ترجمہ: اللہ پاک ومنزہ، وحی کوئی کسبی چیز نہیں، اور نہ کسی نبی پر غیب کے بارے میں تہمت لگائی جاسکتی ہے۔

لغات: تَبَارَكَ: وہ پاک اور منزہ ہے۔ مُكْتَسَبٌ: اسم مفعول از اکتساب، کسبی چیز، ایسی چیز جو محنت اور کوشش سے حاصل کی جائے۔ مُتَّهَمٌ: تہمت زدہ، وہ شخص جس پر کوئی الزام لگایا جائے۔

تشریح: یہ شعر گزشتہ اشعار کے مضمون کی دلیل ہے اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات تمام عیوب ونقائص سے پاک اور منزہ ہے، وحی اور نبوت محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، یہ کوئی کسبی چیز نہیں کہ انسان شب وروز کی پیہم ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ حاصل کر لے، قرآن کریم میں ہے:

اَللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام:۱۲۴)

(اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے)۔

اس لیے خواب میں وحی کے آنے سے انکار نہیں ہوسکتا، جیسا کہ بیداری میں آنے والی وحی سے نہیں ہوسکتا، اور دوسرے مصرعہ میں یہ کہا گیا کہ انبیاے کرام پر جو وحی نازل ہوتی ہے اور جو غیب کی باتیں انہیں معلوم ہوتی ہیں انہیں حسبِ ضرورت وہ بتاتے ہیں، اس لیے یہ جائز نہیں کہ کسی نبی پر غیب کی باتیں بتانے کے بارے میں جھوٹ کی تہمت لگائی جاے، کیوں کہ انبیاے کرام قبل نبوت اور بعد نبوت دونوں حالتوں میں اور گناہوں کی طرح کذب اور جھوٹ سے معصوم اور پاک ہوتے ہیں، اس شعر میں درج ذیل آیت کریمہ کی جانب اشارہ ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ .

(پارہ۲۹، جن:۲۶، ۲۷)

(اللہ تعالیٰ تمام غیب کا جاننے والا ہے، وہ اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا سواے اپنے پسندیدہ رسولوں کے)۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۝ (پارہ۳۰، تکویر:۲۴)

(اور یہ نبی غیب بتانے میں بخیل نہیں)۔

مؤخر الذکر آیت کی ایک قراءت میں ''بِظَنِيْنٍ'' ظا کے ساتھ ہے جس کے معنی متہم کے ہیں۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں صنعتِ تلمیح ہے، کیوں کہ اس میں قرآن کریم کی دو آیتوں کی جانب اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر تشریح میں ہو چکا۔

(۸۶)

كَمْ اَبْرَأَتْ وَصِبًا بِاللَّمْسِ رَاحَتُهٗ
وَاَطْلَقَتْ اَرِبًا مِّنْ رِّبْقَةِ اللَّمَمِ

ترجمہ: سرکار نے ہاتھ لگا کر کتنے بیماروں کو اچھا کر دیا اور کتنے دیوانوں کو دیوانگی کی قید سے رہا کر دیا۔

لغات: کَمْ: خبریہ ہے، کتنی بار، بارہا۔ اَبْرَأَتْ: ماضی معروف از اِبْرَاءٌ بمعنی شفا دینا، تندرست کرنا۔ وَصِباً: بیمار، صفت مشبہ از باب سمع (ج) وَصَابیٰ وِوِصَاب۔ رَاحَۃ: کفِ دست، ہتھیلی (ج) راح۔ اَطْلَقَتْ: چھڑایا، آزاد کرایا۔ اَرِبٌ: حاجت مند، سخت محتاج، مراد دیوانہ، پاگل۔ رِبْقَۃٌ: حلقہ، دائرہ، رسی کا پھندا (ج) رِبَق وَرِبَاق وَاَرْبَاق۔ اللَّمَم: ایک قسم کا جنون، دیوانگی۔

تشریح: سرورِ انبیاء ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے روحانی وجسمانی ہر قسم کی لاعلاج بیماریوں کا معالج اور طبیبِ حاذق بنا کر مبعوث فرمایا، کفر وشرک اور فسق وفجور کی بیماریوں میں جو لوگ مبتلا تھے، رحمتِ عالم ﷺ نے اپنی نگاہِ کرم سے ان کے گندے دلوں کو پاک کر کے ان کو صحتِ کاملہ سے آراستہ کر دیا، اسی طرح بارگاہِ رسالت میں جو لاعلاج مریض حاضر ہوا، سرکار کی توجہ سے وہ شفایاب ہو کر لوٹا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں اور طبرانی، ابن السکن، ابن مندہ اور بیہقی نے حضرت شُرَحْبِیل جعفی سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں ایک گلٹی سی تھی، میں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا: حضور! مجھے اس سے بڑی تکلیف ہے، اس کی وجہ سے میں تلوار کا قبضہ اور گھوڑے کی باگ نہیں پکڑ سکتا، سرکار نے اپنی ہتھیلی سے گلٹی کو رگڑا تو اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔

ابن سعد، بیہقی اور ابونعیم نے حضرتِ ابیض بن حمال سے روایت کی کہ ان کے چہرہ پر داد تھی، جس سے چہرہ کی رنگت بدل گئی تھی، حضرت نے ان کو بلایا اور ان کے چہرہ پر اپنا دستِ شفا پھیرا، اسی دن بالکل ٹھیک ہو گیا۔

مشکوٰۃ المصابیح میں حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ سرکارِ اقدس ﷺ

کشف بردہ

نے ابورافع یہودی کے یہاں شب خون مارنے کے لیے کچھ لوگوں کو بھیجا، ان میں عبداللہ بن عتیک بھی تھے، جب اسے قتل کر کے آپ اس کے گھر سے باہر نکلے تو زینے سے گر کر ان کی پنڈلی ٹوٹ گئی، جس کو انہوں نے اپنے عمامہ سے کس کر باندھ لیا، جب سرکار کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ پاؤں پھیلاؤ، انہوں نے پاؤں پھیلا دیے، حضور نے اس پر اپنا دستِ شفا پھیرا، اسی وقت وہ ایسی درست ہوگئی کہ گویا کبھی ٹوٹی ہی نہ تھی۔

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شریک ہوئے، جنگ میں آپ کی آنکھ پر تیر لگا، جس سے آنکھ کا ڈھیلا بہہ نکلا، آپ نے اس ڈھیلے کو اپنے ہاتھوں سے پکڑا اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی: میری آنکھ پر نظر کرم فرمایئے، حضور نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو صبر کرو اور اس کے عوض تمہیں جنت ملے گی اور اگر تم چاہو تو اس آنکھ کو میں درست کر دیتا ہوں، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ بے شک جنت بڑی اچھی اور خوب صورت جزا ہے، اللہ تعالیٰ کا گراں قدر عطیہ ہے، لیکن مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ میری بیوی جس سے مجھے بڑی محبت ہے وہ مجھے کانا کہے گی، حضور! مہربانی فرما کر میری آنکھ کو درست فرما دیں اور بارگاہِ الٰہی سے مجھے جنت بھی دلوا دیں، حضور نے اس ڈھیلے کو اپنے دست مبارک سے آنکھ میں اس کی صحیح جگہ رکھ کر یہ دعا فرمائی:

اللّٰھم اکسه جمالا. (یا اللہ! اس کے چہرہ کو حسین وجمیل بنادے)۔

سرکار کی برکت سے وہ ضائع شدہ آنکھ دوسری آنکھ سے بھی زیادہ حسین ہوگئی اور اس کی بینائی درست آنکھ سے بھی زیادہ تیز ہوگئی اور ایسی صحت یاب ہوئی کہ پوری عمر اسے کبھی آشوبِ چشم کا عارضہ بھی نہ ہوا۔

مشہور محدث ابونعیم اصفہانی روایت کرتے ہیں کہ عامر بن مالک جو "مُلاعِبُ الأَسِنَّة" کے لقب سے مشہور تھے، مرض استسقا میں مبتلا ہوگئے، بہت علاج کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، آخر کار جب ہر طرف سے مایوس ہوگئے تو بارگاہِ رسالت میں قاصد بھیجا کہ

سرکار سے شفا کے لیے دعا کرنے کی گزارش کرے، قاصد بارگاہِ رسالت میں پہنچا اور ان کا حال زار بیان کیا تو رحمتِ عالم ﷺ نے زمین سے کچھ مٹی اٹھائی، اس میں اپنا لعابِ دہن ڈالا، پھر قاصد کو دے کر فرمایا: یہ لے جا کر عامر کو دے دو، وہ قاصد حیرت میں پڑ گیا، اس نے سمجھا کہ شاید حضور نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے، لیکن حضور کے فرمان کے مطابق وہ مٹی لے کر عامر کے پاس گیا، وہ عامر کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ جاں بلب تھے اور موت دروازے پر دستک دے رہی تھی، انہوں نے مٹی کو پانی میں ملا کر پی لیا، سرکار کی برکت سے اسی وقت شفایاب ہو گئے۔

ابن ابی شیبہ، بیہقی، طبرانی اور دیگر محدثین نے روایت کی کہ فدیک بن عمر السلامانی کو بارگاہِ رسالت میں لایا گیا، اس وقت ان کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، سرکار اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے آگے چل رہا تھا کہ میرا پاؤں سانپ کے انڈے پر جا پڑا، فوراً میری بینائی ختم ہو گئی، اب کوئی چیز نظر نہیں آتی، سرکار نے ان کی آنکھوں پر پھونک ماری تو وہ فوراً بینا ہو گئے اور آخری عمر تک ایسی بینائی قائم رہی کہ اسّی سال کی عمر میں بھی وہ سوئی میں دھاگا ڈال لیا کرتے تھے۔

امام احمد، دارمی، طبرانی، بیہقی اور ابو نعیم حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون اپنے لڑکے کو لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ اسے جنون ہے، حضرت نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، لڑکے کو قے ہوئی اور اس میں کالے رنگ کا کتے کا پلا نکلا اور فوراً ہی اسے آرام ہو گیا۔

اس طرح کی بے شمار روایتیں اور واقعات ہیں جن سے اس معجزہ کا ثبوت ملتا ہے، جو احادیث و سیر کی بڑی بڑی کتابوں میں مذکور ہیں، کتنے مبارک تھے وہ لوگ اور کتنی سعادت مند تھیں وہ ہستیاں جنہیں سرکار کے دستِ شفا کا لمس مل گیا اور ان کی بگڑی بن

ی۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ.

محاسن بلاغت: (۱) اس میں صنعتِ تلمیح ہے (۲) اَبْرَأَتْ کی اسناد رَاحَتُہٗ کی طرف مجاز عقلی ہے۔

(۸۷)

وَاَحْیَتِ السَّنَۃَ الشَّھْبَاءَ دَعْوَتُہٗ

حَتّٰی حَکَتْ غُرَّۃً فِی الْاَعْصُرِ الدُّھُمِ

(۸۸)

بِعَارِضٍ جَادَ اَوْ خِلْتَ الْبِطَاحَ بِھَا

سَیْبًا مِّنَ الْیَمِّ اَوْ سَیْلًا مِّنَ الْعَرِمِ

ترجمہ: اور بار ہا ان کی دعا نے قحط رسیدہ سفید سال کو ایسی زندگی بخشی کہ وہ (سرسبزی شادابی کی فراوانی سے) سیاہ ہو جانے والے زمانوں میں پیشانی کے نمایاں سفید نشان کی طرح ہو گیا۔ ایسے بادل کے ذریعہ جو اس قدر جھوم کے برسا کہ معلوم ہوتا ہے سنگلاخ وادیوں پر سمندر کا کوئی ریلا چلا آیا، یا عرم کا سیلاب آ گیا۔

لغات: اَحْیَتْ: ماضی معروف، واحد مونث غائب، از اِحْیَاءٌ بمعنی زندہ کرنا۔ السَّنَۃَ: سال (ج) سَنَوَات وسِنُوْنَ ۔ الشَّھْبَاءَ: اَشْھَبُ کا مونث، یہ شَھَبٌ (س،ک) سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے سیاہی ملے ہوئے سفید رنگ والا ہونا۔ سَنَۃٌ شَھْبَاءُ: قحط رسیدہ سال، جس میں نہ بارش ہو نہ ہریالی۔ دَعْوَتُہٗ: حضور کی دعا، یہ اَحْیَتْ کا فاعل ہے۔ حَکَتْ: (ض) ماضی معروف، از حکایۃٌ بمعنی مشابہت۔ غُرَّۃً: گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی (ج) غُرَر۔ الْاَعْصُر: عَصْرٌ کی جمع، زمانے۔ الدُّھُمُ: اَدْھَمُ کی جمع، سیاہ۔ حدیقۃ دھماءُ: سبز باغ، جس کی سبزی مائل بہ سیاہی ہو۔ عَارِض: افق میں پھیلا ہوا بادل، قرآن کریم میں ہے: ھٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (الاحقاف: ۲۴) (ج) عَوَارِضُ۔ جَادَ: (ن) خوب برسا، جھوم کے برسا۔ اَوْ: پہلا "اَوْ" "حتّٰی" کے معنی میں ہے اور دوسرا عطف کے لیے۔ خِلْتَ: واحد مذکر حاضر، ماضی معروف از خَالَ یَخِیْلُ خَیْلًا وَ خَالًا وَ خَیَلَانًا بمعنی خیال کرنا، گمان کرنا۔ الْبِطَاحُ: سنگلاخ وادیاں، کشادہ

نشیبی زمینیں جہاں سے سیلاب کا پانی گزرتا ہو اور جہاں ریت اور کنکریاں ہوں، واحد اَبطَحُ یا بُطحَاءُ۔ سَیْباً: بہاؤ، ریلا۔ اَلْیَمُّ: سمندر، دریا۔ سَیْلاً: سیلاب (ج) سُیُولٌ۔ اَلْعَرِمِ: عَرِمَۃٌ کی جمع، بمعنی پشتہ یا بند جو پانی کو روکنے کے لیے بنایا گیا ہو، زبردست اور ناقابلِ برداشت سیلاب، جنگلی چوہے (جو سیل عرم کا سبب بنے)۔

تشریح: سیل عرم کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے، سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان نے شہر مآرب یا شہر سبا بسایا تھا، جو صنعاء (یمن) سے تین چار روز کے راستہ پر تھا، اس نے ستر نہریں کھدوا کر اطراف وجوانب کے تمام برساتی پانی کو وہاں اکٹھا کرنے کا سامان کیا اور اس جمع شدہ پانی کو روکنے اور ذخیرہ کرنے کے لیے اس نے دو پہاڑوں کے درمیان مضبوط بند بنوایا، جسے عرم یا سد مآرب کہتے تھے، اس بند میں اوپر نیچے تین دروازے تھے، پانی کی فراوانی کی وجہ سے وہاں کھیتوں اور باغات کی کثرت ہوگئی اور ان باغات میں پھل اس کثرت سے ہوتے تھے کہ اگر ایک عورت اپنے سر پر ٹوکری رکھ کر درختوں کے نیچے سے گزر جاتی تو بغیر پھل توڑے اور ڈال ہلائے ٹوکری بھر کر گھر لاتی اور قدرتی طور پر یہ شہر ایسا صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا کہ مچھر، مکھی، پسو، کھٹمل، سانپ، بچھو وغیرہ موذی جانور اور کوئی بیماری یہاں نہ تھی، اگر مچھر، مکھی، پسو، کھٹمل لے کر باہر کا کوئی مسافر اس شہر میں آتا تو یہاں کی ہوا کی وجہ سے وہ سب فوراً مر جاتے، مگر وہاں کے باشندے بڑے ناشکرے، سرکش اور خدا ناترس تھے، انہوں نے اللہ کی ان عظیم الشان نعمتوں کی ناشکری کی اور کہنے لگے ہم خدا کو نہیں جانتے کہ اس نے ہم پر یہ نعمتیں نازل کیں اور اللہ کے فرستادہ پیغمبروں کو جھٹلایا، اس قوم کی ہدایت کے لیے اللہ نے تیرہ رسول مبعوث فرمائے اور سب نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر اس کا شکر بجالاؤ، مگر انہوں نے ان کی نصیحتیں نہ سنیں اور ایمان نہ لائے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر چوہے مسلط کردیے جو اندھے تھے، انہوں نے بند میں سوراخ کردیے جس سے وہ بند ٹوٹ گیا اور پانی کا ایسا زبردست سیلاب آیا جو ان کے

باغات اور مکانات کو بہالے گیا اور وہ سب اسی میں غرق ہو گئے، اس کا تذکرہ قرآن کریم کی درج ذیل آیتوں میں ہے: لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا ۖ وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ۝ (سورہ سبا، آیت ۱۵ تا ۱۷، پ ۲۲)۔

ترجمہ: (بے شک سبا کے لیے ان کی آبادی میں نشانی تھی، دو باغ داہنے اور بائیں، اپنے رب کا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو، پاکیزہ شہر اور بخشنے والا رب، تو انہوں نے منہ پھیرا تو ہم نے ان پر زور کا سیلاب بھیجا اور ان کے باغوں کے عوض دو باغ انہیں بدل دیے، جن میں بکٹا میوہ، جھاؤ اور کچھ تھوڑی سے بیریاں، ہم نے انہیں یہ بدلہ دیا ان کی ناشکری کی سزا اور ہم کسے سزا دیتے ہیں، اسی کو جو ناشکرا ہے)۔

دونوں اشعار کا مطلب یہ ہے کہ بارہا سرکار کی دعا کی برکت سے بادلوں سے ایسی زوردار اور موسلا دھار بارش ہوئی کہ لگتا تھا کہ سنگلاخ وادیوں پر سمندر کا کوئی ریلا چلا آیا، یا عرم کا سیلاب آ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قحط رسیدہ سال جن میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین سے پیڑ پودے، سبزے اور ہریالی نیست و نابود ہو چکی تھی اور سفید ہو چکے تھے وہ ایسے سرسبز و شاداب اور ہرے بھرے ہو گئے کہ عام ہرے بھرے سالوں سے وہ نمایاں و ممتاز ہو گئے جیسے گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی نمایاں اور ممتاز ہوتی ہے۔

اس شعر میں ان واقعات کی جانب اشارہ ہے جن میں سرکار اقدس ﷺ کی دعاؤں کی برکت سے موسلا دھار بارش ہونے کا تذکرہ ہے، اس طرح کی متعدد روایتیں ہم نے مقدمہ میں ''فکری تجزیہ'' کے اندر ''نزول باران رحمت'' کے عنوان کے تحت ذکر کی ہیں، طالب تفصیل کے لیے وہاں تسکین خاطر کا بھرپور سامان موجود ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) ''اَحْيَتْ'' میں استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے، یا ''السَّنَةَ

الشَّهْبَـــآءَ ''میں استعارۂ مکنیہ اصلیہ ہے، اس طرح کہ اسے ایک مردہ انسان سے تشبیہ دے کر مشبہ بہ کو حذف کر دیا اور اس کے متعلقات ومناسبات میں سے ''اِحْیَـــاء'' (زندہ کرنا) کو ذکر کیا (۲) پھر ''السَّـــنَةَ الشَّهْبَـــآءَ ''میں دوسری حیثیت سے بھی استعارۂ مکنیہ اصلیہ ہے، اس لیے کہ یہاں اس سے مراد قحط رسیدہ سال ہے، تو ''السنۃ'' کو ''الفرس'' (گھوڑا) سے تشبیہ دی، پھر مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کے مناسبات میں سے ''الشھباء'' کو ذکر کیا، اسی طرح ''الأعصر الدهم ''میں بھی استعارہ بالکنایہ ہے (۳) ''الشھباء'' (سفید) اور ''الدھم'' (سیاہ) کو یک جا ذکر کرنا صنعتِ طباق ہے (۴) اس شعر میں 'السَّـــنَةَ الشَّهْبَاءَ'' کو ''غـرة'' سے تشبیہ دی گئی ہے اور کلمۂ تشبیہ ''حَـكَتْ'' ہے (۵) اس میں سرکار کے معجزہ کی طرف تلمیح بھی ہے۔

اور دوسرے شعر میں (۱) ''سیبـاً'' اور ''سیلاً'' کے درمیان تجنیس لاحق ہے (۲) ''سیلاً من العرم''میں شہر سبا کے واقعہ کی جانب تلمیح ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔

الفصل السادس
فی ذکر شرف القراٰن ومدحہٖ

دَعْنِيْ وَوَصْفِيْ اٰيَاتٍ لَّهٗ ظَهَرَتْ
ظُهُوْرَ نَارِ الْقِرٰى لَيْلاً عَلٰى عَلَمٖ (۸۹)

ترجمہ: مجھے حضور کے معجزات وآیات بیان کرنے دے جو یوں روشن ہیں جیسے پہاڑی پر جلائی جانے والی مہمانی کی آگ رات کے وقت روشن ہوتی ہے۔

لغات: دَعْ: امر حاضر معروف از وَدَعَ یَدَعُ، چھوڑ۔ آیات: آیۃٌ کی جمع، معجزات۔ الْقِرٰی: ضیافت، مہمانی۔ عَلَمٌ: پہاڑ (ج) اَعْلَام۔

تشریح: قدیم زمانے میں شرفاے عرب کا یہ دستور تھا کہ وہ جب دعوت کرتے تو آج کل کی طرح دعوت نامے بھیجنے یا زبانی دعوت دینے کی بجاے کسی پہاڑ پر کچھ خشک لکڑیاں جلادیتے، رات کی تاریکی میں آگ کے بھڑکتے ہوے شعلے اور ان سے پھیلنے والی روشنی لوگوں کے لیے عام دعوت کا اعلان ہوتی، رات کی تاریکی میں بلند پہاڑ پر جلنے والی آگ حد درجہ نمایاں اور روشن ہوتی کہ دور دراز مقامات سے بھی لوگ اسے دیکھ لیا کرتے تھے اور قافلوں کا رخ اس کی جانب ہو جایا کرتا تھا، امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اے مخاطب! مجھے سرکار کے ان معجزات وآیات کو بیان کر لینے دے جو رات کی تاریکیوں میں بلند وبالا پہاڑوں پر جلائی جانے والی آتش دعوت وضیافت کی طرح روشن وتاباں اور نمایاں ہیں اور مجھے مختصر گوئی کی نصیحت نہ کر، کیوں کہ محبوب کا تذکرہ محبّ کے لیے تسکین قلب کا سامان ہوتا ہے اور اسے وصال محبوب ہی کی طرح اس میں بھی لطف ولذت ملتی ہے، سچ ہی

کہا ہے کسی نے: ع ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

محاسن بلاغت: (۱) یہاں "ظَھَرَتْ" اور "ظھور" کو یک جا کرنا ذکر صنعتِ اشتقاق ہے (۲) ظہورِ آیات کی ظہورِ نار سے تشبیہ، تشبیہِ بلیغ ہے۔

فَالدُّرُّ يَزْدَادُ حُسْناً وَهُوَ مُنْتَظِمٌ (۹۰)
وَلَيْسَ يَنْقُصُ قَدْراً غَيْرَ مُنْتَظِمِ

ترجمہ: کیوں کہ لڑی میں پروئے ہوئے موتی کا حسن زیادہ ہوتا ہے، گو بن پروئے بھی اس کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی۔

لغات: اَلدُّرُّ: موتی، واحد: دُرَّةٌ (ج) دُرَرٌ وَ دُرَّاتٌ ، فَالدُّرُّ میں فا برائے تعلیل ہے۔
مُنْتَظِمٌ: پرویا ہوا۔

تشریح: یہ شعر معنوی حیثیت سے گزشتہ شعر سے مربوط ہے، اس میں امام بوصیری علیہ الرحمہ ایک اعتراض کو دفع کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ پہلا شعر یہ بتا رہا ہے کہ سرکار کے معجزات حد درجہ نمایاں اور روشن ہیں، جیسے رات میں پہاڑی پر جلائی جانے والی آگ نمایاں ہوتی ہے تو اس سے ذہن کے پردے پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ جو بات حد درجہ روشن اور واضح ہے جسے ہر شخص جانتا ہے اسے بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ بات تو وہ بتائی جاتی ہے جو پوشیدہ ہو، جس کو لوگ نہ جانتے ہوں، کیوں کہ واضح بات کو جان کاروں کے سامنے بیان کرنا ایسے ہی ہے جیسے: ع اظہارِ بوئے مشک غزالوں کے سامنے

امام بوصیری علیہ الرحمہ اسی وسوسہ کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سرکار اقدس ﷺ کے معجزات سچے موتیوں کی طرح ہیں، جس طرح آبدار موتیوں کو لڑی میں پرو دیا جاتا ہے تو ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے، گو بغیر پروئے ہوئے بھی ان کی اصلی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی، اسی طرح سرکار اقدس ﷺ کے معجزات کا حال ہے کہ انہیں شعر اور نظم کی لڑیوں میں پرو دینے سے ان کا حسن و جمال بہت بڑھ جاتا ہے، سننے والوں کو وہ بھلے

معلوم ہوتے ہیں، ان پر ایک کیفیت اور سرمستی سی چھا جاتی ہے، جب کہ نثر کی صورت میں یہ بات نہیں ہوتی۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ معجزات کو نظم کی صورت میں بیان کرنا تو ذکرِ محبوب کا ایک بہانہ ہے، وہ دراصل کسی نہ کسی طرح محبوب کا تذکرہ کر کے اپنے قلبِ سرگشتہ کی تسکین کا سامان کرنا چاہتے ہیں، عاشق کا مطمحِ نظر تو ذکرِ محبوب ہوتا ہے خواہ وہ کسی صورت میں ہو:

باغ میں شکرِ وصل تھا، ہجر میں ہائے ہائے گل

کام ہے ان کے ذکر سے، خیر وہ یوں ہوا کہ یوں

محاسن بلاغت: (۱) اس میں صنعتِ مقابلہ ہے، کیوں کہ پہلے مصرعے میں ''یَزْدَادُ'' اور ''مُنْتَظِمٌ'' کو نظم کیا ہے، جب کہ دوسرے مصرعہ میں ان کے مقابل ''یَنْقُصُ'' اور ''غَیْرُ مُنْتَظِمٌ'' کو ترتیب وار ذکر کیا ہے (۲) اس میں صنعتِ ردالعجز علی الصدر بھی ہے۔

(۹۱)

فَمَا تَطَاوَلَ اٰمَالُ الْمَدِیْحِ اِلٰی

مَا فِیْهِ مِنْ كَرَمِ الْاَخْلَاقِ وَالشِّیَمِ

ترجمہ: (آیات نبوی کے ذکر سے شرف اندوزی پر اکتفا اس لیے) کہ آپ کے بلند اخلاق وعادات تک مدح کی آرزوؤں کی رسائی نہیں۔

لغات: فَمَا تَطَاوَلَ: ''فَا'' برائے تعلیل ہے یا برائے عطف، ''مَا'' یا تو نافیہ ہے یا استفہامِ انکاری کے لیے، نافیہ ہونے کی صورت میں ''تَطَاوَلَ'' فعل ماضی معروف ہے اور ''اٰمَالُ الْمَدِیْحِ'' اس کا فاعل، اور ''مَا'' کے استفہامیہ ہونے کی صورت میں وہ خود مبتدا ہوگا، اور ''تَطَاوُلُ'' مصدر ''اٰمَالُ الْمَدِیْحِ'' کی جانب مضاف، اس کی خبر ہوگی، اور دونوں صورتوں میں شعر کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا، کیوں کہ استفہام انکاری کا مفاد بھی نفی ہی ہوتا ہے، ''تَطَاوُلُ'' کسی چیز کو دیکھنے کے لیے گردن دراز کرنا، یہاں مراد ہے رسائی حاصل کرنا۔ **آمَال:** اَمَلُ کی جمع، آرزو، امید۔ **الْمَدِیْحُ:** مدح وستائش، تعریف، (ج) مدائح۔ **الشِّیَمُ:** شِیْمَة کی جمع، اخلاق وعادات۔

تشریح: اس شعراور گزشتہ شعر دونوں کا تعلق گزشتہ سے پیوستہ شعر سے ہے، یہ دونوں اس کی تعلیل ہیں، اب تینوں کا شعروں کا مفہوم یہ ہوا کہ اے مخاطب! بے شک حضرت کے معجزات ایسے روشن ہیں جیسے پہاڑی پر شبِ دیجور میں جلائی جانے والی آتش ضیافت، مگر میں سرکار کے اخلاق وعادات کا بیان شروع نہ کرکے آپ کے معجزات وآیات ہی کا بیان جاری رکھوں گا، دو وجہوں سے، اول یہ کہ نظم کی صورت میں ان کے ذکر کرنے سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ آب دار موتیوں کی مانند ہیں جن کا حسن و جمال لڑی میں پروئے جانے سے ذروۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے، دوم یہ کہ سرکار کے بلند اخلاق وعادات کی کوئی حد ونہایت نہیں، اس لیے کسی مداح کی آرزوؤں کی رسائی ان تک نہیں ہو سکتی اور کوئی انسان ان کا احاطہ نہیں کرسکتا۔

اے رضا خود صاحبِ قرآں ہے مداحِ حضور
تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

(۹۲)
آیـاتُ حَـقٍّ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثَةٌ
قَـدِيـمَةٌ صِـفَـةُ الْمَوْصُوْفِ بِالْقِدَمِ

ترجمہ: یہ رحمٰن کی سچی قدیم آیات ہیں، جو واجب تعالیٰ کی قدیم ذات کی صفت ہیں اور ظہور میں جدید اور تازہ ہیں۔

لغات: حقّ: سچی، ''آیاتُ حقٍّ'' میں اضافۃ الموصوف الیٰ الصفۃ ہے اور یہ مبتداے محذوف ''اعظم المعجزات'' کی خبر ہے، یا یہ مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے، اصل عبارت ''من المعجزات آیات حق'' ہے، یہاں آیات سے مراد آیاتِ قرآن ہیں، جو سرکار اقدس ﷺ کا لازوال، ابدی وسرمدی معجزہ ہیں۔ مُحْدَثَةٌ: تازہ، نو بہ نو، حادث، اسم مفعول از اِحْداث۔ الموصوف بالقدم: قدیم، مراد ذات الٰہی۔

تشریح: یہاں سے شعر نمبر ۱۰۵ تک آیاتِ قرآن کا ذکر ہے، جو اللہ تعالیٰ کا لازوال کلام،

اس کی ازلی وابدی اور قدیم صفت ہے اور رسول اللہ ﷺ کا دائمی وسرمدی معجزہ ہے، یہ نزول کے اعتبار سے تازہ اور نو بہ نو ہیں، اگر چہ اپنے معنی اور حقیقت کے لحاظ سے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ قدیم کی صفت ہونے کی حیثیت سے قدیم ہیں۔

حکم الٰہی کے لیے "مُحدَث" کی صفت خود قرآن کریم میں بھی وارد ہے:

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ۝ (سورہ انبیاء آیت ۲)

(ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس جو بھی تازہ نصیحت آتی ہے اسے وہ ہنسی کرتے ہوئے سنتے ہیں)۔

اور ایک مقام پر یوں ہے:

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ۝ (۵/۲۶)

(اور ان کے پاس خدائے رحمان کی جانب سے جو بھی تازہ فہمائش آتی ہے وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں)۔

سوال: حادث اور قدیم باہم متضاد ہیں، اور متضاد چیزوں کا بیک وقت کسی ایک شے میں جمع ہونا محال و ناممکن ہے، تو ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ آیاتِ قرآن قدیم بھی ہوں اور حادث بھی؟

جواب: متضاد چیزوں کا ایک ہی حیثیت سے، ایک ہی وقت میں کسی شے کے ساتھ پایا جانا محال و ناممکن ہے، لیکن اگر وقت بدل جائے، یا حیثیت میں تبدیلی ہوجائے تو ایک ہی شے کے ساتھ ان کا پایا جانا نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے، آیات قرآن کے ساتھ ان دونوں متضاد صفتوں کا پایا جانا ایک ہی حیثیت سے نہیں بلکہ مختلف حیثیتوں سے ہے، واجب تعالیٰ کی صفت ہونے کی حیثیت سے وہ قدیم ہیں اور اپنے ظہور کے اعتبار سے حادث اور تازہ ہیں، جیسا کہ ہمارے ترجمہ اور تشریح سے واضح ہے۔

علمائے کرام اس موقع پر یہ کہتے ہیں کہ کلام کی دو قسمیں ہیں (۱) کلام لفظی، جو آواز اور لفظ کی قبیل سے ہے (۲) کلام نفسی، جو آواز کی جنس سے نہیں، عربی زبان کا مشہور اور

باکمال شاعر اخطل کہتا ہے:

اِنَّ الْکَلَامَ لَفِي الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَى الْفُؤَادِ دَلِیْلاً

(یعنی کلام درحقیقت دل میں ہوتا ہے اور زبان کو تو بس دل کا ترجمان بنا دیا گیا ہے)۔

حادث کلام لفظی ہے اور قدیم کلام نفسی ہے، جو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، صاحبِ عصیدۃ الشہدۃ علامہ عمر بن احمد خرپوتی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

کلام باری تعالیٰ کے بارے میں سات مذہب ہیں:

(۱) مذہب اشاعرہ یہ ہے کہ کلام الٰہی کی دو قسمیں ہیں، اول: لفظی جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے، یہ حادث ہے، دوم: نفسی، جو قدیم اور ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، اس میں نہ حرف ہوتا ہے نہ آواز، بلکہ وہ صرف اور صرف معنی ہے، ان حضرات کے نزدیک اس معنی کو سنا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرا مذہب امام ابو منصور ماتریدی کا ہے، ان کے اور اشاعرہ کے مذہب میں صرف سماعت کا فرق ہے، اشاعرہ کلام نفسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسے سنا جا سکتا ہے اور یہ اسے ممکن نہیں مانتے، بلکہ کہتے ہیں جو سنا جائے وہ کلام لفظی ہی ہے، کلام نفسی نہیں۔

(۳) تیسرا مذہب متاخرین میں سے صاحبِ مواقف اور ان کے متبعین کا ہے، ان کا کہنا ہے کہ کلام دو طرح کا ہے، ایک تو وہ جو مصاحف میں لکھا ہوا اور دلوں میں محفوظ ہے، یہ کلام لفظی ہے اور حادث ہے، دوسرا کلام نفسی قدیم، یہ غیر مرتب لفظ اور معنی سے عبارت ہے۔

(۴) چوتھا مذہب علامہ جلال الدین محقق دوّانی کا ہے، ان کے نزدیک بھی کلام لفظی تو وہی ہے جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور سینوں میں محفوظ ہے اور یہ حادث ہے، اور کلام نفسی وہ ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے اور لفظ و معنی کا مجموعہ ہے جو مرتب بترتیب علمی ہے اور قدیم ہے۔

(۵) پانچواں مذہب حنابلہ کا ہے، ان کا ماننا یہ ہے کہ کلام الٰہی درحقیقت ایک ہی ہے جو حروف و اصوات کا مجموعہ ہے اور یہ قدیم ہے، ان میں سے بعض نے تو مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ قرآن کریم کی جلد اور غلاف بھی حادث نہیں بلکہ قدیم ہیں، یہ لوگ کلام نفسی کے منکر ہیں۔

(۶) چھٹا مذہب معتزلہ کا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ کلام الٰہی ایک ہی ہے، جو حادث حروف و اصوات کا مجموعہ ہے، لیکن یہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ مخلوق کے ساتھ قائم ہے، مثلاً لوح محفوظ، قلب جبریل، قلب نبی، شجر موسیٰ کے ساتھ۔

(۷) ساتواں مذہب کرّامیہ کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ کلام الٰہی ایک ہی ہے، یہ حروف واصوات سے مرکب اور حادث ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ ہی کے ساتھ قائم ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ موخر الذکر تینوں فرقے کلام نفسی کے منکر ہیں، اس مقام پر مذاہب کی تفصیل اس لیے ذکر کردی تا کہ وہ اشارات روشن ہوجائیں جو امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اس شعر میں کیے ہیں، چنانچہ آیات قرآن کو مُحدَثَۃٌ کہنا حنابلہ کے مذہب کو رد کرنے کے لیے ہے، کیوں کہ وہ انہیں کسی بھی حیثیت سے حادث نہیں مانتے، بلکہ ہر اعتبار سے انہیں قدیم ہی کہتے ہیں، اور قدیمۃ کہہ کر کرّامیہ کا رد کیا، کیوں کہ وہ انہیں صرف حادث ہی مانتے ہیں اور ''صِفَۃُ الْمَوْصُوْفِ بِالْقِدَمِ'' کہنے میں معتزلہ کا رد ہے، کیوں کہ وہ انہیں خدائے قدیم کے ساتھ قائم نہیں مانتے، بلکہ مخلوق کے ساتھ قائم مانتے ہیں۔

فائدہ: کلام الٰہی کے سلسلے میں مذاہب کی تفصیل سے ظاہر ہے کہ مذکورۃ الصدر چار مذاہب میں کلام الٰہی کی دو قسمیں مانی گئی ہیں، (۱) کلام نفسی (۲) کلام لفظی، مگر صاحب بصیرت پر ظاہر ہے کہ یہ تقسیم ہی محل نظر ہے، اگرچہ شرح عقائد وغیرہ علم کلام کی مستند کتابوں میں یہ تقسیم ذکر کی گئی ہے، مگر یہ درحقیقت متکلمین کا تسامح ہے، آپ خود سنجیدگی سے غور کریں تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جب ہم نے اس کلام کو کلام باری مان لیا تو اس کے حادث ہونے کا کیا سوال؟ وہ تو قدیم اور صرف قدیم ہے، حقیقت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی ذات وصفات کا ادراک بہت مشکل ہے، یہ صرف اہل کشف کا کام ہے، حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اَلْعَجْزُ عَنْ دَرْکِ الذَّاتِ اِدْرَاکٌ.

اور حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں:

اَلْبَحْثُ عَنْ سِرِّ الذَّاتِ اِشْرَاکٌ.

(ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کی تلاش میں پڑنا شرک ہے، یعنی کفر تک پہنچانے والی چیز ہے)۔

متکلمین نے صرف تقریبِ فہم کے لیے کلام اللہ کی دو قسمیں کی ہیں، ورنہ حقیقت میں اس کا ادراک عقل سے ماورا ہے، کیوں کہ حقیقتاً کلام اللہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے، مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ ''اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَدُ'' کے حاشیہ ''اَلْمُعْتَمَدُ الْمُسْتَنَدُ'' میں فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ نفسی اور لفظی کی تقسیم متاخرین نے معتزلہ کو خاموش کرنے اور پست عقول کو سمجھانے کی خاطر کی ہے، جس طرح متاخرین نے متشابہات میں تاویل کی راہ اختیار کی ہے، درحقیقت مذہب وہی ہے جس پر ائمۂ سلف ہیں کہ کلام باری تعالیٰ واحد ہے، جس میں کسی طرح کوئی تعدد نہیں''۔

(المعتمد المستند مع المعتقد، ص ۳۵، مطبوعہ رضا اکیڈمی، ممبئی)۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''وہی قرآن جو باری تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے جو اس کی ذات سے ازلاً وابداً قائم و مستحیل الانفکاک ہے، وہی ہماری زبانوں سے متلو، ہمارے کانوں سے مسموع، ہمارے اوراق میں مکتوب، ہمارے سینوں میں محفوظ ہے، نہ یہ کہ کوئی جدا شے قرآن پر دال ہے، نہیں نہیں! یہ سب اسی کی تجلیاں ہیں، حقیقتاً وہی متجلی ہے، بغیر اس کے کہ وہ ذاتِ الٰہی سے جدا ہو، یا کسوتوں (لباسوں) کے حدوث سے اس کے دامن قِدم پر کوئی داغ آیا ہو، یا ان کے تکثر سے اس کی طرف تعدد راہ پایا ہو''۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں ''قدیمۃ'' اور ''محدثۃ'' کے اجتماع میں صنعتِ طباق ایجاب ہے (۲) اور ''قدیمۃ'' اور ''القِدَم'' کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۳) ''قدیمۃ''

کو مصرعہ دوم کے آغاز میں اور ''القِدَم'' کو شعر کے آخر میں لانا صنعتِ رد العجز علی الصدر ہے
(۴) اور آیات کی متعدد صفتیں پیہم ذکر کرنا صنعتِ تنسیق الصفات ہے۔

لَمْ تَقْتَرِنْ بِزَمَانٍ وَّهْيَ تُخْبِرُنَا ..
(۹۳)
عَنِ الْمَعَادِ وَ عَنْ عَادٍ وَّعَنْ اِرَمٖ

ترجمہ: یہ کسی خاص زمانے سے محدود نہیں، مگر آئندہ و گزشتہ کے حالات مثلاً آخرت اور قوم عاد و ارم سے متعلق ہمیں خبردار کرتی ہیں۔

لغات: لَمْ تَقْتَرِنْ: متصل نہیں، ملی ہوئی نہیں۔ الْمَعَادُ: یہ یا تو اسم ظرف ہے یا مصدر میمی، پہلی صورت میں اس کا معنی ہے جائے بازگشت، لوٹنے کی جگہ، اور دوسری صورت میں اس کا معنی ہے لوٹنا، یعنی مخلوق کا بعدِ فنا دوبارہ زندہ ہو کر بارگاہِ خداوندی میں جانا، بہر حال اس سے مراد عالم آخرت ہے۔ عَـاد: ایک قوم کا نام ہے، جس کی ہدایت ورہنمائی کے لیے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا، اصل میں یہ ایک شخص کا نام جس کی نسل سے یہ قوم وجود میں آئی، اس کا پورا نام ونسب یہ ہے: ''عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح''، اس شخص نے بارہ سو سال کی طویل عمر پائی، اور اپنی نسل سے چار ہزار اولاد کو بچشم سر دیکھا اور ایک ہزار عورتوں سے شادی کی، یہ کافر تھا اور چاند کی پرستش کرتا تھا، اس کی اولاد میں پہلوں کو ''عادِ اُولیٰ'' اور بعد والوں کو ''عادِ اُخریٰ'' کہا جاتا ہے، اور اِرَم بھی اسی قوم کا دوسرا نام ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ ''اِرَم'' سے مراد وہ شہر ہے جسے شدّاد بن عاد نے جنت کا ذکر سننے کے بعد اس کے مقابلہ میں ''عدن'' میں سونے چاندی کی اینٹوں سے تعمیر کرایا تھا، جس کی تباہی کی داستان قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ○ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ○ (پ ۳۰، ع ۱۴، آیت ۷-۸)

تشریح: اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم ایک سدابہار صحیفۂ ہدایت ہے، یہ زمان ومکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہے، کیوں کہ یہ خداوند قدوس کا کلام اور اس کی صفت ہے،

یہ اس وقت بھی تھا جب کہ نہ زمان تھا نہ مکان، اس کے باوجود اس کی آیات میں گزشتہ اور آئندہ زمانوں کی خبریں اور داستانیں بیان کی گئی ہیں جیسے قوم عاد اور اِرَم کے قصے اور آخرت میں پیش آنے والے واقعات۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں ''معاذ'' اور ''عاذ'' کے درمیان تجنیس مردوف ہے۔

(۹۴)

دَامَتْ لَدَيْنَا فَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ
مِنَ النَّبِيِّينَ اِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

ترجمہ: یہ آیات ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس موجود ہیں، لہٰذا انبیاے کرام کے سارے معجزات پر انہیں تفوق و برتری حاصل ہے، کیوں کہ وہ ظہور میں تو آئے مگر باقی نہ رہے۔

لغات: دَامَتْ: ہمیشہ رہیں، صیغہ واحد مونث غائب، فعل ماضی معروف از نصر ینصر۔ فَاقَتْ: (ن) اوپر ہونا، برتری حاصل کرنا۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انبیاے کرام کے تمام معجزے سچے اور برحق ہیں اور ان کی نبوت کی دلیل ہیں، لیکن یہ سارے معجزے وقتی تھے، ایک خاص وقت میں خاص جگہ رونما ہوئے اور اپنی جلوہ سامانیوں اور تابانیوں سے بہت سے افراد کو راہِ ہدایت دکھا کر ختم ہو گئے، لیکن قرآن کریم ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ کا وہ دائمی معجزہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا، ہر وقت تازہ، ہر لمحہ زندہ، ہر دم رواں دواں ہے، اور انبیاے کرام کے معجزے ان کی حیات ظاہری میں اپنے اثرات دکھاتے رہے اور انبیاے کرام کے پردہ فرمانے کے ساتھ ساتھ ان کے اثرات بھی جاتے رہے اور خود بھی روپوش ہو گئے، مگر سرکار اقدس ﷺ کا معجزہ قرآن وہ زندہ معجزہ ہے، جو سرکار کے پردہ فرمانے کے بعد بھی آج تک ہمارے پاس موجود ہے اور اسی طرح قیامت تک ہمارے سینوں میں، ہمارے گھروں میں، ہماری زبانوں پر، ہمارے بچوں کی زبانوں پر باقی رہے گا اور اپنے روحانی انوار و برکات سے ہمیں بہرہ مند کرتا رہے گا، اس طرح سرکار کے اس معجزہ کو دیگر انبیاے کرام کے معجزوں پر تفوق اور برتری حاصل ہے۔

فائدہ: معجزہ اس خلاف عادت کام کو کہتے ہیں جو منکرین کے انکار کے وقت مدعیِ نبوت سے ظاہر ہوتا ہے اور مخالفین اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہتے ہیں۔

خلاف عادت ظاہر ہونے والی چیزوں کی آٹھ صورتیں ہیں، کیوں کہ خلاف عادت ظہور میں آنے والی شے یا تو مومن سے ظاہر ہوگی یا کافر سے، پھر مومن کی بھی کئی صورتیں ہیں، یا تو وہ خاصان خدا میں سے ہوگا یا نہیں، خاصان خدا میں سے ہو تو نبی ہوگا یا ولی اور نبی سے ظاہر ہو تو قبل بعثت ظاہر ہوگی یا بعدِ بعثت، پھر خاصان خدا میں سے نہ ہونے کی صورت میں یا تو وہ مومن صالح ہوگا یا فاسق، اور کافر سے ظاہر ہونے والی چیز میں یا تو اس میں تعلیم و تعلم اور سیکھنے سکھانے کا عمل دخل ہوگا یا نہیں، اگر بلا تعلیم و تعلم ہو تو یا تو مقصد کے عین مطابق ظہور میں آئے گی، یا مقصد کے خلاف۔ اس طرح خوارق عادت کی آٹھ قسمیں ہوئیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) ارہاص: وہ خلاف عادت چیز جو کسی نبی سے قبل بعثت ظاہر ہو، جیسے حضورِ اکرم ﷺ کی ولادتِ طیبہ کے وقت رونما ہونے والے خلاف عادت امور، مثلاً نوشیرواں کے محل میں زبردست زلزلہ آنا اور چودہ کنگروں کا گر جانا، ہزار برس سے مسلسل جلنے والے آتش کدۂ فارس کا دفعتاً سرد پڑ جانا، بُحَیرَہ ساوہ کا خشک ہو جانا وغیرہ۔

(۲) معجزہ: وہ خلاف عادت چیز جو کسی نبی کے ہاتھوں بعدِ بعثت ظہور میں آئے، جیسے درختوں کا سجدہ کرتے ہوئے سرکارِ اقدس ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو جانا، مقام صہبا میں ایک انگلی کے اشارہ سے ڈوبے ہوئے سورج کا پلٹ آنا، وغیرہ۔

(۳) کرامت: وہ خلاف عادت چیز جو کسی ولی سے رونما ہو۔

(۴) مَعُونَت: وہ خلاف عادت چیز جو کسی عام مومن صالح سے ظہور میں آئے۔

(۵) اِستِدرَاج: وہ خلاف عادت چیز جو کسی مومن فاسق سے ظاہر ہو۔

(۶) سحر: وہ خلاف عادت چیز جو کافر یا فاسق سے رونما ہو اور اس میں تعلیم و تعلّم اور سیکھنے سکھانے کا عمل دخل ہو۔

(۷) اِبتلا: وہ خلاف عادت کام جو کسی کافر کے ہاتھوں رونما ہو اور اس میں سیکھنے سکھانے کا دخل نہ ہو اور وہ اس کے مقصد کے مطابق ہو، جیسے دجال اکبر سے عالم وجود میں آنے والے امور وافعال۔

(۸) اہانت: وہ خلاف عادت کام جو کسی کافر کے ہاتھوں بلاتعلیم وتعلم ظاہر ہو اور اس کے مقصد کے خلاف ہو، جیسے مُسَیلمہ کذّاب سے رونما ہونے والا خلاف عادت واقعہ کہ اس نے ایک بھینگے کی آنکھ صحیح ہونے کی دعا کی تو اس کی دوسری آنکھ بھی بھینگی ہوگئی۔ (عصیدة الشهدة بتغيير وزيادة، ص۱۵۶)۔

محاسن بلاغت: (۱) ''دَامت'' اور ''لَم تدُم'' کا ایک شعر میں لانا طباق سلب ہے (۲) ان دونوں لفظوں کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۳) اور ان میں سے ایک کا مصرعۂ اول کے شروع میں اور دوسرے کا شعر کے آخر میں لانا صنعتِ ردالعجز علی الصدر ہے۔

(۹۵)

مُحَكَّمَاتٌ فَمَا يُبْقِيْنَ مِنْ شُبَهٍ

لِذِيْ شِقَاقٍ وَّلَا يَبْغِيْنَ مِنْ حَكَمٍ

ترجمہ: یہ آیات محکم اور ٹھوس ہیں تو یہ کسی مخالف کے لیے شک وشبہہ کی گنجائش نہیں چھوڑتیں اور نہ ہی کسی ثالث اور حَکَم کی محتاج ہیں۔

لغات: مُحَكَّمَاتٌ: اسم مفعول از تحکیم بمعنی ٹھوس بنانا، یا حکم اور ثالث بنانا، یا حاکم اور غالب کرنا، یا حکمت سے پُر کر دینا، اس طرح اس کے معنی میں چار احتمال ہیں، میں نے ترجمہ میں احتمال اول اختیار کیا ہے۔ مِنْ: زائدہ ہے۔ شُبَه: شکوک وشبہات، یہ شُبْهَةٌ کی جمع ہے۔ شِقَاقٌ: مخالفت، ذُوْشِقَاقٍ: مخالف۔ لَا يَبْغِيْنَ: طلب نہیں کرتیں، فعل مضارع منفی معروف، صیغہ جمع مؤنث غائب۔ حَكَم: ثالث فیصل، (ج) حَكَمَةٌ۔ مِنْ: زائدہ ہے۔

تشریح: قرآنی آیات، کلامِ الٰہی اور روشن صحیفۂ ہدایت ہیں، یہ فصاحت وبلاغت، معانی ومفاہیم، ہر اعتبار سے محکم، پختہ اور ٹھوس ہیں، ان میں کہیں ڈھیلا پن، ناہمواری اور کمزوری

ہیں، نہ مفہوم پیچیدہ اور گنجلک ہے، نہ معنی میں نقص وفتور ہے، اس لیے ان میں کسی مخالف کے لیے شک وشبہہ کی گنجایش نہیں اور نہ ہی ان کے لیے کسی ثالث اور فیصل کی ضرورت ہے۔

اس معنی کر اس شعر میں درج ذیل آیتِ کریمہ کی جانب اشارہ ہے:

الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝ (ھود، پ ۱۱، آیت ۱)

(یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں محکم اور استوار کی گئی ہیں، پھر حکمت والے خبر دار کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے)۔

مذکورہ بالا شرح وبیان سے واضح ہوگیا کہ اس شعر میں ''محکمات'' سے لغوی معنی مراد ہے، اصطلاحی نہیں، اس سے بعض ذہنوں میں کھٹکنے والا یہ شبہہ بھی جاتا رہا کہ اس شعر میں قرآن کی تمام آیات کو محکم کس طرح کہا گیا ہے، حالاں کہ علماے اصول کے مطابق قرآن میں محکم، مفسر، نص، ظاہر، خفی، مشکل، مجمل اور متشابہ کل آٹھ قسم کے کلمات اور آیات ہیں، حاصل جواب یہ ہے کہ اصولیین نے اپنے مقرر کردہ خاص اصطلاحی معنی کے اعتبار سے قرآن کے کلمات اور آیات کو ان آٹھ قسموں میں تقسیم کیا ہے اور امام بوصیری نے یہاں شعر میں لغوی معنی مراد لیے ہیں، لہٰذا کوئی اشکال واعتراض نہیں۔

محاسن بلاغت: (۱) ''محکمات'' اور ''حکم'' کے درمیان تجنیس شبہِ اشتقاق ہے (۲) ان میں سے ایک کو شعر کے شروع میں اور دوسرے کو آخر میں لانا صنعتِ ردالعجز علی الصدر ہے (۳) اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے۔

(۹۶)

مَاحُوْرِبَتْ قَطُّ اِلَّا عَادَ مِنْ حَرَبٍ
اَعْدَی الْاَعَادِيْ اِلَيْهَا مُلْقِيَ السَّلَمِ

ترجمہ: جب بھی کسی سخت سے سخت دشمن نے ان آیات کا مقابلہ کیا، ناکام ہوکر جنگ سے صلح کی طرف آیا۔

لغات: مَاحُوْرِبَتْ: واحد مونث غائب، فعل ماضی منفی مجہول، از محاربہ بمعنی جنگ کرنا،

مقابلہ کرنا۔ حَـرَب: مصدر از باب سمع، لٹے ہوئے مال والا ہونا، آگ بگولا ہونا، غضب ناک ہونا اور حرب بمعنی جنگ میں بھی ایک لغت راء کے زبر کے ساتھ ہے، ترجمہ میں فقیر نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔ اَعْدَی: اسم تفضیل از عداوۃ، اَلْاَعَادِيُ: دشمن، یہ اعداء کی جمع ہے، اور اعداء، عدوّ کی جمع ہے، اس طرح یہ جمع الجمع ہوا، اَعْـدَی الْاَعَادِيُ: سب سے بڑا دشمن۔ اَلسَّلَمُ: صلح، تسلیم واعتراف۔ مُلْقِيَ السَّلَمِ: صلح جو، صلح کا طالب۔

تشریح: قرآن کریم فصاحت وبلاغت کے اس اعلیٰ معیار پر ہے کہ فصحا وبلغا میں سے جب بھی کسی بڑے سے بڑے مخالف نے اپنے کلام کے ساتھ قرآن کریم کی آیتوں کا مقابلہ کیا وہ آخر کار عاجز آ گیا اور سر تسلیم خم کر لیا، ہم ذیل میں اس کے کچھ شواہد درج کرتے ہیں، جن سے اس موقف کی بھرپور تائید ہوتی ہے:

o یحییٰ بن حکیم اندلس کا مشہور حکیم اور ادیب تھا، اس کے زمانہ میں پورے اندلس میں علم وادب اور فصاحت وبلاغت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا، ایک سو تیس سال کی لمبی عمر پائی، ۲۵۵ھ میں اس کی وفات ہوئی، اس نے سورۂ اخلاص جیسی ایک سورت لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اس پر کلامِ الٰہی کا ایسا رعب طاری ہوا کہ اس نے اس مقابلہ کے میدان سے ہٹ جانے میں ہی اپنی سلامتی اور عافیت سمجھی، آخر کار اس کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ وہ کلام ہے کہ کوئی شخص اس جیسا کلام پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، چنانچہ اس گناہِ عظیم سے اس نے صدقِ دل سے توبہ کی اور ساری عمر قرآن کریم کی رفعتوں اور عظمتوں کے سامنے سرافگندہ رہا۔

o عہدِ تابعین میں المقفّع نامی ایک شخص گزرا ہے جو اپنے عہد میں عربی زبان کے فُصَحا وبُلَغا کا سرتاج مانا جاتا تھا، اس نے قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک سورت لکھنے کا ارادہ کیا، کئی مہینے تک اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے شب وروز محنت اور کوشش کرتا رہا اور جب اس نے اپنے خیال کے مطابق ایک سورت کا مُسوّدہ تیار کر لیا تو اتفاق سے ایک روز اس کا گزر ایک مکتب کے پاس سے ہوا، جہاں بچے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے،

وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے ایک بچے کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا:

وَقِيلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِي مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَ قِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ۝ (سورہ ہود:۴۴)

(حکم دیا گیا اے زمین! نگل لے اپنے پانی کو، اے آسمان! تھم جا اور اتر گیا پانی اور حکم الٰہی نافذ ہو گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہا گیا ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لیے)۔

مقفع کے کانوں میں جب یہ آیت پہنچی تو دہشت کے باعث اس پر لرزہ طاری ہو گیا اور کہنے لگا:

اَشْهَدُ اَنَّ هٰذَا مَا هُوَ مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ وَ اَنَّ هٰذَا لَا يُعَارَضُ اَبَدًا.

(میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا کبھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا)۔

وہیں سے اپنے گھر لوٹ آیا، جو کچھ اس نے لکھا تھا اسے مٹا دیا اور جس کاغذ پر لکھا تھا اس کو پرزہ پرزہ کر دیا۔ (السیرۃ النبویۃ، زینی دحلان، ج ۲، ص ۱۰۰)

۵ امام مسلم علیہ الرحمہ نے اپنی صحیح میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ ابوذر کو جب یہ اطلاع ملی کہ مکہ میں ایک نبی مبعوث ہوا ہے تو اس نے اپنے بھائی انیس سے کہا کہ مکہ جاؤ اور جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اس کے حالات کا جائزہ لو اور واپس آ کر مجھے حقیقتِ حال سے آگاہ کرو۔

ابوذر اپنے بھائی انیس کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے اس سے بڑھ کر کوئی قادر الکلام شاعر نہیں سنا، اس نے زمانۂ جاہلیت میں بارہ نغز گو شعرا کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب رہا۔

بہر حال انیس اپنے بھائی کے کہنے کے مطابق مکہ گیا، وہاں رکا ... عالم ﷺ

کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل کیں، پھر لوٹ کر اپنے بھائی کے پاس آیا اور بتایا کہ میں نے مکہ میں ایک شخص کو دیکھا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نبی بنا کر بھیجا ہے، ابوذر کہتے ہیں میں نے پھر انیس سے پوچھا: لوگوں کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو اس نے بتایا:

يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ كَاهِنٌ سَاحِرٌ وَلَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكَهَنَةِ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ كَاهِنٍ، وَلَقَدْ عَرَضْتُ قَوْلَهُ عَلٰى أَنْوَاعِ الشِّعْرِ وَلَمْ يَلْتَئِمْ وَلَا يَلْتَئِمُ عَلٰى لِسَانِ اَحَدٍ، وَإِنَّهُ لَصَادِقٌ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ. (ایضاً ص ۹۷)

(لوگ تو انہیں شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں، لیکن میں نے کاہنوں کی باتیں سنی ہیں اور میں نے ان کے کلام کو مختلف اشعار سے مقابلہ کر کے دیکھا ہے، آپ کے کلام کو ان میں سے کسی قسم کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے، یقیناً وہ سچے ہیں اور ان کے مخالفین جھوٹے ہیں)۔

o امام بیہقی اپنی کتاب ''دلائل النبوۃ'' میں لکھتے ہیں: ولید بن مغیرہ قریش کا بڑا فصیح و بلیغ سردار تھا، ایک دن وہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ آپ کچھ پڑھ کر سنایئے تاکہ میں اس میں کچھ غور و فکر کرسکوں، رحمتِ عالم ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (سورہ نحل: ۹۰)

(بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے، بھلائی کرنے اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، برے کام اور سرکشی کرنے سے منع فرماتا ہے اور تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو)۔

یہ سن کر ولید پر سناٹا طاری ہوگیا اور عرض کیا: دوبارہ پڑھیے، حضور نے دوبارہ پڑھا

آپ نے تلاوت فرمائی، تو وہ کہنے لگا:

وَاللّٰہِ اِنَّ لَہٗ لَحَلَاوَۃً وَاِنَّ عَلَیْہِ لَطَلَاوَۃً وَاِنَّ اَعْلَاہُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَہٗ لَمُغْدِقٌ وَمَا یَقُوْلُ ھٰذَا بَشَرٌ۔ (ایضا،ص ۹۷)

(خدا کی قسم! اس میں تو مٹھاس ہے، اس کے ظاہر پر چمک ہے، اس کا اوپر والا حصہ پھلوں سے لدا ہوا ہے اور نیچے والا شاداب ہے اور کوئی انسان اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا)۔

پھر وہ لوٹ کر اپنی قوم کے پاس آیا اور ان سے کہا: خدا کی قسم! تم میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو اشعار کے بارے میں مجھ سے زیادہ جان کار ہو یا جنوں کے اقوال کے بارے میں مجھ سے زیادہ باخبر ہو، اللہ کی قسم! جو وہ فرماتے ہیں کوئی کلام اس کے مشابہ نہیں، خدا کی قسم! اس کا کلام بڑا شیریں ہے، اس کا ظاہر چمک دار ہے، اس کا اوپر والا حصہ پھلوں سے لدا ہوا ہے اور نیچے والا شاداب ہے، پھر وہ اپنی قوم سے کہنے لگا:

اِنَّہٗ لَیَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ وَاِنَّہٗ لَیُحَطِّمُ مَاتَحْتَہٗ۔ (حیاۃ الرسول، ج۱، ص۳۵۲)

(یقیناً یہ ہمیشہ سربلند رہے گا اور اس پر کوئی بلند نہیں ہو سکتا اور جو اس کے نیچے آئے گا اسے پیس کر رکھ دے گا)۔

۵ انہیں سے ایک مُسَیلَمہ کذّاب ہے، جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور اپنی چرب زبانی اور ملمع سازی سے اپنی قوم کے بے شمار لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا، اس نے بھی کوشش کی کہ وہ چند آیات لکھ کر قرآن کریم سے ان کا موازنہ کرے، لیکن اس نے بڑی سوچ بچار اور محنت وجانکاہی سے جو فقرے مرتب کیے انہیں لغتِ عرب کا ایک ابتدائی طالب علم بھی سنتا ہے تو اسے ہنسی آجاتی ہے۔

آپ قرآنی آیات کو پیشِ نظر رکھیں پھر اس کذاب اور عیار کی وضع کی ہوئی عبارت کا مطالعہ کریں، حقیقت خود بخود آشکارا ہو جائے گی، وہ کہتا ہے:

یَا ضِفْدَعُ کَمْ تَنْقِیْنَ اَعْلَاکِ فِي الْمَاءِ وَاَسْفَلُکِ فِي الطِّیْنِ لَا الْمَاءَ

تَكَدِّرِيْنَ وَلَا الشُّرْبَ تَمْنَعِيْنَ.

(اے مینڈک تو کب تک ٹراتا رہے گا، تیرا اوپر والا حصہ پانی میں ہے اور نچلا حصہ کیچڑ میں، نہ تو پانی کو گدلا کر سکتا ہے اور نہ پانی پینے سے تو منع کر سکتا ہے)۔

مسیلمہ کذاب کی یہ عبارت آپ نے ملاحظہ فرمائی، معلوم نہیں ان بے جوڑ، بے مغز اور مہمل فقرات کو یکجا کرنے کے لیے اس نے کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہوں گی اور نہ جانے اس نے اپنے کتنے دن ایسے الفاظ کی تلاش میں گزارے ہوں گے جن سے وہ ایسے چند فقرے بنائے اور قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کا دعویٰ کرے، لیکن آپ ان الفاظ کو دیکھیں، ان کے معانی میں غور کریں، وہاں انسان کی روحانیت اور کلامِ الٰہی کی اخادیت کا نام ونشان تک نہیں، تو پھر اس کی یہ یاوہ گوئیاں قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کا کیوں کر مقابلہ کر سکتی ہیں، بلکہ ان بے جوڑ جملوں اور لغو الفاظ کو قرآن کریم سے مقابلہ کرنے کے لیے پیش کرنا فصاحت وبلاغت کی توہین ہے، ایک بار مسیلمہ نے قرآن کریم کی سورہ نازعات سنی تو پھر اس کی باسی کڑھی میں ابال آیا اور سورۂ پاک کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے اپنا زورِ قلم آزمانے کی دوبارہ حماقت کی۔

سورۂ النازعات کی پہلی چند آیات اور اس کا ترجمہ آپ ذہن نشین کر لیں پھر مسیلمہ کذاب کی اس ہرزہ سرائی کا مطالعہ کریں تو آپ کو ابکائیاں آنے لگیں گی۔

رب العرش العظیم کا کلام ہے:

وَالنّٰزِعَاتِ غَرْقًا o وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا o وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا o فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا o فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا o يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ o تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ o قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ o اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ o

"قسم ہے فرشتوں کی جو غوطہ لگا کر جان کھینچنے والے ہیں اور بند آسانی سے کھولنے والے ہیں اور تیزی سے تیرنے والے ہیں، پھر تعمیل ارشاد میں دوڑ کر سبقت کرنے والے ہیں پھر حسبِ حکم ہر کام کا انتظام کرنے والے ہیں، جس روز تھرتھرائے گی تھرتھرانے والی،

ان کے پیچھے ایک اور جھٹکا ہوگا، کتنے دل اس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور ان کی آنکھیں ڈر سے جھکی ہوں گی''۔

کلام الٰہی کی ان آیات میں آپ نے آیات کی شان اعجاز اور ان میں جلال وجمالِ خداوندی کی جھلک کا مشاہدہ کیا۔

اب اس کذاب ودجال مسیلمہ کا کلام سنیں جو اس نے قرآن کریم کی اس سورت کا مقابلہ کرنے کے لیے پیش کیا، وہ کہتا ہے:

وَالزَّارِعَاتِ زَرْعاً. وَالْحٰصِدَاتِ حَصْدًا. وَالزَّارِيَاتِ قَمْعاً. وَالطَّاحِنَاتِ طَحْناً. وَالْحَافِرَاتِ حَفْرًا. وَالنَّارِدَاتِ نَرْدًا. وَاللَّاقِمَاتِ لَقْماً. لَقَدْ فُضِّلْتُمْ عَلٰى اَهْلِ الْوَبَرِ وَمَاسَبَقَكُمْ اَهْلُ الْمَدَرِ. اِلٰى غَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْهَذَيَانِ.

ازراہِ انصاف خود ہی فیصلہ کیجئے کہ یہاں فصاحت وبلاغت نام کی کوئی چیز ہے، دیوانے کی اس بڑ کو کلامِ الٰہی کی سراپا دانش وحکمت آیات سے کوئی دور کی نسبت بھی ہے؟

۵ اسی طرح ایک اور احمق نے سورۃ الفیل کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی مغز ماری کے بعد چند جملے لکھے جن میں معنویت اور بامعنی ہونے کا شائبہ تک نہیں، وہ بھی پیش ہیں۔

اس نے سورۃ الفیل کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے اپنی طرف سے جھک ماری ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈالیں، وہ کہتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِالْحُبْلٰى. خَرَجَ مِنْ بَطْنِهَا نَسَمَةٌ تَسْعٰى. مِنْ بَيْنَ شَرَاسِيْفٍ وَ اَحْشَاً.

اسی طرح ایک دوسرے بھائی نے سورۂ فیل کے مقابلہ کے لیے یہ کلامِ لغو پیش کیا:

اَلْفِيْلُ مَا الْفِيْلُ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْفِيْلُ. لَهٗ ذَنَبٌ وَثِيْلٌ. وَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ خَلْقِ رَبِّنَا لَقَلِيْلٌ. (السیرۃ النبویۃ، زینی دحلان، ج ۳، ص ۹۸، ۹۹)

محاسن بلاغت: (۱) ''حُوْرِبَتْ'' اور ''حرب'' کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے، یوں

ہی "اعدیٰ" اور "الاعادی" کے درمیان بھی۔(۲) "حروب" بمعنی جنگ اور "السلم" بمعنی صلح کو ایک شعر میں لانا صنعت طباق ہے۔

رَدَّتْ بَلَاغَتُهَا دَعْوٰی مُعَارِضِهَا
(۹۷)
رَدَّ الْغَيُوْرِ يَدَ الْجَانِيْ عَنِ الْحُرَمِ

ترجمہ: ان آیاتِ کریمہ کی بلاغت نے مقابلہ کرنے والے کے دعویٰ کو اس طرح رد کر دیا جیسے باغیرت انسان کسی بدکردار کے ہاتھ کو اپنے حرم سے روکتا ہے۔

لغات: رَدَّتْ: رد کر دیا، روک دیا۔ مُعَارِضٌ: مقابلہ کرنے والا۔ الغَيُوْرُ: غیرت مند، با غیرت۔ الجَانِيْ: اسم فاعل از جَنیٰ یَجْنِيْ جِنَایَةً (ض)، مجرم گنہگار، بد کردار (ج) جُنَاۃ۔ الْحُرَمُ: حرمة کی جمع، بمعنی پردہ نشین خاتون۔

تشریح: امام بوصیری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک غیرت مند شریف انسان کو اپنی بیٹی، بہو اور بیوی کی عزت و آبرو جس طرح عزیز ہوتی ہے کہ اگر کوئی بدکردار ان پر حملہ آور ہو یا دست درازی کرے تو وہ اپنی جان پر کھیل کر ان کی عفت و عصمت کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی پوری توانائی بروئے کار لا کر ان کی پاک دامنی کو داغ دار ہونے سے بچاتا ہے اور بدکردار دشمن کو اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیتا، اسی طرح اگر کوئی سرپھرا، فصاحت و بلاغت کے نشہ میں چور ہونے والا انسان قرآن پر حملہ کرے اور اس کی کسی سورت یا آیت کا اپنے کلام سے مقابلہ کرنا چاہے تو بلاغتِ قرآنی اس کی ہمت پست کر دیتی ہے اور اسے محروم و نامراد لوٹا دیتی ہے۔

اس شعر میں "رَدَّتْ" کی اسناد بلاغت کی جانب اسناد مجازی ہے، کیوں کہ در حقیقت مقابلہ کرنے والے کے دعویٰ کو رد کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اور بلاغت اس کا سبب ہے، تو یہاں سبب کی جانب نسبت کر دی گئی، جو مجاز عقلی اور اسناد مجازی کہلاتی ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں اسناد مجازی ہے جیسا کہ اوپر کی تشریح سے واضح ہو چکا، (۲) اس میں رد بلاغت کی تشبیہ ردُّ الغیور سے تشبیہ بلیغ ہے (۳) "رَدَّتْ" اور "رَدَّ" کے

درمیان صنعت اشتقاق ہے۔

لَهَا مَعَانٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ فِي مَدَدٍ
(۹۸)
وَفَوْقَ جَوْهَرِهِ فِي الْحُسْنِ وَ الْقِيَمِ

ترجمہ: ان کے معانی کثرت اور زیادتی میں سمندر کی لہروں کی طرح ہیں اور حسن وجمال اور قدر و قیمت میں دریا کے موتیوں سے بڑھ کر ہیں۔

لغات: مَدَد: زیادتی. اَلْقِیَم: قیمۃ کی جمع، قدر و قیمت۔

تشریح: قرآنی آیات کے معانی سمندر کی لہروں کی طرح ہیں کہ ایک لہر ختم نہیں ہوتی کہ اس کے پیچھے سے دوسری لہر آکر اسے سہارا دیتی، اس کی روانی کو بڑھاتی اور اس کے وجود کو قوت وتوانائی بہم پہنچاتی ہے، تو جس طرح ان کی کوئی حد وانتہا نہیں، اسی طرح قرآنی آیات کے نکات واسرار اور لطائف ودقائق بھی بے حد و بے شمار ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات کے معانی پر کسی انسان کو آج تک مکمل دسترس اور عبور حاصل نہ ہوا۔ شیخ ابراہیم باجوری علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جو علوم ہیں ان کی تعداد کم از کم چوبیس ہزار آٹھ سو ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: اگر میں چاہوں تو سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ کے بوجھ کے برابر تیار کردوں۔ (شرح الباجوری علی البردۃ، ص ۵۲)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات کثرت اور زیادتی میں سمندر کی موجوں کی مانند ہیں اور قدر و قیمت کے لحاظ سے سمندر کے موتی اور جواہرات سے کہیں بڑھ کر ہیں، کیوں کہ جواہرات خواہ کتنے ہی بیش قیمت ہوں ان کی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور متعین ہوتی ہے، لیکن قرآنی آیات کے معانی اور مفاہیم ایسے انمول ہیں کہ دنیا کی دولت وثروت سے ان کی قیمت متعین ہی نہیں کی جاسکتی اور ان کے اندر وہ حسن وجمال ہے کہ زر و جواہر کی آب وتاب اور دل کشی ودل آویزی ان کے سامنے ہیچ ہے، اسی لیے کسی عارف حق صاحب حال بزرگ نے فرمایا:

لو ظهرت حقيقة معانيها لم تطق سطوات نورها السموٰت والارض.

(اگر آیاتِ قرآنی کے معانی کی حقیقت ظاہر ہو جائے تو آسمان و زمین ان کی سطوتِ نوری کی تاب نہیں لاسکتے)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں معانیِ آیاتِ قرآنی کی تشبیہ سمندر کی موج سے دی گئی جو کہ تشبیہِ مفصل و مرسل ہے (۲) اس میں آیاتِ قرآنی اور سمندر کی موجوں کو کثرت اور زیادتی میں یکساں بتانا، پھر حسن و جمال اور قدر و قیمت میں دونوں میں فرق بتانا صنعتِ جمع و تفریق ہے۔

(۹۹)

فَلاَ تُعَدُّ وَلاَ تُحصیٰ عَجَائِبُهَا
وَلاَ تُسَامُ عَلَی الْإِکْثَارِ بِالسَّأَمِ

ترجمہ: ان کے عجائب بے حد و بے شمار ہیں اور کثرت سے تلاوت کرنے کے باوجود اکتاہٹ اور بے کیفی پیدا نہیں ہوتی۔

لغات: لاَ تُعَدُّ: انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا. لاَ تُحصیٰ: ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، مضارع منفی مجہول از اِحْصَاءٌ بمعنی احاطہ کرنا. عَجَائِبُ: حیرت انگیز اور انوکھی چیزیں، یہ عَجِیبَۃ کی جمع ہے، یہاں اس سے مراد اس کے انوکھے اور بے مثال معانی ہیں. لاَ تُسَامُ: أیْ لاَ تُوصَف: متصف نہیں. الْإِکْثَار: کثرتِ تکرار، مراد کثرتِ تلاوت. عَلیٰ: بمعنی مع ہے. اَلسَّأَم: اکتاہٹ، دل اچاٹ ہونا، طبیعت گھبرا جانا۔

تشریح: یعنی قرآن کریم عجائب کا خزانہ ہے، اس کے لطائف و دقائق کی کوئی حد و انتہا نہیں، یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کی جتنی بار تلاوت کی جائے، ایک ایک آیت کو بار بار دہرایا جائے قاری اس سے آزردہ خاطر نہیں ہوتا، بلکہ جتنی بار اس کی تلاوت کی جائے، پڑھنے والے کو نیا لطف اور نیا سرور محسوس ہوتا ہے، نہ اس کا پڑھنے والا اکتاتا ہے نہ اس کا سننے والا تھکتا ہے، وہ لوگ جو فصاحت و بلاغت میں عالمی شہرت کے حامل ہیں ان کے کلام کو جب پہلی بار سنا جاتا ہے تو خاص کیف و سرور حاصل ہوتا ہے، لیکن جب اسے کثرت سے

دہرایا جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کیف و سرور میں کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انسان اس کے پڑھنے اور سننے میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ فارسی زبان کے باکمال شاعر، میدان فصاحت و بلاغت کے عظیم شناور اور انتہائی تجربہ کار عالم حضرت شیخ سعدی شیرازی فرماتے ہیں:

سخن گرچہ دل بند و شیریں بود سزاوار شاباش و تحسیں بود
چو یک بار گفتی مگو باز پس کہ حلوا چو یک بار خوردند و بس

(یعنی بات اگرچہ دلچسپ اور شیریں ہو، شاباشی اور تعریف و تحسین کی مستحق ہو، جب تو اسے ایک بار کہہ چکا تو دوبارہ مت کہہ، کیوں کہ (شیریں اور لذیذ ہونے کے باوجود) حلوہ کو صرف ایک بار کھاتے ہیں (بار بار نہیں)۔

لیکن قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ سیکڑوں، ہزاروں بار اس کی آیات کی تلاوت کریں، ہر بار کیف و نشاط کی ایک نئی کیفیت محسوس کریں گے۔

سرکارِ دو جہاں ﷺ نے اپنی زبانِ اقدس سے قرآن کریم کی نادر خصوصیات کو یوں بیان فرمایا ہے:

اَلْقُرْآنُ لَا يَخْلُقُ عَلىٰ كَثْرَةِ الرَّدِّ، وَلَا تَنْقَضِيْ عِبَرُهُ وَلَا تَفْنىٰ عَجَائِبُهُ وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ، وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ، وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ، وَهُوَ الَّذِيْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ حِيْنَ سَمِعَتْهُ اَنْ قَالُوْا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَهْدِيْ اِلَى الرُّشْدِ۔ (کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفےٰ، ۱/۳۹۰)

یعنی "قرآن بار بار تلاوت کیے جانے کے باوجود پرانا نہیں ہوتا، اس کے پند و مواعظ ختم نہیں ہوتے، اس کے عجائب فنا نہیں ہوتے، یہ ایک فیصلہ کن کتاب ہے کوئی مذاق نہیں، علما اس سے سیر نہیں ہوتے اور اس کی برکت سے خواہشات نفسانی میں کجی نہیں پیدا ہوتی، زبان سے تلفظ کرتے وقت کسی اور کلام سے التباس پیدا نہیں ہوتا، یہ وہ کتاب ہے کہ

جب جنات نے اسے سنا تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "آج ہم نے عجیب وغریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔

ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب اکبر ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

اِنِّیْ مُنَزِّلٌ عَلَیْکَ تَوْرَاۃً حَدِیْثَۃً تَفْتَحُ بِھَا اَعْیُناً عُمْیاً وَاٰذَاناً صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفاً، فِیْھَا یَنَابِیْعُ الْعِلْمِ وَفَھْمُ الْحِکْمَۃِ وَرَبِیْعُ الْقُلُوْبِ۔ (ایضا، ۳۹۳/۱)۔

"میں آپ پر ایک جدید توریت نازل کرنے والا ہوں، اس کے ذریعہ آپ نابینا آنکھوں کو بینا، بہرے کانوں کو شنوا اور غافل دلوں کو بیدار کر دیں گے، اس میں علم کے چشمے، حکمت کا مفہوم اور دلوں کی بہار ہے"۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں مذکورہ بالا حدیث کی جانب تلمیح ہے (۲) اور "تُسَامُ" اور "اَلسَّأْمُ" کے درمیان تجنیسِ شبہِ اشتقاق ہے۔

(۱۰۰)

قَرَّتْ بِھَا عَیْنُ قَارِیْھَا فَقُلْتُ لَہٗ
لَقَدْ ظَفِرْتَ بِحَبْلِ اللّٰہِ فَاعْتَصِمِ

ترجمہ: تلاوت کرنے والے کی آنکھ اس سے ٹھنڈی ہوگئی تو میں نے اس سے کہا تو نے اللہ کی رسی پالی تو اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔

لغات: قَرَّتْ: (س،ض) واحد مؤنث غائب، ماضی معروف از قَرَّتْ عَیْنُہٗ قَرَاراً وَقُرًّا بمعنی خوشی کی وجہ سے آنکھیں ٹھنڈی ہونا۔ قَارِیْھَا: ان آیات کی تلاوت کرنے والا، یہ اصل "قَارِئُھَا" تھا، ضرورتِ شعری کی وجہ سے ہمزہ کو ساکن کر کے یا سے بدل دیا۔ ظَفِرْتَ بِہٖ: تو اس میں کامیاب ہو گیا، اس کو پالیا۔ اَلْحَبْلُ: رسی، باندھنے کی چیز (ج) حِبَال وَ اَحْبُلٌ وَ حُبُوْل وَ اَحْبَال، مجازاً اس سے مراد کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ حَبْلُ اللّٰہِ: اللہ کی رسی، اللہ تک رسائی کا ذریعہ، مراد قرآن کریم ہے۔ اِعْتَصِمْ: امر حاضر از اِعْتِصَام، مضبوطی سے پکڑے رہ۔

تشریح: امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ایسی روحانی لذت، ایسی حلاوت اور چاشنی ہے کہ اس کی تلاوت میں انسان ایک لطف ولذت محسوس کرتا ہے، اطمینان قلب محسوس کرتا ہے اور اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں، یہ خدا رسی کی رسّی اور اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، اس لیے انسان کو اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے اور اس کے احکام پر بھرپور طریقے سے عمل کرنا چاہیے۔

اس شعر میں درج ذیل آیت کریمہ کی جانب اشارہ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (آل عمران: آیت ۱۰۳)

(اور اللہ کی رسّی مضبوطی سے تھام لو)۔

صدر الافاضل علامہ محمد نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ تفسیر خزائن العرفان میں اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حَبْلُ اللّٰهِ" کی تفسیر میں مفسرین کے چند قول ہیں، بعض کہتے ہیں: اس سے قرآن مراد ہے، مسلم شریف کی حدیث میں وارد ہوا کہ قرآن پاک "حبل اللہ" ہے، جس نے اس کا اتباع کیا وہ ہدایت پر ہے، جس نے اس کو چھوڑا وہ گمراہی پر"۔

اور اس حدیث کی جانب بھی اشارہ ہے جس میں قرآن کریم کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں:

هُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَالنُّوْرُ الْمُبِيْنُ وَالصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ وَحَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ، نَجَاةٌ لِّمَنِ اتَّبَعَ، لَا يَعْوَجُّ فَيُقَوَّمُ وَلَا يَزِيْغُ فَيُسْتَعْتَبُ۔ (الشفا، ۱/۲۹۲)

"یہی ذکر حکیم ہے، یہی نور مبین ہے، یہی راہِ راست ہے اور اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے، نفع بخش شفا ہے، پیروی کرنے والے کے لیے سامان نجات ہے، اس میں کجی نہیں کہ درست کرنے کی ضرورت محسوس ہو، وہ حق سے بھٹکتا نہیں کہ اسے ملامت اور عتاب کیا جائے"۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں صنعتِ تلمیح ہے جیسا کہ مندرجہ بالا شرح سے ظاہر ہے

(۲) "حبل اللہ" میں استعارۂ تصریحیہ اصلیہ ہے۔ (۳) اور "قَرَتْ" اور "قَارِیْ" میں تجنیس شبہ اشتقاق ہے۔

(۱۰۱)

اِنْ تَتْلُهَا خِيفَةً مِنْ حَرِّ نَارِ لَظىٰ
اَطْفَاتْ نَارَ لَظىٰ مِنْ وِرْدِهَا الشَّبِمِ

ترجمہ: اگر آتشِ جہنم کے خوف سے تو ان کی تلاوت کرتا ہے تو اپنے آبِ سردسے آتشِ جہنم کو بجھادیں گی۔

لغات: خِيفَةً: ڈر کی وجہ سے، یہ "تَتْلُهَا" کا مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ حَرّ: تپش، گرمی۔ لَظىٰ: جہنم کا ایک نام، یہ تانیث اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے، ویسے اس کا اصل معنی ہے بھڑکتی ہوئی آگ یا وہ شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔ وِرْد: پانی، گھاٹ۔ الشَّبِمُ: سرد، ٹھنڈا۔

تشریح: شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر آتشِ جہنم کے ڈر سے انسان آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت کرتا ہے اور ان پر عمل پیرا رہے تو وہ ان کی برکت سے جہنم سے بچ جائے گا، کیوں کہ یہ آیتیں مثل پانی کے ہیں، پانی سے اگر جسم کی حیات اور بقا ہے تو ان آیات سے روح کی حیات و بقا ہے، پانی اگر تشنگی کی آگ بجھاتا ہے تو یہ جہنم کی آگ کو بجھاتی اور سرد کرتی ہیں۔

اس شعر میں درجِ ذیل حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو امام مسلم نے باب الورع میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

اقرؤا القرآن فانہ یاتي یوم القیامة شفیعا لأصحابہ.

(قرآن کی تلاوت کیا کرو کیوں کہ یہ قیامت کے دن تلاوت کرنے والوں کی شفاعت کو آئے گا)۔

اور اس حدیث کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب مومن قیامت کے دن پلِ صراط پر رکے گا تو جہنم اس سے کہے گا:

جُزْ یَا مُومِنُ فقد أطفأتَ نورکَ لَهَبِي.

(الزبدة العمدة للملا علی القاری، ۹۱)

اے مومن! (جلد) گزر جا، کیوں کہ اپنے نور سے تو میرے شعلوں کو بجھائے دے رہا ہے۔

اس شعر میں "نار لظی" کی تکرار ضرورتِ شعری کی وجہ سے ہے، ورنہ یہ موقع ضمیر لانے کا تھا۔

مفتیِ شہر خرپوت علامہ عمر بن احمد خرپوتی لکھتے ہیں:

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کو دیکھ کر پڑھنا زبانی پڑھنے سے افضل ہے، کیوں کہ اس میں قرآن شریف کو چھونے اور اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ہاتھ کا عمل ہے اور اسے دیکھنے میں نگاہ کا استعمال ہوتا ہے (اور یہ سارے اعمال عبادت ہیں) اور یہ آیات کے معانی و مفاہیم میں غور و فکر کرنے میں بھی معین و مددگار ہے، اسی وجہ سے اکثر صحابۂ کرام قرآن کریم دیکھ کر ہی پڑھتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ثلاث یزدن فی الحفظ و یذهبن البلغم، المسواک والصوم وقراءة القرآن.

(تین چیزیں یادداشت بڑھاتی اور بلغم کو ختم کرتی ہیں: مسواک، روزہ، تلاوت قرآن)۔

اہل علم فرماتے ہیں:

النظر الی العلماء والقرآن عبادة کالنظر الی الکعبة. (عصیدة الشهدة، ص ۱۶۳)

(علمائے ربانیین اور قرآن کو دیکھنا عبادت ہے، جیسے کعبہ کو دیکھنا)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں صنعتِ تلمیح ہے، جیسا کہ شرح سے ظاہر ہے (۲) "وِرْدِهَا" میں "وِرْد" بمعنی پانی کی اضافت آیات قرآنی کی طرف لوٹنے والی ضمیر کی جانب کرنا اضافت المشبہ بہ الی المشبہ کے قبیل سے ہے اور یہ تشبیہ تشبیہِ بلیغ ہے (۳) "حر" اور "شبم" کو یکجا کرنا طباقِ ایجاب ہے (۴) مصرعۂ ثانیہ میں اطفاء اور نار کو، یوں ہی ورد شبم کو جمع کرنا صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے۔

(۱۰۲)

كَأَنَّهَا الْحَوْضُ تَبْيَضُّ الْوُجُوهُ بِهِ
مِنَ الْعُصَاةِ وَقَدْ جَاءُوهُ كَالْحُمَمِ

ترجمہ: گویا یہ آیتیں نہرِ حیات ہیں جس سے گنہ گاروں کے چہرے روشن ہو جائیں گے جب کہ وہ وہاں جلے ہوئے کوئلوں کی طرح آئیں گے۔

لغات: تَبْيَضُّ: سفید ہو جائیں گے، روشن ہو جائیں گے۔ اَلْوُجُوهُ: چہرے، وَجْهٌ کی جمع، یہاں مراد جسم ہے۔ اَلْعُصَاةُ: عاصٍ کی جمع، گنہ گار، عصیاں شعار۔ اَلْحُمَمُ: حُمَمَةٌ کی جمع، کوئلہ، راکھ، ہر وہ چیز جو آگ میں جل جائے۔

تشریح: اس شعر میں حوض سے مراد نہرِ حیات ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ جن گنہ گاروں کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے انہیں دوزخ سے نکال دو، تو وہ دوزخ سے اس طرح نکلیں گے کہ آتشِ جہنم سے جھلس کر مثل کوئلوں کے ہو چکے ہوں گے، پھر انہیں نہرِ حیات میں ڈال دیا جائے گا، جس کے پانی سے ان کی سیاہی جاتی رہے گی اور وہ بہت جلد ہی تر و تازہ ہو جائیں گے جس طرح ساگ پات کا بیج سیلاب کے خس و خاشاک میں اُگ کر بہت جلد تر و تازہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں ہے، جس کے راوی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ قرآن قیامت کے دن اپنی تلاوت کرنے والوں کی شفاعت کرے گا، تو شعر کا مطلب یہ ہوا کہ سیہ روئی دور کرنے میں قرآن کریم نہرِ حیات کی طرح ہے، جس طرح آتشِ جہنم سے جھلسے ہوئے گنہ گاروں کے سیاہ چہرے نہرِ حیات کے پانی سے روشن اور نورانی ہو جائیں گے، اسی طرح گناہوں سے سیاہ روقاریوں کے چہرے قرآن کریم کی شفاعت سے نورانی ہو جائیں گے۔

محاسنِ بلاغت: (۱) آیاتِ قرآنی کی نہرِ حیات سے تشبیہ، تشبیہِ مرسل و مفصل ہے (۲) اَلْوُجُوهُ سے بطور مجازِ مرسل اجسام مراد ہیں، اور یہاں معنیٔ حقیقی و مجازی کے درمیان علاقہ

"زینت" ہے(۳)اس میں صنعت تلمیح بھی ہے۔

وَكَالصِّرَاطِ وَكَالْمِيزَانِ مَعْدِلَةً
فَالْقِسْطُ مِنْ غَيْرِهَا فِي النَّاسِ لَمْ يَقُمِ (۱۰۳)

ترجمہ: یہ استقامت میں پل صراط اور عدل میں میزان عمل کی طرح ہیں، تو ان کے سوا کسی اور سے لوگوں میں عدل قائم نہ رہا۔

لغات: اَلصِّرَاط: لغت میں راستہ کو کہتے ہیں (ج) صُرُط، لیکن یہاں اس سے مراد وہ پل ہے جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے، جو عرف عام میں پل صراط کے نام سے مشہور ہے، قیامت کے دن یہ دوزخ پر ہوگا، یہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہوگا، سب کو اس پر گزرنا ہوگا، مومن اپنے مرتبے کے موافق کوئی آنکھ جھپکنے میں، کوئی بجلی کی مانند، کوئی تیز ہوا کی مانند، کوئی پرندوں کی طرح، کوئی برق رفتار گھوڑوں کی مانند، کوئی اونٹوں کی مانند، سب اس پر سے گزر جائیں گے، اور کفار ومنافقین کٹ کٹ کر دوزخ میں گر جائیں گے.
اَلْمِيزَان: لغت میں ترازو کو کہتے ہیں (ج) مَوَازِيْنُ: یہاں مراد وہ ترازو ہے جس میں قیامت کے دن بندوں کے نیک وبد اعمال تولے جائیں گے، وہ تول کانٹے کی تول ہوگی، نہ رتی بھر زیادہ نہ رتی بھر کم، اس سے اس ترازو کا عدل بالکل عیاں ہے، قرآن کریم میں ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا (سورۃ الانبیا، آیت:۴۷)۔

"اور ہم عدل کی ترازو رکھیں گے قیامت کے دن، تو کسی جان پر کچھ ظلم نہ ہوگا اور اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو تو ہم اسے لے آئیں گے". مَعْدِلَةً: عدل و انصاف. اَلْقِسْطُ: یہ لفظ مصدر ہے اور یہ اضداد میں سے ہے، جب یہ باب نصر ینصرُ سے ہو تو عدل وانصاف کے معنی میں آتا ہے اور باب ضرب یَضرِبُ سے ہو تو ظلم ونا انصافی کے معنی میں، اس سلسلہ میں ایک بڑی معنی خیز حکایت بھی مروی ہے کہ جب حجاج بن یوسف

ثقفی نے خیر التابعین سیدنا حضرت سعید بن جُبیر ﷫ کو گرفتار کر کے اپنی کچہری میں کھڑا کیا اور ان سے پوچھا مجھے کیا کہتے ہو؟ تو انہوں نے فرمایا: اَنْتَ الْقَاسِطُ الْعَادِلُ یہ سن کر حاضرین محوِ حیرت ہو گئے کہ بظاہر تو حجاج کو ظالم، جفا کار اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے اور گرفتار ہو کر سامنے کھڑے ہیں اور موت کی تلوار سر پر لٹکتی دیکھ رہے ہیں تو اسے عادل اور منصف کہہ رہے ہیں، مگر حجاج نہایت ذہین و فطین ہونے کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب کی باریکیوں سے واقف اور میدان فصاحت و بلاغت کا شہسوار تھا، وہ حضرت سعید بن جبیر کی مراد سمجھ گیا، اس نے حاضرین سے کہا، تم نے سمجھا نہیں یہ مجھے کیا کہہ رہا ہے، اس نے مجھے جہنمی اور کافر کہا، دیکھو اس نے مجھے قاسط کہا اور قرآن مجید میں ہے: اَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَباً ○ (یعنی ظلم و زیادتی کرنے والے جہنم کا ایندھن ہوں گے)، اس نے مجھے "عادل" کہا، اس سے اس کی مراد حق سے عدول کرنے والا ہے۔ **اَلنَّاسُ**: لوگ، یہاں مراد امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔

تشریح: اس شعر میں دو تشبیہ ہیں (۱) آیاتِ قرآنیہ کی پل صراط سے تشبیہ، اس صورت میں وجہ شبہ یا تو استقامت ہے اور جملہ کا حاصل یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی استقامت میں پل صراط کی طرح ہیں، کہ جس طرح پل صراط بالکل سیدھا اور راہِ مستقیم ہے اسی طرح آیاتِ کریمہ، جن میں کجی اور ٹیڑھے پن کا شائبہ بھی نہیں، یا وجہِ شبہ "حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا" ہے اور مفہوم یہ ہے کہ یہ آیاتِ کریمہ حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرتی ہیں، جس طرح پل صراط حق اور ناحق کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دے گا کہ اہل حق اسے پار کر کے جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں کی بہاروں سے شادکام ہوں گے، جب کہ اہل باطل اسے پار نہ کر سکیں گے اور نیچے گر کر جہنم کے دردناک عذاب میں جا پڑیں گے (۲) دوسری تشبیہ آیاتِ قرآنیہ کی میزان عمل سے ہے، اس میں وجہِ تشبیہ "عدل و انصاف" ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح میزان عمل قیامت کے دن عدل و انصاف کے سارے تقاضے پورے کرے گا، اس میں رتی بھر کمی بیشی نہ ہوگی

اور کسی کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہ ہوگی اسی طرح آیاتِ قرآن عدل وانصاف سے لبریز ہیں۔
اور پورے شعر کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح صراط ومیزان سے حق وباطل کے درمیان امتیاز ہوجائے گا اسی طرح آیاتِ قرآنی سے حق اور ناحق کے درمیان امتیاز ہوجاتا ہے، اس لیے دیگر آسمانی کتابوں کا عدل امتِ محمدیہ میں قائم نہ رہا، بلکہ وہ منسوخ ہوگیا، اب اس امت میں عدل وانصاف کا قیام صرف اور صرف آیات قرآنی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، کیوں کہ سابقہ آسمانی کتابیں منسوخ ہوکر اس امتِ کریمہ کے لیے ناقابل عمل ہوچکی ہیں۔

اس شعر میں ''صراط'' اور ''میزان'' کے ذکر سے معتزلہ کے رد کی جانب اشارہ ہے، کیوں کہ یہ پل صراط کے قائل نہیں، دراصل معتزلہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، جو چیز ان کی عقل کے مطابق ہوتی ہے اسے درست کہتے ہیں اور جو چیز ان کی عقلِ نارسا میں نہیں آتی اس سے انکار کردیتے ہیں، اسی لیے وہ پل صراط کے بارے میں کہتے ہیں: اس طرح کے کسی پل سے انسان کا صحیح وسالم گزر جانا ممکن نہیں اور ایسے پل کی تخلیق عبث اور بے کار ہے جس پر سے گزرنا ممکن نہ ہو اور اگر ممکن بھی ہو تو اہل ایمان اور انبیا ومرسلین کو بے جا تکلیف پہنچانا اور مبتلائے عذاب کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان سے بعید ہے۔

اس کے جواب میں اہل سنت وجماعت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں، کیوں کہ انبیا ومرسلین اور دیگر مومنین اس کی قدرت سے بلا مشقت وتعب اس پل سے گزر جائیں گے۔

معتزلہ وزنِ اعمال ومیزان کا بھی انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب حساب وکتاب ہوچکا اور فرشتوں کے لکھے ہوئے نامۂ اعمال سب کے ہاتھوں میں دے دیے گئے اور اس کے مطابق فیصلہ ہوگیا تو اب وزنِ اعمال کی کیا ضرورت؟ معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اعمال اَعراض ہیں جن میں کوئی وزن نہیں ہوتا، پھر ان کے تولے جانے کا کیا مطلب؟ اور اس کے لیے میزان قائم کرنے کا کیا معنی؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ حساب وکتاب ہو جانے اور فرشتوں کے لکھے نامہ ہائے اعمال سب کے ہاتھوں میں دیے جانے کے بعد بھی وزنِ اعمال کا فائدہ ہے اور وہ ہے لوگوں کو بھرپور طریقے سے مطمئن کرنا، اس کو یوں سمجھئے کہ قاتل اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے حتمی طور پر قتل کیا ہے، پھر بھی جب اسے قتل کی سزا سنائی جاتی ہے تو وہ جج کو گالی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے انصاف نہیں کیا، تقریباً یہی حال قیامت کے دن بھی ہوگا، لیکن وزنِ اعمال کے بعد کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں ملے گا، اسی لیے وزنِ اعمال کی نگرانی ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کے سپرد ہوگی، ان کو حکم ہوگا کہ آپ میزان پر کھڑے ہو کر اپنی اولاد کے اعمال تولوائیں۔ (رواہ الطبرانی فی معجمہ الصغیر عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ، قسطلانی، ج۱۰، ص۳۸۱)۔

دوسری بات کا جواب بعض علمائے اہلِ سنت یہ دیتے ہیں کہ وہ صحیفے تولے جائیں گے جو کراماً کاتبین نے لکھے ہیں، اس کی دلیل حدیث بطاقہ ہے، جسے امام ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، جس میں کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے تولے جانے اور دوسرے کثیر دفتروں پر بھاری ہونے کا ذکر ہے جس ٹکڑے میں کلمۂ شہادت لکھا ہوگا۔

لیکن احادیث کثیرہ سے یہ ثابت ہے کہ قول وعمل ہی تولے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ وزن کے وقت اعراض کو جواہر سے بدل دے گا، یہ جواب سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور دیگر بہت سے علمائے اہلِ سنت فرماتے ہیں کہ اعراض کو جواہر سے بدلنا نہ بھی ہو جب بھی ان کے تولے جانے میں کوئی استبعاد نہیں، کیوں کہ کمیات اور مقادیر میں ثقل اور وزن اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کرنے سے ہے، اللہ جل شانہٗ اس پر قادر ہے کہ کیف میں بھی وزن اور ثقل پیدا فرما دے۔

جب کثیر آیات واحادیث سے اعمال واقوال کا وزن کیا جانا ثابت ہے تو ہم پر فرض ہے کہ اس پر ایمان لائیں، نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہوں گی جب تک کہ ظاہر سے

پھیرنے والا شرعی قرینہ نہ ہو اور یہاں کوئی قرینہ نہیں، اس لیے وہ اپنے ظاہر ہی پر رکھی جائیں گی، ہماری عقل اور سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل اور سمجھ کا قصور ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر بات ہر انسان کی سمجھ میں آجائے، روزمرہ مشاہدے میں آتا ہے کہ ایک ذہین انسان اپنے سے زیادہ ذہین انسان کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتا، پھر ہر انسان اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کے اَسرار ورُموز کو سمجھ لے یہ کیا ضروری ہے، بہرحال اعمال کا تولا جانا بھی حق ہے اور میزان کا قائم کیا جانا بھی حق ہے۔

محاسن بلاغت: (ا) آیاتِ قرآنی کی صراط سے تشبیہ، تشبیہِ مجمل اور مرسل ہے اور میزان سے ان کی تشبیہ، مفصل اور مرسل ہے۔

لا تَعجَبَنْ لِحَسُوْدٍ رَّاحَ يُنكِرُهَا
تَجَاهُلاً وَّهُوَ عَينُ حَاذِقِ الْفَهِمِ (۱۰۴)

ترجمہ: تو اس حاسد پر بالکل تعجب نہ کر جو تجربہ کار، سمجھ دار ہوتے ہوئے بھی انجان بن کر ان آیتوں کا انکار کرتا ہے۔

لغات: **لا تَعْجَبَنْ** (س): فعل نہی با نونِ خفیفہ، تو ہرگز تعجب نہ کر. **حَسُوْدٌ**: بڑا حسد کرنے والا، صیغۂ مبالغہ از حَسَدَ يَحْسُدُ حَسَداً (ن،ض) بمعنی زوالِ نعمت کی تمنا کرنا (ج) حُسُدٌ. رَاحَ (ن): ماضی معروف از رَوَاح بمعنی جانا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بمعنی ''صَارَ'' ہو، اس صورت میں ضمیر مستتر اس کا اسم ہوگی اور جملہ ''يُنكِرُهَا'' اس کی خبر. **تَجَاهُلاً**: جانتے ہوئے انجان بننا، یہ ''يُنكِرُ'' کا مفعول لہٗ ہے. **الْحَاذِقُ**: ماہر، تجربہ کار (ج) حُذَّاق وَحِذَاق. **الْفُهِمُ**: سمجھ دار۔

تشریح: یہ شعر اس سوال کا جواب ہے جو گزشتہ اشعار میں قرآن مجید اور اس کی آیاتِ کریمہ کے اوصاف سننے کے بعد سائل کے ذہن میں پیدا ہوا، وہ یہ کہ جب قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے ذروۂ کمال پر ہے اور اس کے اندر وہ اوصاف و کمالات ہیں کہ جو کسی بشر کے کلام میں نہیں

ہوسکتے تو پھر کیسے بہت سے کفار و مشرکین نے اس کے کلامِ الٰہی ہونے سے انکار کردیا؟

اس کا جواب اس شعر میں یوں دیا گیا کہ حسد وہ باطنی بیماری ہے جو قلب کو سیاہ اور چشمِ بینا کو کور بنادیتی ہے، حاسد اپنے فائدے اور نقصان کو بھول کر صرف اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ دوسرے کو جو نعمت حاصل ہے وہ کسی طرح زائل ہوجائے، خواہ اس کو ملے یا نہ ملے، اس لیے کفار و مشرکین نے جو انکار کیا وہ جہالت و نادانی میں نہ تھا بلکہ حسد و عناد کی بناء پر تھا، وہ قرآن مجید کی ان خوبیوں کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے، ان کے قلوب واذہان قرآن مجید کے محاسن و کمالات کے خوب معترف تھے، مگر برا ہو حسد و عناد اور عداوت ودشمنی کا کہ یہ انسان کو سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بننے پر مجبور کردیتی ہیں اور دل سے حقیقت کے اعتراف کے باوجود زبان سے اس کا انکار کروادیتی ہیں، اس لیے کفار و مشرکین کی جانب سے قرآن مجید کے انکار پر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۰۵)

قَدْ تُنْكِرُ الْعَيْنُ ضَوْءَ الشَّمْسِ مِنْ رَّمَدٍ
وَيُنْكِرُ الْفَمُ طَعْمَ الْمَاءِ مِنْ سَقَمِ

ترجمہ: کبھی آشوبِ چشم کی وجہ سے آنکھ کو سورج کی درخشانی ناگوار معلوم ہوتی ہے اور بیماری کی وجہ سے منھ کو پانی اچھا نہیں لگتا۔

لغات: قَدْ: کبھی، یہ حرفِ تقلیل ہے۔ تُنْكِرُ: مضارع معروف از انکار بمعنی ناپسند کرنا، برا سمجھنا، ناگوار لگنا۔ رَمَدٌ: آشوبِ چشم، آنکھ کا دکھنا۔ سَقَمٌ: بیماری (ج) اسقام۔

تشریح: گزشتہ شعر میں امام بوصیری نے حسد کی بناء پر کفار و مشرکین کی جانب سے ہونے والے قرآن مجید کے انکار پر تعجب نہ کرنے اور ورطۂ حیرت میں نہ ڈوبنے کی بات کہی تھی اور یہاں دو تمثیلوں کے ذریعہ اس کی علت اور اس کی وجہ بیان کررہے ہیں۔

(۱) پہلے مصرعہ میں حاسد و منکر کو آشوبِ چشم کے مریض سے اور آیاتِ قرآنی کو سورج کی روشنی سے اور جانتے ہوئے انجان بننے کو آشوبِ چشم کی بیماری سے تشبیہ دی گئی ہے، وجہ

تشبیہ ایک انتہائی ظاہر وباہر چیز کا انکار ہے۔

(۲) دوسرے مصرعہ میں حاسد ومنکر کی تشبیہ اس شخص سے جس کے منہ میں کوئی بیماری ہو، آیات قرآنی کو خوش گوار اور شیریں پانی سے اور جانتے ہوئے انجان بننے کو بیماری سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہِ شبہ ''حق تک رسائی کی راہ میں رکاوٹ بننا'' ہے۔

اب شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ حاسدین ومنکرین کی طرف سے قرآنی آیات کے انکار پر حیرت نہ ہو، کیوں کہ جس طرح آشوبِ چشم کی وجہ سے آنکھوں کو سورج کی درخشانی ناگوار معلوم ہوتی ہے اور بیماری کی وجہ سے بیمار کو پانی بدذائقہ لگتا ہے، اسی طرح ان کفار ومشرکین کو حسد کی وجہ سے قرآنی آیات اچھی نہیں لگتیں اور وہ ان کے منکر ہو بیٹھے ہیں۔

اس شعر میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے ''الشّمس'' کے ساتھ ''ضوء'' کو استعمال کیا، ''نور'' استعمال نہ کیا، اس کی کئی وجہیں ہیں:

(۱) ضَوء اور ضِیاء اپنی روشنی میں ''نور'' سے قوی اور تیز ہوتی ہے، (۲) ''ضَوء'' ذاتی روشنی کا نام ہے، جیسے سورج اور آگ کی روشنی ذاتی ہوتی ہے، کسبی نہیں اور ''نُور'' کسبی اور عرضی روشنی کا نام ہے، جیسے چاند کی روشنی جو سورج کی روشنی سے مُستَفاد ہوتی ہے، اسی لیے قرآن کریم میں سورج کو ''ضیاء'' اور چاند کو ''نور'' کہا گیا، ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْراً. (یونس، آیت:۵)

(وہی ہے جس نے سورج کو جگمگا تا بنایا اور چاند کو چمکتا)۔

اس نکتہ کو سننے کے بعد کسی کے ذہن میں یہ سوال انگڑائی لے سکتا ہے کہ ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' میں اللہ نے اپنی ذات کو ''نور'' فرمایا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''نور'' مطلقاً قوی اور طاقت ور ہوتا ہے، لیکن یہ سوال اسی کے ذہن میں ابھر سکتا ہے جس کے سامنے اس آیت کی تفسیریں نہیں ہیں، ورنہ ہر باخبر شخص کو معلوم ہے کہ اس آیت میں ''نور'' اپنے معنیٰ حقیقی میں نہیں بلکہ ''مُنَوِّر'' کے معنیٰ میں ہے، اب آیت کریمہ کا معنیٰ ہوا:

''اَللّٰہُ مُنَوِّرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ '' (یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کو روشن فرمانے والا ہے)۔
اور مذکورہ بالا اعتراض تو اس وقت درست ہوتا جب ''نور'' اپنے حقیقی معنی میں ہوتا۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں دونوں تشبیہات تشبیہِ ضمنی ہیں، تشبیہِ ضمنی کی مفصل بحث کتاب کے مقدمہ میں زیرِ عنوان'' قصیدۂ بردہ کا بلاغی تجزیہ'' دیکھیں، ساتھ ہی یہ تشبیہات تشبیہِ مرکب بمرکب بھی ہیں۔

الفصل السابع
في ذكر معراج النبی ﷺ

يَا خَيْرَ مَنْ يَمَّمَ الْعَافُوْنَ سَاحَتَهُ
سَعْياً وَفَوْقَ مُتُوْنِ الْاَيْنُقِ الرُّسُمِ (۱۰۶)

ترجمہ: اے سب سے بہترین داتا جس کے درِ دولت پر منگتے پیادہ پا اور تیز گام اونٹنیوں کی پشتوں پر سوار ہو کر دوڑے چلے آتے ہیں۔

وَمَنْ هُوَ الْآيَةُ الْكُبْرٰى لِمُعْتَبِرٍ
وَمَنْ هُوَ النِّعْمَةُ الْعُظْمٰى لِمُغْتَنِمٍ (۱۰۷)

ترجمہ: اور اے وہ ذات گرامی جو عبرت پکڑنے والے کے لیے عظیم ترین نشانی اور غنیمت سمجھنے والے کے لیے نعمت عظمیٰ ہے۔

لغت: خَیْرَ: بہترین، یہ "مَنْ" کی جانب مضاف ہے۔ یَمَّمَ: قصد کیا۔ اَلْعَافُوْن: العافی کی جمع، سوال کرنے والے، مانگنے والے۔ سَاحَةٌ: گھر کا وسیع صحن، کشادہ جگہ، مراد چہار دیواری یا آستانہ (ج) ساحٌ وَسُوْحٌ وَسَاحَاتٌ۔ سَعْياً: دوڑتے ہوئے، یہ اصل میں مصدر ہے، مگر یہاں اسم فاعل "ساعِینَ" کے معنی میں "العافون" سے حال ہے۔ مُتُوْن: متن کی جمع، پیٹھ۔ الأینُق: ناقہ کی جمع، اونٹنیاں۔ الرُّسُمُ: رَسُوْم کی جمع، برق رفتار، تیز گام، وہ اونٹنی جو چلنے کے وقت زمین پر پاؤں کا نشان چھوڑے۔ اَلْآیَةُ: نشانی (ج) آيٌ وَآیَاتٌ۔ مُعْتَبِرٌ: عبرت پکڑنے والا، نصیحت حاصل کرنے والا۔ مُغْتَنِمٌ: غنیمت سمجھنے والا۔

تشریح: گزشتہ اشعار میں سرکار اقدس ﷺ کا تذکرہ غائبانہ تھا، اس کے لیے شاعر نے غائب کے صیغے استعمال کیے تھے، اب جب کہ غائبانہ ذکر ہوتے ہوتے سرکار اقدس ﷺ کا سراپا ذہن ودماغ پہ چھا گیا اور یہ تصور ہو چلا کہ سرکار سامنے ہیں اور میں ان کی بارگاہ والا

قدس میں حاضر ہوں، تو طرزِ کلام بدل گیا اور غائب کی بجائے حاضر کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے سرکار کی بارگاہ میں یوں التجا کی جارہی ہے: اے سب سے بہترین داتا جس کے در دولت پر مانگنے والے پیدل اور برق رفتار اونٹنیوں پر سوار ہوکر دوڑے چلے آتے ہیں اور جو عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عظیم ترین نشانی اور غنیمت سمجھنے والوں کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ اس طرزِ تعبیر اور پیرایۂ ادا کو علمائے بلاغت صنعتِ التفات کہتے ہیں۔

پہلے شعر میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ اعظم اور نائبِ اکبر ہیں، جو بہ اذنِ الٰہی اپنی بارگاہِ ناز میں آنے والے ہر محتاج کی حاجت روائی کرتے ہیں اور ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری فرماتے ہیں، اسی لیے دیکھا جارہا ہے کہ ہر سائل اور حاجت مند آپ کے درِ دولت کی طرف لپکا چلا جارہا ہے، اگر سواری میسر ہے تو سواری سے، ورنہ پیدل ہی۔

دوسرے شعر میں حضور کے ''آیتِ کبریٰ'' (عظیم ترین نشانی) اور ''نعمتِ عظمیٰ'' (بہت بڑی نعمت) ہونے کا تذکرہ ہے، اگر حضور کے اخلاقِ عظیمہ، خصالِ حمیدہ اور شمائلِ ستودہ کا مطالعہ کیا جائے تو یقین ہوجاتا ہے کہ آپ کا وجودِ پاک سر سے پیر تک اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نشانی ہے، اسی طرح آپ کے اہلِ ایمان کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہونے میں بھی شک نہیں، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝. (آل عمران، آیت: ۱۶۴)

(اس میں شک وشبہہ نہیں کہ مسلمانوں پر اللہ کا بڑا احسان ہوا کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے)۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

أي أنعم عليهم و أحسن اليهم ببعثة هذا الرسول، فانّ بعثته ﷺ احسان

إلیٰ کل العالمین وذلک لأنّ وجه الإحسان في بعثته کونه داعیاً لھم إلیٰ ما یخلصھم من عقاب اللّٰہ ویوصلھم إلیٰ ثواب اللّٰہ وھذا عام في حق العالمین، کما قال تعالیٰ "وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ" إلا أنه لم ینتفع بھذا الإنعام إلا أھل الاسلا م فلھذا التأویل خصّ تعالیٰ ھذہ المنة بالمؤمنین. (تفسیر کبیر)

یعنی اس رسول کو بھیج کر اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا اور ان کے ساتھ بھلائی کی، کیوں کہ حضور ﷺ کو بھیجنا ساری دنیا والوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہے، آپ کی بعثت میں بھلائی کا پہلو یوں ہے کہ آپ انہیں اس چیز کی طرف بلاتے ہیں جو انہیں اللہ کی سزا سے چھڑا کر اس کی جزا تک پہنچاتی ہے اور یہ ساری دنیا والوں کو عام ہے، کیوں کہ آپ ساری دنیا والوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے کہ: ''ہم نے تجھے سارے انسانوں کی طرف بھیجا''، مگر اس انعام اور بھلائی سے صرف اہل ایمان ہی نے فائدہ اٹھایا، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے خاص کر اہل ایمان ہی پر یہ احسان جتایا)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس میں صنعتِ التفات ہے جیسا کہ شرح میں گزرا (۲) دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں کے ہم وزن ہونے میں صنعتِ موازنہ ہے۔

(۱۰۸)
سَرَیۡتَ مِنۡ حَرَمٍ لَیۡلًا اِلیٰ حَرَمٍ
کَمَا سَرَی الۡبَدۡرُ فِيۡ دَاجٍ مِّنَ الظُّلَمِ

ترجمہ: آپ نے رات کے مختصر سے حصے میں ایک حرم سے دوسرے حرم تک سفر فرمایا، جیسے چودہویں کا چاند تاریک رات میں سفری منزلیں طے کرتا ہے۔

لغات: سَرَیۡتَ: صیغہ واحد مذکر حاضر، ماضی معروف از سَرَی یَسۡرِيۡ سُرًی (ض) بمعنی رات میں چلنا، رات میں سفر کرنا۔ لَیۡلاً: اس کی تنوین برائے تقلیل ہے، یعنی رات کی مختصر سی گھڑی میں، اور ''سَرَیۡتَ'' کے بعد ''لَیۡلاً'' کا ذکر اسی قلتِ وقت کو بتانے کے لیے ہے، جب کہ رات اس کے مفہوم میں داخل ہے اور کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے۔ حَرَمُ

: قابلِ حفاظت چیز، جس کا دفاع کیا جائے، مقدس اور لائق احترام شے (ج) حُرُم، یہاں پہلے حرم سے مراد مسجد حرام ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے اور جس کے صحن میں کعبہ شریف واقع ہے اور دوسرے حرم سے مراد مسجد اقصیٰ ہے جو فلسطین میں واقع ہے۔ اَلْبَدْرُ: مکمل، چودھویں رات کا چاند (ج) بُدُوْرٌ وَاَبْدَارٌ۔ دَاجٍ: تاریک، اسم فاعل از دَجَا یَدْجُوْ دُجُوًّا وَ دُجُوًّا (ن) بمعنی تاریک ہونا۔ اَلظُّلَمُ: تاریکیاں، اندھیرے، یہ ظُلْمَۃٌ کی جمع ہے۔

تشریح: گزشتہ دو اشعار میں سرکارِ دو جہاں ﷺ کو ایک خاص انداز میں ندا دی گئی اور یہ شعر جوابِ ندا ہے، یہاں سے شعر نمبر ۱۱۶ تک واقعۂ اسرا و معراج کا بیان ہے جو سرورِ کونین ﷺ کا نہایت بلند پایہ اور مشہور معجزہ ہے۔

خیال رہے کہ "اِسراء" مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک رات کے مختصر سے حصہ میں سرکار کا تشریف لے جانا ہے، اور "معراج" مسجدِ اقصیٰ سے آسمان کی بلندیوں کی سیر فرمانا اور عرش اعظم اور لامکان میں بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہو کر راز و نیاز کی باتیں کرنا ہے، یہ تو دونوں لفظ کے اصلی معنی ہیں، البتہ "اسرا" بول کر مجازاً اسرا و معراج کا مجموعہ اور یوں ہی معراج بول کر دونوں کا مجموعہ بھی مراد لیا جاتا ہے، واقعۂ اسرا قرآن کریم کی درج ذیل آیاتِ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُO (بنی اسرائیل: آیت: ۱)

(پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے مختصر سے حصہ میں مسجد حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک، جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے، تاکہ ہم اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں، بے شک وہی ہے سننے والا، دیکھنے والا)۔

جب کہ واقعۂ معراج کا بیان سورہ نجم کی مندرجہ ذیل ابتدائی آیات میں ہے:

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰیO مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰیO وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیO اِنْ

إلا وحی یوحیٰO عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوىٰO ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوىٰO وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلىٰO
ثم دنا فتدلّٰیO فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنىٰO فَاَوْحىٰ اِلىٰ عَبْدِهٖ مَآ اَوْحىٰO مَا كَذَبَ
الفؤاد ما رأیٰO اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلىٰ مَا يَرىٰO وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرىٰO عِنْدَ سِدْرَةِ
المنتهیٰO عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوىٰO اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشىٰO مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا
طغیٰO لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرىٰO(النجم: آیات، ۱تا۱۸)

(اس چمکتے تارے (محمد) کی قسم، جب یہ معراج سے اترے، تمہارے صاحب نہ بہکے، نہ بے راہ چلے اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے، وہ تو بس وحی ہوتی ہے جو انہیں کی جاتی ہے، انہیں سکھایا سخت قوتوں والے طاقت ور نے، پھر اس جلوہ نے قصد فرمایا، اور وہ آسمانِ بریں کے سب سے بلند کنارے پر تھا، پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا، پھر خوب اتر آیا، تو اس جلوہ اور اس محبوب میں دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا، پھر وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی، دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا، تو کیا تم ان سے ان کے دیکھے ہوئے پر جھگڑتے ہو؟ اور انہوں نے وہ جلوہ دو بار دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے، جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا، آنکھ نہ کسی طرف پھری، نہ حد سے بڑھی، بے شک اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں)۔

اس مقدس سفر کا تفصیلی تذکرہ تو کتبِ حدیث و سیرت میں ملے گا، یہاں اجمالی طور پر ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے جو احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہیں۔

حضور اقدس ﷺ ایک رات خانۂ کعبہ کے پاس حطیم میں آرام فرما رہے تھے کہ حضرت جبریل امین حاضر خدمت ہوئے، خواب سے بیدار کیا اور ارادۂ خداوندی سے آگاہی بخشی، حضور ﷺ اٹھے، چاہِ زمزم کے قریب لائے گئے، سینۂ مبارک کو چاک کیا گیا، قلبِ اطہر میں ایمان و حکمت سے بھرا ہوا طشت انڈیل دیا گیا، اور پھر سینۂ مبارک درست کر دیا گیا، حرم سے باہر تشریف لائے تو سواری کے لیے ایک جانور پیش کیا گیا جو براق کے نام سے موسوم ہے، اس کی

تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں نگاہ پڑتی وہاں قدم رکھتا تھا، حضور اس پر سوار ہوکر بیت المقدس تشریف لائے اور جس حلقہ سے انبیاے کرام کی سواریاں باندھی جاتی تھیں اس سے براق کو بھی باندھ دیا گیا، سرکارِ اقدس ﷺ مسجدِ اقصیٰ میں تشریف لے گئے، جہاں جملہ انبیاے سابقین حضور کے چشم براہ تھے، پھر آپ کی اقتدا میں سب نے نماز ادا کی، اس طرح "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ" کا جو عہد روز ازل انبیا سے لیا گیا تھا (کہ تم میرے محبوب پر ضرور ایمان لانا) کی تکمیل ہوئی، بعد ازاں موکب ہمایوں بلندیوں کی طرف روانہ ہوا، مختلف طبقاتِ آسمانی پر مختلف انبیا و مرسلین سے ملاقاتیں اور ہم کلامی ہوئی، ساتویں آسمان پر اپنے جدِ کریم ابوالانبیاء سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات ہوئی، انہوں نے "مرحبا بالنبي الصالح والابن الصالح" یعنی (اے نبی صالح خوش آمدید اور اے فرزندِ دل بند مرحبا) کے محبت بھرے کلمات سے استقبال کیا، حضرت ابراہیم بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے، حضور آگے بڑھے اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو انوار ربانی کی تجلی گاہ تھی، جس کی کیفیت الفاظ کے پیمانوں میں سما نہیں سکتی، عُقاب ہمت یہاں بھی آشیاں بند نہیں ہوا، اور آگے بڑھے، کہاں تک گئے اسے ما و شما کیا سمجھیں، زبان قدرت نے مقام قرب کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ٥ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ٥ وہاں کیا ہوا یہ بھی میری اور آپ کی رسائی سے بالاتر ہے، دل چاہے تو یوں کہہ لیں کہ پھر شاہدِ مستورِ ازل نے چہرہ سے پردہ اٹھایا اور خلوت گاہِ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام عطا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت بارِ الفاظ کی متحمل نہیں ہوسکتی فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی ٥۔ اس مقام قرب اور گوشۂ خلوت میں دیگر انعامات نفیسہ کے علاوہ شب و روز میں پچاس نمازیں ادا کرنے کا حکم ملا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عرض داشت پر حضور ﷺ نے کئی بار بارگاہِ رب العزت میں تخفیف کے لیے گزارش کی، چنانچہ نمازوں کی تعداد پانچ کردی گئی اور ثواب پچاس ہی کا رہا، فرازِ عرش سے محبوب رب العالمین مراجعت فرمائے خاکدان ارضی ہوئے، ابھی یہاں رات کا سماں تھا، ہر سو رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، سپیدۂ سحر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

اسی معجزۂ حبیب کا بیان حسان الہند امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کی کوثر و سلسبیل میں
ملی ہوئی زبان سے سینے اور قلب و ذہن اور روح و بدن کو اس کیف آگیں منظر سے محظوظ
ہونے کا مزید موقع دیجیے:

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لیے تھے

وہاں فلک پر یہاں زمین پر، رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
ادھر سے انوار ہنستے آتے، ادھر سے نفحات اٹھ رہے تھے

براق کے نقشِ سم کے صدقے، وہ گل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن، لہکتے گلشن، ہرے بھرے لہلہا رہے تھے

نمازِ اقصیٰ میں تھا یہی سر، عیاں ہوں معنئِ اول آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر، جو سلطنت آگے کر گئے تھے

چلا وہ سروِ چماں خراماں، نہ رک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکتی رہی وہ کب کے، سب این و آں سے گزر چکے تھے

جھلک سی اک قدسیوں پر آئی، ہوا بھی دامن کی پھر نہ پائی
سواری دولہا کی دور پہنچی، برات میں ہوش ہی گئے تھے

تھکے تھے روح الامیں کے بازو، چھٹا وہ دامن کہاں وہ پہلو
رکاب چھوٹی امید ٹوٹی، نگاہِ حسرت کے ولولے تھے

یہی سماں تھا کہ پیکِ رحمت، خبر یہ لایا کہ چلیے حضرت
تمہاری خاطر کشادہ ہیں جو کلیم پر بند راستے تھے

بڑھ اے محمد قریں ہو احمد، قریب آ سرورِ مُمجّد
نثار جاؤں یہ کیا ندا تھی، یہ کیا سماں تھا یہ کیا مزے تھے

تبارک اللہ شان تیری، تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوشِ لن ترانی، کہیں تقاضے وصال کے تھے

خرد سے کہہ دو کہ سر جھکا لے گماں سے گزرے گزرنے والے
پڑے ہیں یاں خود جہت کو لالے، کسے بتائے کدھر گئے تھے

سراغِ این و متیٰ کہاں تھا، نشانِ کیف و الیٰ کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی، نہ سنگِ منزل نہ مرحلے تھے

اٹھے جو قصرِ دنیٰ کے پردے، کوئی خبر دے تو کیا خبر دے
وہاں تو جا ہی نہیں دوئی کی، نہ کہہ کہ وہ بھی نہ تھے ارے تھے

محیط و مرکز میں فرق مشکل، رہے نہ فاصل خطوط واصل
کمانیں حیرت میں سر جھکائے، عجیب چکر میں دائرے تھے

حجاب اٹھنے میں لاکھوں پردے، ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے بچھڑے گلے ملے تھے

وہی ہے اول وہی ہے آخر، وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
اسی کے جلوے اسی سے ملنے، اسی سے اس کی طرف گئے تھے

ادھر سے تھیں نذرِ شہ نمازیں، ادھر سے انعامِ خسروی میں
سلام و رحمت کے ہار گندھ کر گلوئے پرنور میں پڑے تھے

نبیِ رحمت شفیعِ امت، رضا پہ للہ ہو عنایت
اسے بھی ان خلعتوں سے حصہ، جو خاص رحمت کے واں بٹے تھے

ثنائے سرکار ہے وظیفہ، قبولِ سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا، روی تھی کیا کیسے قافیے تھے

محاسنِ بلاغت: (۱) سرکار اقدس ﷺ کے رات کے اس سفر کی چودھویں رات کے چاند

مصنف مؤکد ہے۔ (۲) اس میں "سَرَیْتَ" اور "سَرٰی" کے درمیان تجنیس ہے۔ تشبیہ منصل مؤکد ہے۔ (۳) اس میں آیت اسرا کی جانب تلمیح ہے۔

وَبِتَّ تَرْقٰی اِلٰی اَنْ نِلْتَ مَنْزِلَۃً
مِنْ قَابَ قَوْسَیْنِ لَمْ تُدْرَکْ وَلَمْ تُرَم (۱۰۹)

ترجمہ: آپ بلندیوں کی جانب بڑھتے رہے، یہاں تک کہ "قاب قوسین" کی وہ منزل پالی جس تک نہ کسی کی رسائی ہوئی، نہ ہمت (وہ یہ کہ صرف دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا)۔

لغت: بِتَّ (ض): ماضی معروف، فعل ناقص از بیتوتۃ بمعنی صِرْتَ. قَابَ: مقدار، کمان کے وسط سے کنارہ تک کا فاصلہ، پہلے معنی کے لحاظ سے "قاب قوسین" کے لفظی معنی دو کمان کی مقدار ہے، اس سے مراد کمال قرب ہے اور یہ عرب کے محاورہ اور استعمال کے مطابق ہے، کیوں کہ جب دو امیر یا بادشاہ باہم صلح و معاہدہ کرتے تو ہر ایک اپنی کمان کا گوشہ دوسرے کی کمان کے گوشہ سے ملا دیا کرتا تھا، اگر "قاب" کا دوسرا معنی لیں تو اس عبارت میں قلب سمجھیے، یعنی اصل میں "قابي قوس" (کمان کے دو قاب) تھا، بعدِ قلب "قاب قوسین" ہوگیا، بہر حال اس سے مراد کمال قربِ معنوی اور رفعِ قدر و منزلت ہے، قرب مکانی مراد نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ مکان سے پاک ہے۔ لَمْ تُدْرَکْ: نفی جحد بلم از ادراکٌ بمعنی پانا، حاصل کرنا۔ لَمْ تُرَمْ: قصد نہ کیا گیا، نفی جحد بلم در فعل مستقبل مجہول از رَامَ یَرُوْمُ رَوْمًا (ن) قصد کرنا، چاہنا۔

تشریح: شعر کا مطلب یہ ہے کہ سرکار اقدس ﷺ شبِ معراج مسلسل ایک بلندی سے دوسری بلندی کی جانب بڑھتے رہے، یہاں تک کہ آپ نے بارگاہِ خداوندی میں قربت و نزدیکی کا وہ مقام حاصل کرلیا جہاں تک انبیا و مرسلین اور ملائکہ مُقرّبین میں سے کسی کی رسائی تو کیا اس کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ اس شعر میں سورۂ والنجم کی آیت کریمہ "ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی o فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی o" کی جانب اور اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس

کو امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، اس میں درج ذیل الفاظ آئے ہیں:
ثُمَّ عَلَا بِہٖ فَوْقَ ذٰلِکَ بِمَا لَا یَعْلَمُہٗ اِلَّا اللّٰہُ حَتّٰی جَاءَ سِدْرَۃَ الْمُنْتَھٰی وَدَنَا الْجَبَّارَ رَبَّ الْعِزَّۃِ فَتَدَلّٰی حَتّٰی کَانَ مِنْہُ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔

محاسنِ بلاغت: (۱) اس شعر میں صنعتِ تلمیح ہے، جیسا کہ شرح سے ظاہر ہے (۲) "قابَ قوسین" میں کنایہ ہے، کیوں کہ اس سے مراد کمال قربِ معنوی ہے۔

وَقَدَّمَتْکَ جَمِیْعُ الْاَنْبِیَاءِ بِھَا
(۱۱۰)
وَالرُّسْلِ تَقْدِیْمَ مَخْدُوْمٍ عَلٰی خَدَمِ

ترجمہ: اس رات سارے انبیا و مرسلین نے آپ کو اپنا امام و پیشوا بنایا، جیسے خدام اپنے مخدوم کو پیشوا بناتے ہیں۔

لغات: قَدَّمَتْکَ: آپ کو (نماز میں) آگے بڑھایا، اپنا امام و پیشوا بنایا۔ بِھَا: کی ضمیر کا مرجع یا تو "اللَّیْلَۃ" (رات) ہے جو گزشتہ سے پیوستہ شعر نمبر ۱۰۸ میں مذکور لفظ "لَیْلاً" سے سمجھا جاتا ہے یا "مَنْزِلَۃ" ہے جو گزشتہ شعر میں مذکور ہے، یا یہ ضمیر بیت المقدس کی طرف راجع ہے، جو سیاقِ کلام سے سمجھا جا رہا ہے۔ الرُّسُلُ: رسول کی جمع، ضرورتِ شعری کی وجہ سے سین کو ساکن پڑھا جاتا ہے، اس کا عطف "الانبیاء" پر ہے۔ خَدَمٌ خدام، یہ خادم کی جمع ہے۔

تشریح: صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بیت المقدس میں داخل ہوئے تو تمام پیغمبر وہاں جمع ہو گئے اور نماز کا وقت آ گیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور کو امامت کے لیے آگے بڑھایا، آپ نے وہاں سارے پیغمبروں کی امامت فرمائی، اس شعر میں اسی امامت کی طرف اشارہ ہے، اس شعر میں تقدیم (آگے بڑھانے) کی نسبت انبیا و مرسلین کی طرف اس لیے ہے کہ وہ حضور کی امامت پر راضی ہو گئے تھے، تو گویا خود انہوں نے ہی آپ کو آگے بڑھایا اور امام بنایا۔

محاسنِ بلاغت: (۱) "قَدَّمَتْ" اور "تقدیم" کے درمیان تجنیسِ اشتقاق ہے۔ (۲) حضور

کریم ﷺ کے آگے بڑھانے کو مخدوم کے آگے بڑھانے سے تشبیہ دینا تشبیہ بلیغ ہے۔(۳) اس شعر میں صنعت تلمیح بھی ہے، جیسا کہ تشریح سے واضح ہے۔

(۱۱۱)

وَاَنْتَ تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ بِهِمْ
فِيْ مَوْكِبٍ كُنْتَ فِيْهِ صَاحِبَ الْعَلَمِ

ترجمہ: آپ ساتوں آسمانوں کا سفر پیغمبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے ملائکہ کے جلوس میں کر رہے تھے، جس کے سردار اور علم بردار آپ ہی تھے۔

لغات: تَخْتَرِقُ :مضارع معروف از اختراق بمعنی چلنا، طے کرنا، پار کرنا. الطِّبَاق :طبق کی جمع، تہ، درجہ. السَّبْعَ الطِّبَاق سے مراد آسمان کے سات درجے، ساتوں آسمان ہیں. بِهِمْ :انبیاو مرسلین کے پاس سے. مَوْكِبٌ :جلوس، قافلہ، یہاں مراد فرشتوں کا جلوس ہے (ج) مواکب. الْعَلَمُ :جھنڈا، پرچم (ج) اعلام. صاحِبُ العَلَمِ :علم بردار، مراد سردار، پیشوا۔

تشریح: سرکار اقدس ﷺ نے ملائکہ کے جلوس میں سردار و پیشوا کی حیثیت سے حضرت جبریل علیہ السلام کی ہمرکابی میں ساتوں آسمان طے فرمائے اور وہاں مختلف انبیائے کرام سے ملاقات فرمائی اور ان کی جانب سے آپ کو خوش آمدید کہا گیا، چنانچہ پہلے آسمان پر حضرت آدم سے، دوسرے پر حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ سے، تیسرے پر حضرت یوسف سے، چوتھے پر حضرت ادریس سے، پانچویں پر حضرت ہارون سے، چھٹے پر حضرت موسیٰ سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے ملاقات ہوئی۔

(اخرجه احمد والشيخان وابن جرير من طريق قتادة عن انس عن مالك بن صعصعة)

محاسن بلاغت: (۱) "صاحبُ العَلَمْ" کنایہ ہے سردار سے یا نمایاں ترین شخصیت سے۔

(۱۱۲)

حَتّٰى اِذَا لَمْ تَدَعْ شَأْوًا لِمُسْتَبِقٍ
مِنَ الدُّنُوِّ وَلَا مَرْقًى لِمُسْتَنِمِ

(۱۱۳)

خَفَضْتَ كُلَّ مَقَامٍ بِالْاِضَافَةِ اِذْ
نُوْدِيْتَ بِالرَّفْعِ مِثْلَ الْمُفْرَدِ الْعَلَمِ

ترجمہ: یہاں تک کہ جب آپ نے مقابلہ کرنے والے کے لیے قربِ خداوندی کا کوئی میدان اور بلندی پر چڑھنے کے لیے کوئی زینہ نہیں چھوڑا تو آپ نے اپنے بلند مقام کے لحاظ سے ہر مقام کو پست کر دیا، جب کہ آپ کو سر برآوردہ یگانہ کی حیثیت سے بلندی پر بلایا گیا۔

لغات: حَتّٰی: برائے انتہائے غایت، یہ "تخترق" کی غایت ہے۔ لَمْ تَدَعْ (ف): آپ نے نہیں چھوڑا۔ شَأْوٌ: غایت ومقصد۔ مُسْتَبِقٌ: طالبِ سبقت، سبقت لے جانے کی کوشش کرنے والا۔ الدُّنُوُّ: قرب، مراد قربِ خاص، قربِ الٰہی۔ مَرْقِیٌّ: چڑھنے کی جگہ، درجہ، زینہ (ج) مراقی۔ مُسْتَنِمٌ: اسم فاعل از استنام، چوٹی پر چڑھنے کا خواہاں، بلندی پر چڑھنے کی کوشش کرنے والا۔ خَفَضْتَ: آپ نے پست کر دیا، ماضی معروف از خَفْض بمعنی پست کر دیا۔ الاضافۃ: نسبت، مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان پایا جانے والا رشتہ اور تعلق۔ نُوْدِیْتَ: آپ کو ندا دی گئی، ماضی مجہول از مُنَادَاۃ ونِدَاء بمعنی پکارنا، منادی بنانا۔ الرَّفْع: بلندی، اصطلاحِ نحو میں اسم کے مرفوع ہونے کی علامت (ضمہ، الف، واؤ)۔ اَلْمُفْرَدُ: یکتا، یگانہ، نحویوں کے نزدیک وہ اسم جو مضاف اور مشابہ مضاف نہ ہو۔ اَلْعَلَمُ: نامور، سر برآوردہ اور اصطلاحِ نحو میں معرفہ کی ایک خاص قسم (ج) اعلام۔

تشریح: ان اشعار میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو واقعۂ معراج کے تعلق سے علامہ عمر بن احمد خرپوتی نے عصیدۃ الشہدۃ میں اسی شعر کی تشریح کرتے ہوئے نقل فرمائی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام سرکارِ اقدس ﷺ کے ساتھ چلتے رہے، یہاں تک کہ جب سدرۃ المنتہیٰ آیا جو ایک بلند و بالا درخت ہے، جس کے پتے ہاتھی کے کان جیسے ہیں اور جس کی جڑ سے چار نہریں رواں ہیں، دو نہریں ظاہر ہیں اور دو باطن، سرکارِ اقدس ﷺ نے جبریل امین سے ان نہروں کی بابت دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا: دونوں باطنی نہریں تو وہ ہیں جو جنت میں ہیں، (جن کے نام کوثر و سلسبیل ہیں) اور ظاہری نہریں نیل اور فرات ہیں، اس مقام پر آکر حضرت جبریل ٹھہر گئے، سرکار نے فرمایا: جبریل آگے

چلو، تو حضرت جبریل نے عرض کیا: لَوْ دَنَوْتُ اَنْمَلَةً لَاحْتَرَقْتُ: یعنی میں اگر ایک انگل بھر آگے بڑھوں تو تجلیِ جمال سے جل جاؤں، بلبل شیراز حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ اپنی مشہور زمانہ کتاب "بوستاں" میں اسی حدیث کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر یک سرموئے برتر پرم — فروغ تجلا بسوزد پرم

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کی پرواز کی بھی حدیں مقرر ہیں، جن سے وہ ذرہ برابر بھی آگے نہیں بڑھ سکتے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌO (الصافات:۱۶۴)

(اور (فرشتے کہتے ہیں) ہم میں سے ہر ایک کا ایک متعین مقام ہے)۔

انوار التنزیل میں ہے کہ "سدرۃ المنتہیٰ" ساتویں آسمان پر ایک درخت ہے، عالم بالا سے جو (احکام وارزاق وغیرہ) آتے ہیں وہ پہلے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں پھر وہاں سے فرشتے زمین پر لاتے ہیں، اسی طرح جو اعمال یہاں سے اوپر جاتے ہیں وہ بھی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں پھر وہاں سے اٹھائے جاتے ہیں۔

ان سب کا حاصل یہ ہے کہ کوئی نبی، رسول یا فرشتہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکتا، یہ سرکار اقدس ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ اس سے بھی آگے تشریف لے گئے۔

ان دونوں اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ آپ آگے بڑھتے رہے، بڑھتے رہے، یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ کے مقام سے بھی آگے بڑھ گئے، جس کے آگے کوئی نبی، کوئی رسول اور کوئی فرشتہ نہیں جاسکتا، اس طرح آپ نے کسی طالب سبقت کے لیے کوئی میدان اور بلندی پر چڑھنے کی کوشش کرنے والے کے لیے کوئی زینہ نہ چھوڑا، تو ان سب میں آپ بلند مقام ومرتبہ والے ہوئے اور وہ سب آپ کی بہ نسبت پست مقام والے ٹھہرے، اس مقام رفعت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو (علم مفرد ہونے کی حیثیت سے) مرفوع کر کے پکارا اور آپ کو یوں ندا کی: اُدْنُ یا مُحَمَّدُ اُدْنُ یَا مُحَمَّدُ (اے محمد! اور قریب آیئے، اے محمد! اور قریب آیئے) طالب

ومطلوب کے درمیان تو دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ قصیدۂ معراجیہ میں اسی کی ترجمانی یوں کرتے ہیں:

یہی سماں تھا کہ پیکِ رحمت خبر یہ لایا کہ چلیے حضرت
تمہاری خاطر کشادہ ہیں جو کلیم پر بند راستے تھے

بڑھ اے محمد، قریں ہو احمد، قریب آ سرورِ مجد
نثار جاؤں یہ کیا ندا تھی، یہ کیا سماں تھا یہ کیا مزے تھے

اس سے ظاہر ہے کہ اس مقامِ قربِ معنوی میں آپ کی رفعتِ مرتبت نے سب کی رفعتِ مراتب کو پست کر دیا۔

اس شعر میں امام بوصیری علیہ الرحمہ نے خفض، اضافت، ندا، رفع، مفرد، علم جیسی علم نحو کی اصطلاحات کو بڑی مہارت اور نزاکت کے ساتھ شعر کی لڑی میں پرویا ہے، گرچہ انہوں نے یہاں نحوی اور اصطلاحی معانی مراد نہیں لیے ہیں، بلکہ لغوی معانی مراد لیے ہیں، جس سے آپ کی شعر و شاعری میں مہارت، قادر الکلامی، نکتہ سنجی اور دقیقہ بینی کا پتہ چلتا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) خفض، اضافت، یوں ہی ندا، رفع، مفرد اور علم کو ایک ہی جملے میں جمع کرنے میں صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے (۲) اور ان کلمات سے لغوی معنی مراد لینا جب کہ ظاہر اصطلاحی معنی ہیں، صنعتِ توریہ ہے (۳) اور خفض و رفع کو یکجا کرنے میں طباقِ ایجاب ہے۔

(۱۱۴)

كَيْمَا تَفُوْزَ بِوَصْلٍ اَيِّ مُسْتَتِرٍ
عَنِ الْعُيُوْنِ وَسِرٍّ اَيِّ مُكْتَتِمِ

ترجمہ: تا کہ آپ اس وصل سے بہرہ ور ہوں جس کی حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے بالکل پوشیدہ ہے اور اس رازِ سربستہ سے باخبر ہوں جو بالکل محفوظ ہے۔

لغات: **كَيْمَا:** اس میں "كَیْ" برائے علت بیانی ہے، فعل مضارع پر داخل ہو کر اسے نصب دیتا ہے، "مَا" زائد ہے، اردو میں اس کا معنی ہے "تا کہ"۔ **اَيِّ مُسْتَتِرٍ:** نہایت پوشیدہ،

بالکل چھپا ہوا، یہ یہاں موصوفِ محذوف کی صفت واقع ہے، اصل عبارت یوں ہے "بِوَصْلٍ مُسْتَتِرٍ اَيِّ مُسْتَتِرٍ" لفظ "اَيٌّ" مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، انہیں میں سے ایک معنی ہے کسی چیز کے کامل ہونے کا بیان، اس صورت میں یہ نکرہ کی صفت واقع ہوتا ہے، جیسے حاتمٌ جوادٌ اَيُّ جَوَادٍ: یعنی حاتم بے انتہا سخی ہے، زَیْدٌ رَجلٌ اَيُّ رَجُلٍ: یعنی زید بہت باکمال مرد ہے۔ مُکْتَتِم: اسم فاعل از باب افتعال، بمعنی پوشیدہ، چھپا ہوا۔

تشریح: اس شعر میں گزشتہ شعر کی علت بیان کی گئی ہے، یہاں "وصل" سے مراد ظاہری اور جسمانی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا ہے، اور "راز سربستہ" سے مراد اللہ عزوجل سے مناجات اور ہم کلامی ہے، مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو اس مقام قرب میں اس لیے بلایا گیا تھا کہ آپ کو ایسا وصل الٰہی اور دیدارِ خداوندی نصیب ہو جو کسی بھی شخصیت کو حاصل نہ ہوا اور اس رازِ سربستہ سے آگاہی ہو جائے جس سے کوئی بشر یا فرشتہ آگاہ نہیں۔

اس شعر میں سورۃ النجم کی آیت "فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝" کی طرف اشارہ ہے، جس کا مطلب ہے: اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو جو وحی (اس موقع پر) فرمائی تھی وہ بے واسطہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کے درمیان کوئی واسطہ نہ تھا اور یہ خدا اور رسول کے درمیان کے رُموز و اَسرار ہیں جن پر ان کے سوا کسی کو اطلاع نہیں، بقلی نے کہا: کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو کیا وحی فرمائی تھی اس راز کو اس نے تمام مخلوق سے پوشیدہ رکھا اور بیان نہ فرمایا، اور محبّ و محبوب کے ایسے راز ہوتے ہیں جن کو ان کے سوا کوئی نہیں جانتا (تفسیر روح البیان)۔

میان عاشق و معشوق رمزے ست — کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

بعض اہل علم کا بیان ہے کہ اس شب میں سرکارِ اقدس ﷺ کو جو وحی فرمائی گئی وہ کئی قسم کے علوم و معارف تھے، ایک تو علم شرائع و احکام جن کی سب کو تبلیغ کی جاتی ہے،

دوسرے معارف الٰہیہ، جو خواص کو بتائے جاتے ہیں، تیسرے حقائق ونتائج علوم ذوقیہ جو صرف اخص الخواص کو تلقین کیے جاتے ہیں، چوتھے وہ رموز واسرار جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ خاص ہیں، کوئی اور ان کو برداشت ہی نہیں کرسکتا۔

(تفسیر روح البیان وتفسیر خزائن العرفان)

فَحُزْتَ کُلَّ فَخَارٍ غَیْرَ مُشْتَرَکٍ
وَجُزْتَ کُلَّ مَقَامٍ غَیْرَ مُزْدَحَمٍ (۱۱۵)

ترجمہ: تو آپ نے ہر قابلِ فخر کمال اپنی ذات میں اس طرح سمیٹ لیا کہ اس میں کوئی آپ کا شریک وسہیم نہیں اور ہر منزل آپ نے تنِ تنہا طے کی جس میں آپ کا کوئی مزاحم نہیں۔

لغات: حُزْتَ (ن): آپ نے جمع کرلیا. فَخَارٌ: قابلِ فخر چیز. جُزْتَ: صیغہ واحد ذکر حاضر، فعل ماضی از جَازَ یَجُوْزُ جَوَازًا (ن) بمعنی طے کرنا، گزرنا۔

تشریح: اس شعر میں ''قابلِ فخر فضیلت'' سے مراد درجات وسیلہ وفضیلہ، درجاتِ رفیعہ، کوثر اور شفاعتِ عظمیٰ، مقام محمود اور لواء الحمد ہے اور ''مقام'' سے مراد محبت، ختم نبوت اور رسالتِ عامہ کا مقام ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) حُزْتَ اور جُزْتَ کے درمیان تجنیس لاحق ہے. (۲) اور اس شعر میں صنعت مماثلہ بھی ہے، اور مماثلہ یہ ہے کہ ایک فقرے کے تمام یا اکثر الفاظ دوسرے فقرے کے ان الفاظ کے ہم وزن ہوں جو اُن کے مقابل آئے ہیں، جیسے آیت کریمہ:

وَاٰتَیْنٰھُمَا الْکِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ ٥ وَ ھَدَیْنٰھُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ٥ (الصافات: ۱۱۷-۱۱۸)

وَجَلَّ مِقْدَارُ مَا وُلِّیتَ مِنْ رُتَبٍ
وَعَزَّ اِدْرَاکُ مَا اُوْلِیْتَ مِنْ نِّعَمٍ (۱۱۶)

ترجمہ: جو رتبے آپ کو عطا کیے گئے بڑے جلیل القدر ہیں اور جن نعمتوں سے آپ سرفراز کیے گئے ان کا حصول بہت مشکل ہے۔

لغات: وُلِّيتَ: آپ والی بنائے گئے، فعل ماضی مجہول از "تَوْلِيَة" بمعنی والی بنانا، مالک بنانا، رُتَب: مراتب ودرجات، یہ رتبہ کی جمع ہے۔ عَـزَّ: دشوار ہوا، مشکل ہوا، فعل ماضی از باب ضرب۔ أُوْلِيتَ: فعل ماضی مجہول از ایلاءٌ بمعنی عطا کرنا۔ نِعَم: نعمتیں، یہ نعمۃ کی جمع ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں وُلِّيتَ اور اُوْلِيتَ کے درمیان تجنیس ناقص ہے (۲) اور اس میں صنعت مماثلہ بھی ہے۔

بُشْرىٰ لَنَا مَعْشَرَ الْإِسْلَامِ إِنَّ لَنَا
مِنَ الْعِنَـايَةِ رُكْناً غَيْرَ مُنْهَدِمِ (۱۱۷)

ترجمہ: ہم مسلمانوں کے لیے خوش خبری ہے کہ عنایتِ ربانی سے ہمیں ایک ایسا ستون میسر آگیا ہے جو کبھی زمیں بوس نہیں ہوگا۔

لغات: بُشْرىٰ: خوش خبری، مسرت بخش خبر (ج) بُشَر۔ مَعْشَر: گروہ، جماعت (ج) مَعاشِر۔ رُكْن: پایہ، ستون جس پر عمارت قائم ہو (ج) أَرْكَان وَأَرْكُن۔

تشریح: اس شعر کا پہلے کے مضمون سے تعلق یہ ہے کہ جب گزشتہ اشعار میں یہ بیان ہوا کہ سرکارِ اقدس ﷺ کو شبِ معراج عظیم الشان مراتب ودرجات عطا کیے گئے اور بے شمار نعمتوں سے سرفراز کیا گیا تو ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا سرکار کے طفیل آپ کی امت پر بھی کچھ عنایاتِ ربانیہ کی بارش ہوئی اور اسے بھی کچھ امتیازات وخصوصیات کا حصہ ملا؟ تو امام بوصیری نے اس شعر میں اسی سوال کا جواب دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بے شک سرکار اقدس ﷺ کے صدقہ میں آپ کی امت بھی الطاف ربانی اور عنایاتِ خداوندی سے شادکام ہوئی۔

علمائے کرام نے امت محمدیہ کے خصائص اور امتیازی اوصاف تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں بیان فرمائے ہیں، یہاں ان کا خلاصہ اور عطر مجموعہ شیخ عمر بن احمد خرپوتی علیہ الرحمہ کی تصنیف "عصیدۃ الشہدۃ شرح قصیدۃ البردۃ" کے حوالے سے نذرِ قارئین ہے:

۱- ہمارے لیے مالِ غنیمت حلال ہیں، جب کہ گزشتہ امتوں کے لیے یہ حلال نہ تھے۔

۲- ہمارے لیے پوری روے زمین مسجد بنادی گئی (کہ ہم جہاں چاہیں سجدہ کریں)۔
۳- ہمارے لیے مٹی کو پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنادیا گیا (کہ پانی کے استعمال کی قدرت نہ ہونے کی صورت میں ہم مٹی سے تیمم کر کے طہارت اور پاکی حاصل کر سکتے ہیں)۔

۴- ہمیں وضو عطا ہوا جب کہ سابقہ امتوں میں یہ نعمت صرف انبیاے کرام کو حاصل تھی، ان کی امتیں اس سے محروم تھیں۔

۵- ہم پر پانچ نمازیں فرض ہوئیں، جب کہ کسی اور امت پر پانچ نمازیں فرض نہ تھیں۔
۶- ہمیں اذان واقامت ملی، جب کہ گزشتہ امتیں اس سے محروم تھیں۔
۷- ہم کو بسم اللہ الرحمن الرحیم عطا ہوئی، سابقہ امتوں کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔
۸- ہم کو سورہ فاتحہ کے بعد امام کے پیچھے آمین کہنے کا حکم ملا، جب کہ دیگر امتوں کے لیے یہ حکم نہ تھا۔

۹- ہماری عبادت میں رکوع رکھا گیا جب کہ اور امتوں میں یہ نہ تھا۔
۱۰- ہمیں نمازوں میں صفیں بنانے کا حکم ہے جیسے فرشتے صفیں بناتے ہیں۔
۱۱- ہمیں جمعہ میں ایک ایسی گھڑی ملی جس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔
۱۲- امت محمدیہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ رمضان المبارک کی پہلی رات میں اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت فرماتا ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت ہو جائے وہ (دائمی) عذاب میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

۱۳- امت محمدیہ کے لیے رمضان المبارک کی پہلی رات میں جنت سجا اور سنوار دی جاتی ہے اور ماہِ رمضان کی ہر رات فرشتے اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اس کی آخری رات میں امت کے سارے (صغیرہ) گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔
۱۴- ہمیں رمضان شریف میں روزہ کے لیے سحری کی نعمت ملی، جب کہ گزشتہ امتیں اس سے محروم تھیں۔

۱۵- اس امت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے افطار میں جلدی کرنے کا حکم ہے۔
۱۶- امت محمدیہ کو شب قدر ملی (جس میں عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے) اگلی امتیں اس سے محروم تھیں۔
۱۷- ہمیں مصیبت کے وقت "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھنے کا حکم ہے۔
۱۸- اس امت سے اللہ تعالیٰ نے بوجھ (جیسے توبہ میں اپنے آپ کو قتل کرنا اور جن اعضائے جسمانی سے گناہ صادر ہوں ان کو کاٹ ڈالنا) اور گلے کے پھندے (جیسے بدن اور کپڑے کے جس مقام پر نجاست لگے اسے قینچی سے کاٹ ڈالنا، کافروں سے جنگ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کو جلا دینا اور گناہوں کا مکانوں کے دروازوں پر ظاہر ہونا وغیرہ) اٹھا دیے گئے، اس کا ذکر قرآن کریم کی درج ذیل آیت کریمہ میں ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۠ (الاعراف: ۱۵۷)

(وہ جو غلامی کریں گے اس رسول امی غیب کی خبریں دینے والے کی جسے وہ اپنے پاس توریت وانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے، وہ انہیں بھلائی کا حکم دے گا، برائی سے منع کرے گا، پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے اتارے گا، تو جو اس پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اسے مدد دیں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ اترا وہی بامراد ہوئے)۔

۱۹- اس امت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے دین میں حرج اور تنگی نہیں رکھی اس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے:

هُوَ اجۡتَبٰکُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ (الحج:۷۸)
(اس نے تمہیں پسند کیا اور تم پر دین میں کچھ تنگی نہ رکھی)۔

۲۰- اس امت سے اللہ تعالیٰ خطا و نسیان پر مواخذہ نہیں فرماتا۔

۲۱- مسلم ہونا امت محمدیہ کا خاص وصف ہے، اس میں انبیاے کرام کے سوا اور امتیں شامل نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ هٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ.

(اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اگلی کتابوں میں اور اس قرآن میں، تاکہ رسول تمہارا نگہبان و گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہی دو)۔

۲۲- ہماری شریعت کامل ترین شریعت ہے۔

۲۳- یہ امت گمراہی پر کبھی متفق نہیں ہوسکتی۔

۲۴- اس امت کا اجماع و اتفاق حجتِ شرعیہ ہے اور اس کا اختلاف رحمت ہے (یہاں اختلاف سے مراد ان فروعی مسائل میں اختلاف ہے جن کا حکم شریعت میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے، ان کے سوا مسائل و احکام اور عقائد میں اختلافِ رحمت نہیں سراسر زحمت ہے)۔

۲۵- اس امت کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اسے کم عمل پر زیادہ ثواب ملتا ہے۔

۲۶- امت محمدیہ میں خدانخواستہ اگر طاعون آئے تو اس میں موت شہادت اور یہ اس کے لیے اللہ کی رحمت ہے، جب کہ دیگر امتوں کے لیے یہ عذاب الٰہی تھا۔

۲۷- اس امت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کے دو شخص کسی میت کے اچھے اور نیک ہونے کی شہادت دیں تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔

۲۸- اس امت کی ایک خصوصیت ''اسناد'' ہے، ابن حزم نے لکھا ہے کہ ایک ثقہ

کی دوسرے ثقہ سے روایت اور اسی طرح تسلسل کے ساتھ نبی کریم ﷺ تک اسے پہنچا دینا صرف امت محمدیہ کا امتیازی وصف ہے جو دیگر قوموں اور امتوں میں موجود نہیں۔

۲۹- اس امت میں کتابوں کی تصنیف و تحقیق کا سلسلہ جاری رہے گا، شیخ ابن العربی نے شرح ترمذی میں لکھا ہے کہ سابقہ امتوں میں سے کسی امت میں بھی اس قدر تصنیف و تالیف اور تفریع و تدقیق کا کام نہیں ہوا جتنا امت محمدیہ میں۔

۳۰- اس امت مرحومہ میں قطب، غوث، اوتاد، ابدال اور نُجَبا ہیں، جن سے دوسری امتیں خالی ہیں۔

۳۱- اس امت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی گنہ گار عاصی و سیہ کار قبر میں داخل ہو اور دوسرے مومنین اس کے لیے دعاے مغفرت کرتے رہیں تو اس کی بخشش ہو جائے گی اور وہ قبر سے گناہوں سے پاک و صاف ہو کر باہر نکلے گا۔

۳۲- اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن آثارِ وضو سے اس کی پیشانی روشن اور ہاتھ پیر نورانی ہوں گے۔

۳۳- بروز محشر سب سے پہلے یہی امت قبروں سے باہر نکلے گی۔

۳۴- سرکارِ اقدس ﷺ کے طفیل میدان محشر میں اسے ٹھہرنے کے لیے بلند مقام ملے گا۔

۳۵- اس امت کو قیامت میں داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال دیے جائیں گے۔

۳۶- اس امت کے ستر ہزار افراد بلا حساب و کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔

۳۷- اس کی ایک امتیازی شان یہ بھی ہے کہ جنت میں سب سے پہلے اسی امت کے افراد داخل ہوں گے، پھر دیگر امتیں جائیں گی۔

(عصیدۃ الشہدۃ بزیادۃ وتغیر، ۱۸۴، مطبوعہ کراچی)

۳۸- اس امت کی شریعت کبھی منسوخ نہ ہوگی بلکہ قیامت تک باقی رہے گی، جب کہ سابقہ امتوں کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔

جسے امت محمدیہ کے خصائص اور امتیازی اوصاف کی تفصیل درکار ہو وہ العمدۃ شرح قصیدۃ البردہ از علامہ نور بخش توکلی، عصیدۃ الشہدۃ شرح قصیدۃ البردۃ از علامہ عمر بن احمد خرپوتی اور الخصائص الکبریٰ از علامہ جلال الدین سیوطی وغیرہ کا مطالعہ کرے۔

اس شعر میں ''رُکن'' (ستون) سے مراد شریعتِ اسلامیہ ہے اور ''زمیں بوس نہ ہونے'' سے مراد اس کا منسوخ نہ ہونا ہے، حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ اس شعر میں مسلمانوں کو خوش خبری سناتے ہوئے فرماتے ہیں: زہے نصیب! ہم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے ایک ایسا دین اور ایسی شریعت ملی ہے جو ہر طرح سے مضبوط و مستحکم ہے اور سابقہ شریعتوں کی طرح منسوخ ہونے والی نہیں، یہ ایک سدا بہار شریعتِ خداوندی ہے جو کبھی خزاں رسیدہ نہ ہوگی۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں لفظِ ''رُکن'' میں استعارۂ تصریحیہ اصلیہ ہے اور ''منہدم'' کا ذکر ترشیح ہے۔

(۱۱۸)

لَمَّا دَعَا اللّٰهُ دَاعِيْنَا لِطَاعَتِهِ
بِاَكْرَمِ الرُّسُلِ كُنَّا اَكْرَمَ الْاُمَمِ

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی طاعت کی طرف بلانے والے رسول کو ''اشرف الرسل'' کہہ کر پکارا تو ہم ''اشرف الامم'' ہوئے۔

تشریح: کیوں کہ اشرف الرسل، اشرف الامم ہی کی طرف بھیجا جاتا ہے، سرکارِ اقدس ﷺ کا ''اکرم الرسل'' (سب سے افضل و اشرف رسول) ہونا احادیث سے ثابت ہے، امام ترمذی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ سرکار نے فرمایا:

اَنَا اَكْرَمُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ عَلَى اللّٰهِ وَلَا فَخْرَ.

(میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سارے اولین و آخرین سے افضل و بہتر ہوں، یہ کوئی فخر نہیں)۔

اور جامع ترمذی ہی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:
''أَنَا أَكْرَمُ وُلْدِ آدَمَ عَلٰى رَبِّيْ'' میں اپنے رب کے نزدیک تمام اولادِ آدم سے افضل ہوں۔

محاسنِ بلاغت: (۱) اس شعر میں ''دَعَا'' اور ''دَاعِيْ'' کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے۔

الفصل الثامن
في ذكر جهاد النبي ﷺ

(۱۱۹)
رَاعَتْ قُلُوْبَ الْعِدَىٰ اَنْبَاءُ بِعْثَتِهٖ
كَنَبْأَةٍ اَجْفَلَتْ غُفْلاً مِّنَ الْغَنَمِ

ترجمہ: حضور کی بعثت کی خبروں نے دشمنوں کے دلوں میں خوف و دہشت پیدا کردی، جیسے شیر کی ایک چنگھاڑ بھولی بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ میں ہلچل پیدا کردے۔

لغات: رَاعَتْ: دہشت پیدا کردی، ڈرادیا، فعل ماضی از باب نصر. اَلْعِدیٰ: عدو کی جمع، دشمن. اَنْبَاءٌ: نَبَأٌ کی جمع، خبر، اس لفظ کا اطلاق ہر اس خبر پر ہوتا ہے جو اہمیت و عظمت رکھنے کے ساتھ ایسے ذرائع سے حاصل ہوئی ہو جن سے یقین یا کم از کم گمان غالب حاصل ہوجائے. نَبْأَةٌ آواز، مراد شیر کی گرج دار آواز. اَجْفَلَتْ: بھگادیا، ہلچل پیدا کردیا. غُفْلٌ: غافل کی جمع، لاپروا، بے فکر، بے خبر. اَلْغَنَمُ: بھیڑ بکریوں کا ریوڑ، یہ اسم جمع ہے۔

تشریح: اس شعر میں "بعثت کی خبروں" سے مراد وہ خبریں ہیں جو کاہنوں، نجومیوں، راہبوں اور پادریوں کے ذریعہ اس وقت کے کافروں اور مشرکوں کو ملی تھیں، جن میں یہ مضمون تھا کہ بہت جلد دین اسلام دوسرے ادیان و مذاہب پر غالب آجائے گا اور سب کے تارے اس کے سورج کے سامنے روپوش ہوجائیں گے، ان خبروں سے عیسائیوں، یہودیوں، کافروں اور مشرکوں میں ایک عجیب دہشت اور عجیب خوف تھا، بقول ایک شاعر:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

آوازۂ رسالت سے دشمنوں کے دل کانپ اٹھے اور وہ بے خبر بھیڑوں کی طرح

بھاگ کھڑے ہوئے جو شیر کی ایک گرج اور چنگھاڑ سن کر سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوں۔
اس شعر میں صحیح بخاری وصحیح مسلم کی ایک حدیث پاک کی طرف اشارہ ہے، سرکار اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نُصِرتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ.

(ایک مہینہ کی مسافت تک رعب ودہشت سے من جانب اللہ میری تائید ونصرت ہوئی)۔
طبرانی کی روایت میں ''شہر'' کے بجائے ''شہرین'' ہے۔
(الزبدۃ العمدۃ للملا علی قاری، ص۱۰۰)

محاسن بلاغت: (۱) أنباء اور نبأۃ کے درمیان صنعت اشتقاق ہے۔ (۲) رَاعتْ کی اسناد ''أنباء بعثته'' کی جانب اسناد مجازی ہے، کیوں کہ دشمنوں میں خوف ودہشت پیدا کرنا در حقیقت اللہ تعالیٰ کا کام ہے، بعثت کی خبریں تو صرف اس کا سبب تھیں۔

(۱۲۰)
مَازَالَ يَلْقَاهُمْ فِيْ كُلِّ مُعْتَرَكٍ
حَتّٰى حَكَوْا بِالْقَنَا لَحْماً عَلٰى وَضَمِ

ترجمہ: آپ ہر میدان کارزار میں ان دشمنوں سے برسر پیکار رہے، یہاں تک کہ نیزوں کے وار سے وہ اس گوشت کے مانند بے وقعت ہو گئے جو قصاب کے تختہ پر پڑا ہو۔

لغات: يَلْقَى الْأَعْدَاءَ: دشمنوں کا مقابلہ کرتے، ان سے برسرپیکار رہتے۔ مُعْتَرَكٌ: میدان جنگ، معرکہ کارزار۔ حَكَوْا: مشابہ ہو گئے، یہ حکایت بمعنی مشابہت سے فعل ماضی معروف ہے۔ اَلْقَنَا: نیزے، قناۃ کی جمع۔ وَضَمٌ: لکڑی کا وہ تختہ جس پر قصاب گوشت کاٹتا ہے، جسے کُندی کا مُدھی یا ٹھیہہ کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: تَرَكَهُمْ لَحْماً عَلٰى وَضَمٍ یعنی اس نے ان کو مصیبتوں میں ڈال دیا اور کچل کر رکھ دیا، ذلیل کر دیا (ج) اَوْضَام و اَوْضِمَة۔

تشریح: اس شعر کا مقصد سرکار اقدس ﷺ کے کمال شجاعت کو بیان کرنا ہے، مفہوم یہ ہے کہ سرکار اقدس ﷺ دشمنوں سے چھپ کر نہیں رہے، بلکہ ہر غزوہ میں کافروں اور مشرکوں

سے برسرپیکار رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن گوشت کے اس ٹکڑے کی طرح بے وقعت اور ذلیل ہو گئے جس کو قصاب اپنے ٹھیہہ یا کُندی پر رکھ کر کاٹتا اور قیمہ بناتا ہے، اس طرح جس جنگ میں بھی آپ شریک ہوئے فتح و کامرانی نے بڑھ کر آپ کے قدم چومے۔

اس موقع پر علمائے سیرت کے یہاں دو لفظ بکثرت استعمال ہوتے ہیں:

(۱) غزوہ (۲) سریہ۔

غزوہ: اس چھوٹے یا بڑے لشکر کو کہتے ہیں جس میں سرکار اقدس ﷺ بنفسِ نفیس شریک ہوئے ہوں، خواہ اس سفر میں جنگ کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو، بلکہ خواہ اس لشکر کے پیش نظر جنگ کے علاوہ کوئی اور مقصد رہا ہو۔

سریہ: وہ فوجی دستہ جس میں سرکار اقدس ﷺ نے خود شرکت نہ فرمائی ہو بلکہ اپنے کسی صحابی کو اس دستہ کا امیر مقرر کر کے روانہ کیا ہو اسے سریہ یا بعث کہا جاتا ہے، سریہ کے لیے بھی ضروری نہیں کہ دشمنوں سے بالفعل جنگ ہوئی ہو، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوئے ہوں۔

(خاتم النبیین للشیخ ابی زہرہ، ج ۲، ص ۵۷۷، دار الفکر العربی، قاہرہ)۔

غزوات کی تعداد کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، ابن اسحاق، امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے غزوات کی تعداد انیس بتائی، جب کہ ابن سعد نے الطبقات الکبریٰ میں اپنے استاد محمد بن عمر واقدی کی موافقت کرتے ہوئے غزوات کی تعداد ستائیس بتائی۔

(سیرت ابن کثیر ج ۲، ص ۳۵۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۹۷۸ء)۔

ان غزوات میں سے جن میں کفار سے جنگ ہوئی وہ مندرجہ ذیل نو (۹) غزوات ہیں: (۱) بدر (۲) احد (۳) خندق (۴) بنی قریظہ (۵) بنو مصطلق (۶) خیبر (۷) فتح مکہ (۸) حنین (۹) طائف۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: آٹھ غزوات میں کفار سے جنگ ہوئی شاید انہوں

نے فتح مکہ کو غزوہ شمار نہیں کیا، اس خیال سے کہ یہ جنگ نہیں بلکہ صلح سے فتح ہوا۔
غزوات کی تعداد میں یہ فرق حقیقی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض غزوات کے مقامات ایک دوسرے سے بالکل قریب تھے اور بعض غزوات ایک ہی سفر میں پیش آئے، اس لیے بعض حضرات نے قریب الوقوع غزوات کو ایک غزوہ شمار کیا، اسی طرح ایک ہی سفر میں پیش آنے والے غزوات کو بعض علما نے ایک ہی غزوہ شمار کیا اور دیگر حضرات نے ان سب کو الگ الگ شمار کیا، اسی لیے تعداد میں کمی بیشی ہوگئی۔

بہر حال جن جنگوں میں بھی سرکارِ اقدس ﷺ نے شرکت فرمائی، کافر پسپا ہوئے اور مسلمانوں کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔

(۱۲۱) وَدُّوا الْفِرَارَ فَكَادُوا يَغْبِطُوْنَ بِهٖ
اَشْلَاءَ شَالَتْ مَعَ الْعِقْبَانِ وَالرَّخَمِ

ترجمہ: کفار شمشیر و سنان کی زد سے اس قدر بے تاب تھے) کہ میدان سے بھاگ جانا بہتر سمجھتے تھے اور ان پر رشک کرتے تھے جن کی بوٹیاں عُقاب اور گدھ لے اڑے۔

لغات: وَدُّوا: پسند کیا، چاہا. يَغْبِطُوْنَ (ض): رشک کرتے تھے، مضارع معروف از غبطۃ بمعنی رشک کرنا. اَشْلَاءَ: اعضا، گوشت کے ٹکڑے، بوٹیاں، واحد شِلْوٌ. شَالَتْ (ن): اوپر بلند ہوئے، اڑ گئے. اَلْعِقْبَانُ: عقاب کی جمع، ایک شکاری پرندہ جس کی نگاہ انتہائی تیز اور پنجے بہت مضبوط ہوتے ہیں، تیز نگاہی میں اس کی مثال دی جاتی ہے، کہتے ہیں: فُلَانٌ اَبْصَرُ مِنْ عُقَابٍ فلاں عقاب سے زیادہ تیز نگاہ ہے. اَلرَّخَمُ: گدھ، واحد رَخَمَةٌ (ج) رُخَمٌ۔

تشریح: اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام اگرچہ عرب کے بہادر، جاں باز، جنگ کو کھیل سمجھنے والے اور موت سے نہ ڈرنے والے لوگ تھے، جنگ میں پیٹھ دکھانا یا معرکۂ کارزار سے راہِ فرار اختیار کرنا ان کے معاشرہ میں بڑے عیب کی بات تھی، مگر اس کے باوجود پیغمبر اسلام اور صحابۂ کرام کا رعب ان پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ وہ اپنی ساری سماجی

قدریں بھول گئے تھے، انہیں اس کی بھی پروانہ رہی تھی کہ میدان سے بھاگنا سخت ننگ و عار اور ذلت ورسوائی کا باعث ہے، وہ اپنے دلوں میں میدان سے راہِ فرار اختیار کرنے کی آرزو کیا کرتے تھے، مگر بھاگنا ممکن نہ تھا، اس لیے تھک ہار کر وہ وبالِ جنگ سے نجات پانے کی غرض سے مقتولوں کے تکہ بوٹیوں پر رشک کرتے کہ کاش! ہم بھی کہیں جلد مارے جائیں اور ہمارے اعضا کا بھی وہی حال ہو جائے جو ان مقتولین کے اعضا کا ہوا کہ بعض کو تو پرندے کھا گئے اور بعض کو گدھ اور عُقاب اڑا لے گئے، تا کہ اس عذابِ جنگ سے رہائی مل جائے، کیوں کہ سخت پریشانی کے وقت جب کہ اس سے نجات کی صورت نظر نہیں آتی انسان موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔

(۱۲۲)
تَمْضِي اللَّيَالِي وَلَا يَدْرُوْنَ عِدَّتَهَا
مَالَمْ تَكُنْ مِنْ لَيَالِي الْاَشْهُرِ الْحُرُم

ترجمہ: راتیں گزرتی رہتیں، مگر کفار کو ان کی گنتی کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا، جب تک کہ حرمت والے مہینوں کی راتیں نہ آجاتیں۔

تشریح: گزشتہ شعر کی طرح اس شعر میں بھی دشمنانِ اسلام کے حد درجہ خوف ودہشت کو بیان کرنا مقصود ہے، اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ آئے دن جنگ کی مصیبت سے اعدائے دین ایسے دہشت زدہ اور حواس باختہ ہو گئے تھے کہ انہیں یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ کون سی رات ہے اور کل کون سا دن ہے، پورے سال ان کی یہ دہشت قائم رہتی، ہاں! جب حرمت والے مہینے (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) آتے تو ان کے ہوش ٹھکانے لگتے اور اطمینان ہو جاتا کہ اب جنگ نہ ہوگی، کیوں کہ ان مہینوں میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو جنگ وجدال سے منع فرما دیا تھا، مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

(۱۲۳)
كَاَنَّمَا الدِّيْنُ ضَيْفٌ حَلَّ سَاحَتَهُمْ
بِكُلِّ قَرْمٍ اِلَى لَحْمِ الْعِدٰى قَرِمِ

ترجمہ: گویا مذہب اسلام ایک مہمان ہے جو ایسے بہادروں اور سرداروں کو لے کر کفاروں کے صحن میں فروکش ہوا ہے جو دشمنوں کے گوشت کے بڑے شوقین ہیں۔

لغات: ضَیفٌ: مہمان (ج) ضُیُوفٌ وَاَضیافٌ. حَلَّ (ن): اترا، فروکش ہوا. سَاحَۃٌ گھر کا صحن، آنگن، گھروں کے درمیان کی خالی جگہ (ج) ساحٌ وَسُوحٌ وَ سَاحَاتٌ. قَرْمٌ: قوم کا سردار (ج) قُرُومٌ. قَرِمٌ گوشت کا شوقین۔

تشریح: گزشتہ اشعار میں کافروں کی دہشت اور ان کے قتل وخوں ریزی کا ذکر تھا، اس شعر میں اس خوں ریزی کی کثرت کی وجہ بیان کی گئی ہے، اس کو بیان کرنے کے لیے شاعر نے سادہ طرز بیان اپنانے کی بجائے تشبیہ کا طریقہ اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں: گویا مذہب اسلام مہمان کے درجہ میں تھا جو اپنے ان سرداروں۔ کے ساتھ کافروں کے صحن میں اترا تھا جن میں سے ہر ایک دشمنوں کے خون کا پیاسا تھا اور طریقہ یہی ہے کہ میزبان کو اگر مہمان کی پسند معلوم ہوتی ہے تو وہ اپنے مہمان کی ضیافت اسی چیز سے کرتا ہے جو اسے پسند ہو اور جس کا وہ شوقین ہو، لہٰذا سرداران اسلام کی مہمانی دشمنوں کے خون سے کی گئی۔

اس شعر میں ''قرم'' (سردار) سے مراد صحابہ کرام ہیں اور ''سَاحَتَھُمْ'' کی ضمیر یا تو کفار کی جانب لوٹتی ہے جیسا کہ میں نے ترجمہ میں اسی صورت کو اختیار کیا ہے یا صحابہ کرام کی طرف لوٹ رہی ہے، جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں دین کی مہمان سے تشبیہ، تشبیہ مرسل مجمل ہے (۲) اور قرم وقرِم کے درمیان تجنیس محرّف ہے۔

(۱۲۴)

يَجُرُّ بَحْرَ خَمِيْسٍ فَوْقَ سَابِحَةٍ
يَرْمِيْ بِمَوْجٍ مِنَ الْاَبْطَالِ مُلْتَطِمِ

ترجمہ: یہ مہمان اپنے ہمراہ تیز رفتار گھوڑوں پر بہادر جیالوں کی فوج کا ایسا دریا کھینچ کر لاتا ہے جو بہادروں کی کثرت سے موج زن ہے۔

لغات: یَجُر (ن) کھینچتا ہے۔ خَمِیس: لشکر جرار جس میں پانچ اہم دستے ہوں، (۱) مقدمۃ الجیش (ہراول دستہ)، (۲) قلب، (۳) میمنہ، (۴) میسرہ، (۵) ساق۔ سَابِحَۃ: برق رفتار گھوڑا، اصل معنی: تیرنے والا (ج) سَابِحَات وَسَوَابِحُ۔ یَرْمِي بِمَوْج: موج زن ہے، موج مار رہا ہے۔ اَلْاَبْطَال: بَطَلٌ کی جمع، بہادر، جیالے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کو پسپا کرنے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے مذہب اسلام بہادر سواروں کا ایسا لشکر جرار لایا جو ہیبت وسطوت اور کثرت میں تلاطم خیز دریا کے مشابہ تھا، جس کے سپاہی نہایت سبک رو اور برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر کافروں کے مقابلہ میں آئے۔

محاسن بلاغت: (۱) خمیس کی بحر سے تشبیہ، تشبیہِ بلیغ ہے (۲) یہاں لفظ "یَجُرُّ" میں استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے، کیوں کہ یہاں وہ "یَسْتَتْبِعُ" (پیچھے لاتا ہے) کے معنی میں ہے اور "یَرْمِي" کا ذکر تجرید ہے (۳) لفظِ "سَابِحَة" میں بھی استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے (۴) لفظِ "موج" میں استعارۂ مصرحہ اصلیہ ہے، کہ یہاں "موج" سے مراد کافروں کے ساتھ ہونے والی شمشیر زنی اور نیزہ بازی ہے (۵) اس شعر میں بحر، سابحۃ، موج اور ملتطم کے تذکرہ میں صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے۔

(۱۲۵)

مِنْ كُلِّ مُنْتَدِبٍ لِلّٰهِ مُحْتَسِبٍ
يَسْطُو بِمُسْتَأْصِلٍ لِلْكُفْرِ مُصْطَلِمِ

ترجمہ: ان میں سے ہر ایک حکم الٰہی کا تابع، اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا طالب ہے اور اس کی شمشیر بُرّاں سے حملہ آور ہوتا ہے جو کفر کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے والی ہے۔

لغات: مُنْتَدِبٌ: تابع فرمان۔ مُحْتَسِب: اللہ تعالیٰ سے ثواب کا امیدوار، اسم فاعل از احتساب بمعنی ثواب کی امید رکھنا۔ یَسْطُو (ن): فعل مضارع از سطوت بمعنی حملہ کرنا۔ مُسْتَأْصِلٌ: جڑ سے اکھاڑنے والا، اسم فاعل از استیصال۔ مُصْطَلِمٌ: اسم فاعل از اصطلام

بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے والا۔

تشریح: اس شعر کا تعلق معنوی اعتبار سے گزشتہ شعر سے ہے اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ان بہادرانِ اسلام کے لشکر جرار کا ہر ہر سپاہی حکم الٰہی کا تابع فرمان تھا، کسی دنیادار امیر یا بادشاہ یا صاحب اقتدار کے حکم پر وہ میدان کارزار میں نہیں اترتا تھا اور وہ اپنے اس عمل پر صرف اور صرف اللہ ہی سے اجر و ثواب کی امید رکھتا تھا، کسی اور کی خوشنودی اور انعام اس کا مطمحِ نظر نہ تھا اور اسی اخلاص کی برکت تھی کہ اس کی تلوار کفر کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا کام انجام دیتی تھی۔

(۱۲۶)
حَتّٰی غَدَتْ مِلَّةُ الْإِسْلَامِ وَهِيَ بِهِمْ
مِنْ بَعْدِ غُرْبَتِهَا مَوْصُولَةَ الرَّحِمِ

ترجمہ: یہاں تک کہ ملت اسلامیہ بے گانہ اور اجنبی ہونے کے بعد ان دلاوروں سے تعلق کے باعث رشتہ و قرابت والی ہوگئی۔

(۱۲۷)
مَكْفُولَةً اَبَدًا مِنْهُمْ بِخَيْرِ اَبٍ
وَخَيْرِ بَعْلٍ فَلَمْ تَيْتَمْ وَلَمْ تَئِمِ

ترجمہ: یہ ملت حقہ اب یتیم و بیوہ کی طرح نہ رہی (بلکہ سرکار اور ان کے نائبین کی بدولت گویا) ایک بہترین باپ اور بہترین خاوند کی کفالت میں آچکی ہے۔

لغات: غَدَتْ: ہوگئی، یہ فعل ناقص ہے بمعنی صارت. "مِلَّةُ الْإِسْلَامِ" اس کا اسم ہے اور "مَوْصُولَةَ الرَّحِمِ" اس کی خبر اول اور "مَكْفُولَةً" خبر ثانی. "وَهِيَ بِهِمْ" جملہ حالیہ ہے. "مِنْ بَعْدِ" "غَدَتْ" سے متعلق ہے. مِلَّةٌ: دین، مذہب، شریعت (ج) مِلَلٌ. غُرْبَةٌ: اجنبیت، بے گانگی، مسافرت. الرَّحِمُ: رشتہ، قرابت (ج) ارحام. مَوْصُولَةَ الرَّحِمِ: رشتہ والی، جس کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کیا جائے. مَكْفُولَةٌ: جس کی کفالت اور حفاظت کی جائے، محفوظ. اسم مفعول از كَفَلَ الرَّجُلَ وَبِهٖ كَفَالَةً (ن) بمعنی ضامن ہونا کفیل و ذمہ دار ہونا. بَعْلٌ: شوہر (ج) بِعَالٌ وبُعُولَةٌ وبُعُولٌ. لَمْ تَيْتَمْ (ض): یتیم نہ رہی. لَمْ

تَئِم: مضارع مجزوم از اَمَتِ الْمَرْاَۃُ اَیماً وَ اُیُوماً وَ اَیمَۃً (ض) بمعنی عورت کا بیوہ ہو جانا۔

تشریح: ان دونوں اشعار کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدین اسلام سرکارِ اقدس ﷺ کی ماتحتی میں کفار و مشرکین سے نبرد آزما ہوتے رہے اور اسلام کی دعوت عام کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کی مخلصانہ کوششیں رنگ لائیں اور وہ ملت اسلامیہ جو عربی سوسائٹی اور جاہلی معاشرہ میں اجنبی اور پردیسی کی طرح بے یار و مددگار تھی اور جس کا کوئی رشتہ دار اور متعلق نہ تھا بڑی تعداد میں اس کے رشتہ دار اور متعلقین پیدا ہو گئے، اس کی اجنبیت جاتی رہی اور عربی سوسائٹی اس سے مانوس ہو گئی اور سرکارِ اقدس ﷺ کی برکتوں سے وہ ہمیشہ کے لیے مشرکوں اور کافروں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو گئی، اس طرح باپ کی جانب سے نہ اسے داغِ یتیمی ملا اور نہ شوہر کی جانب سے بیوگی سے دوچار ہوئی، کیوں کہ سرکارِ اقدس ﷺ حفاظت کرنے کی حیثیت سے ملت اسلامیہ کے باپ اور ضروریات کی کفالت کرنے کی حیثیت سے اس کے شوہر کے درجہ میں ہیں، اس شعر میں درج ذیل حدیث کی جانب اشارہ ہے:

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيباً وَ سَيَعُودُ غَرِيباً فَطُوبىٰ لِلْغُرَبَاءِ.

(رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ ﷺ مشکوۃ المصابیح ج ۱ ص ۲۹، مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ مبارک پور)۔

(اسلام کا آغاز اجنبیت کے ماحول میں ہوا اور عنقریب وہ ایسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتدا میں تھا، تو اس ماحول میں اسے اپنانے والوں کے لیے خوش خبری ہے)۔

محاسن بلاغت: (۱) ''ملة الاسلام'' میں استعارۂ مکنیہ ہے (۲) غربة اور موصولة الرحم کے درمیان صنعتِ طباق ہے (۳) ''خير أب'' سے استعارۂ مصرحہ کے طور پر حضور اقدس ﷺ پھر آپ کے صحابہ اور آپ کی امت کے علما مراد ہیں (۴) دوسرے شعر میں لف و نشر مرتب ہے اس لیے کہ ''لَمْ تَيْتَمْ'' (یتیم نہ ہوئی) کا تعلق ''خير أب'' (بہترین باپ) سے ہے اور ''لَمْ تَئِمْ'' (بیوہ نہ ہوئی) کا تعلق ''خَيرَ بَعْل'' بہترین شوہر سے ہے۔

هُمُ الْجِبَالُ فَسَلْ عَنْهُمْ مُصَادِمَهُمْ
مَاذَا رَأَى مِنْهُمْ فِيْ كُلِّ مُصْطَدَمِ (۱۲۸)

ترجمہ: یہ جیالے جاں نثار صبر و استقامت کے پہاڑ تھے، تو ان کے بارے میں ان سے ٹکرانے والے سے پوچھ لو کہ اس نے ہر میدان کارزار میں ان کی جانب سے کیا کیا (بہادری کے جوہر) دیکھے۔

لغات: مُصَادِمْ: ٹکرانے والا، مقابلہ کرنے والا۔ مُصْطَدَمْ: میدان جنگ، معرکۂ کارزار، یہ اصطدام سے اسم ظرف برائے مکان ہے۔

تشریح: اس شعر میں ضمیر ''هُمْ'' کا مرجع ''اَبطَال'' (جیالے بہادر) ہیں، ان سے مراد حضور اقدس ﷺ کے جاں نثار صحابۂ کرام ہیں اور اس شعر کا گزشتہ اشعار سے تعلق یوں ہے کہ پہلے اشعار میں سرکار علیہ الصلوٰۃ کی شجاعت، بہادری، جواں مردی، میدان جنگ میں استقامت اور ثابت قدمی بیان کی تو اس کے بعد مناسب یہ ہوا کہ سرکار کے جاں نثار صحابۂ کرام کی بہادری اور جواں مردی کا بھی تذکرہ ہو جائے، اس لیے اس شعر میں صحابہ کی شجاعت، پامردی اور ثابت قدمی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: کہ یہ بہادران اسلام صبر و استقامت میں پہاڑوں کی طرح تھے کہ جب میدان جنگ میں دشمنوں کے مقابلہ میں ڈٹ جاتے تو ہلنے کا نام نہ لیتے، ایسا لگتا جیسے پہاڑ ہوں جو ایک ہی جگہ پر جمے ہوئے ہیں اور اگر تمہیں اس میں کوئی شک وشبہہ ہو تو ان سے ٹکرانے والے کفار ومشرکین اور دشمنان اسلام سے معلوم کر لو کہ انہوں نے ہر معرکۂ کارزار میں اسلام کے ان جیالے فرزندوں اور سرکار کے جاں نثاروں سے شجاعت و پامردی کے کیا کیا جوہر دیکھے ہیں۔

محاسنِ بلاغت: (۱) ''هُمُ الْجِبَالُ'' میں تشبیہِ بلیغ ہے (۲) مُصَادِمْ اور مُصْطَدَمْ میں تجنیس اشتقاق ہے (۳) مذکورہ بالا متجانسین میں سے ہر ایک کا مصرعِ اول کے آخر میں اور دوسرے کا مصرعِ اخیر میں آنا صنعتِ ردالعجز علی الصدر ہے۔

(۱۲۹)

وَسَلْ حُنَيْناً وَّ سَلْ بَدْراً وَّسَلْ اُحُداً
فُصُوْلُ حَتْفٍ لَّهُمْ اَدْهٰى مِنَ الْوَخَمِ

ترجمہ: حُنین سے پوچھ لو، بدر سے معلوم کرلو، اُحُد سے دریافت کرلو، یہ سب کافروں کی موت کے موسم ہیں جوان کے لیے وبا سے زیادہ سخت ہیں۔

لغات: حُنَيْنٌ: مکہ مکرمہ سے شمال مشرق کی جانب چودہ پندرہ میل کی مسافت پر ایک وادی کا نام ہے، بعض جغرافیہ دانوں نے لکھا ہے کہ ایک چشمہ کا نام حنین تھا، جس کی وجہ سے یہ ساری وادی حنین کہلائی. بَدْرٌ: علامہ یعقوب حموی لکھتے ہیں: یہ ایک کنویں کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان وادی اصفر کے نشیب میں ساحل سمندر سے ایک رات کی مسافت پر واقع ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بدر بن یَخْلُد بن نَضر کی طرف اس کی نسبت ہے (معجم البلدان ج۲) ـــــــ بعد کے ایک مورخ لکھتے ہیں: بدر، مدینہ منورہ سے تقریباً اسّی میل مغرب مائل بجنوب اس شاہراہ پر واقع ہے جو زمانۂ قدیم سے شام اور مکہ مکرمہ کے درمیان تجارتی قافلوں کی جولان گاہ رہی ہے، مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جانے کے اور بھی راستے ہیں جن میں سے بعض کا فاصلہ نسبتاً کم ہے، لیکن لوگ بدر ہو کر ہی آتے جاتے ہیں، بحیرۂ احمر کے ساحل سے اس مقام کا فاصلہ دس بارہ میل سے زیادہ نہ ہوگا، یہ بیضوی شکل کے ایک میدان میں واقع ہے، جسے پہاڑوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اس میدان کا طول ساڑھے پانچ میل اور عرض چار میل کے قریب ہے (ضیاء النبی، ج۳، ص۳۱۳-۳۱۴، مطبوعہ المجمع المصباحی، مبارک پور). اُحُدٌ: مدینہ منورہ سے قریباً تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے، یہ پہاڑ شرقاً و غرباً بخط مستقیم پھیلا ہوا ہے، اس کی جنوبی جانب وسط میں نعل نما خلا ہے، جو کافی وسیع ہے. (ایضاً ص۴۷۲). فُصُوْلٌ: فصل کی جمع، موسم، زمانے. حَتْفٌ: موت، ہلاکت (ج) حُتُوف. اَدْهٰى: زیادہ سخت، زیادہ ہلاکت آفریں. اَلْوَخَمُ: وبا۔

تشریح: اس شعر کے پہلے مصرعہ میں مضاف محذوف ہے، یعنی غزوۂ حنین، غزوۂ بدر اور

غزوۂ احد کے زمانوں سے یا اس میں شریک ہونے والوں سے پوچھ لو اور "فصول" میں

اعرابِ نحوی کے اعتبار سے دو صورتیں ہیں (۱) یہ "حُنَیناً" اور اسکے دونوں معطوفات سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہو (۲) مبتدائے محذوف "ھِیَ" کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔

اس شعر کا معنوی تعلق گزشتہ شعر سے ہے اور دونوں کا مفہوم یہ ہے کہ صحابۂ کرام صبر واستقلال اور استقامت و پامردی میں پہاڑوں کی مانند تھے اور اگر تمہیں ان کی شجاعت اور جواں مردی میں کچھ بھی شک وشبہہ ہو تو ان لوگوں سے مقابلہ کرنے والوں اور ٹکرانے والوں سے پوچھ کر تحقیق حال کرلو کہ صحابۂ کرام نے ہر معرکۂ کارزار میں کیا کیا بہادری کے جوہر دکھائے ہیں، جنگ حنین، جنگ بدر اور جنگ اُحُد میں شرکت کرنے والوں سے معلوم کرلو، یہ ان کافروں کی موت کے زمانے ہیں جو ان کے لیے وبائے عام سے بھی بڑھ کر ہلاکت خیز اور سخت تھے، کیوں کہ وبا پھیلنے کے وقت گوکہ کثرت سے جانیں جاتی ہیں مگر یہ جانی نقصان اتنا نہیں ہوتا جتنا ان جنگوں کے زمانے میں کفار ومشرکین کو اٹھانا پڑا تھا، اس طرح یہ جنگیں کفار کے لیے وبائے عام سے بھی بڑھ کر ہلاکت خیز اور نقصان دہ ثابت ہوئی تھیں، جیسا کہ ان غزوات کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

غزوۂ حنین ماہ شوال ۸ھ میں ہوا تھا، اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب خانۂ کعبہ پر اسلامی پرچم لہرادیا گیا تو لوگ فوج درفوج کفر وشرک کی تاریکی سے نکل کر ایمان واسلام کی روشنی میں آنے لگے، مگر وہیں قریب ہی میں دو قبیلے ثقیف اور ہوازن رہتے تھے، ان پر اس فتح کا الٹا اثر ہوا، وہ کسی کے ماتحت رہنا پسند نہیں کرتے تھے، ان لوگوں نے سوچا کہ فتح مکہ کے بعد اب ہماری باری ہے، اس لیے کیوں نہ ہم پہلے ہی مسلمانوں پر حملہ کردیں، جب سرورِ کائنات ﷺ کو ان کی جنگی تیاریوں کی اطلاع ہوئی تو آپ نے شوال ۸ھ میں بارہ ہزار افراد پر مشتمل اسلامی فوج لے کر حُنَین کا رخ کیا، اس افرادی قوت، جاہ وجلال اور شان وشوکت کو دیکھ کچھ مسلمان بے اختیار یہ کہہ اٹھے کہ آج

بھلا کون ہمیں شکست دے سکتا ہے؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو یہ بات پسند نہ آئی، اس لیے اس فخر کا انجام یہ ہوا کہ ثقیف اور ہوازن کے تیراندازوں نے جو تیراندازی کے فن میں سارے عرب میں مشہور تھے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر مسلمانوں پر اس طرح تیر برسانا شروع کیا کہ ان کے قدم اکھڑ گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، لیکن رسول کریم ﷺ اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ برابر کفار کی طرف بڑھتے رہے، اسی حالت میں سرکار کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب نے (جن کی آواز قدرتی طور پر بہت بلند تھی) سرکار کے حکم پر تمام مہاجرین وانصار صحابہ کو "اے اصحاب سَمُرہ" کہہ کر پکارا (چوں کہ بیعت رضوان سمرہ (ببول کے پیڑ) کے نیچے ہوئی تھی اس لیے بیعتِ رضوان کے شرکا "اصحاب سمرہ" کہلائے) حضرت عباس کی آواز سن کر سارے صحابہ یک بارگی پلٹ پڑے اور ایسا زبردست حملہ کیا کہ تھوڑی ہی دیر میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، کافروں کے پیرا کھڑ گئے، اس غزوہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتوں کی جماعت بھیجی، سرکار اقدس ﷺ نے مٹھی بھر خاک اور کنکریاں لے کر کافروں کے لشکر پر پھینکیں اور فرمایا: شَاهَتِ الْوُجُوهُ (یہ چہرے بگڑ جائیں) کافروں کے اوپر خاک کے پڑتے ہی میدان سے ان کے قدم اکھڑنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سر پر پیر رکھ کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو مارنا، قتل کرنا اور موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا، اس جنگ میں چار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا اور جنگ کے دوران ستر مشرکوں کو موت کے گھاٹ اتارا، لیکن جب وہ شکست کھا کر میدان جنگ سے بھاگے تو تین سو سے زائد کافروں کو مسلمانوں نے تعاقب کر کے قتل کیا، مسلمانوں کو اس جنگ میں جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

جنگی قیدی: چھ ہزار - اونٹ: چوبیس ہزار

بکریاں: چالیس ہزار - چاندی: چار ہزار اوقیہ

غزوۂ بدر ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ میں ہوا، مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور دو گھوڑے، چھ زرہیں، ستر اونٹ اور آٹھ تلواریں ساتھ تھیں، کفار کی تعداد نو سو پچاس تھی اور ان کے ساتھ سو گھوڑے، سات سو اونٹ اور بہت سے ہتھیار اور زرہیں تھیں، ۱۷ رمضان جمعہ کے دن صبح کے وقت دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں، عرب کے قاعدے کے مطابق پہلے فرداً فرداً جنگ ہوئی، سب سے پہلے قریش کا مشہور سردار عُتبہ بن رَبیعہ اپنے بھائی شَیبہ اور بیٹے ولید کو لے کر مقابلے میں آیا، اسلامی فوج سے تین انصار حضرت عوف، حضرت معاذ، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم مقابلے کے لیے نکلے، عُتبہ نے چلا کر کہا:

''محمد! ہم ان کسانوں سے کیا لڑیں، یہ ہمارے جوڑ کے نہیں، قریشی نوجوانوں کو ہمارے مقابلے میں بھیجئے''۔

تب نبی اکرم ﷺ نے حضرت حمزہ، حضرت علی، حضرت عُبَیدَہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حکم دیا، جب یہ حضرات میدان جنگ میں پہنچے تو عتبہ نے کہا کہ ہاں! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے ہیں، جنگ شروع ہوئی، حضرت حمزہ نے عتبہ کو، حضرت علی نے ولید کو قتل کر دیا، مگر حضرت عُبَیدَہ کو شیبہ نے کاری زخم لگا دیا، وہ زخموں کی تاب نہ لا کر زمین پر بیٹھ گئے، یہ منظر دیکھ کر حضرت علی جلدی سے ادھر لپکے اور شیبہ کو ایک ہی وار میں زمین پر ڈھیر کر دیا، اس کے بعد عام جنگ شروع ہو گئی اور دونوں فوجیں آپس میں ایک دوسرے سے گتھ گئیں، بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی اور آخر کار مسلمانوں کو فتح مبین ملی، اس جنگ میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، جیسے عتبہ، شیبہ، ابوجہل، اُمَیَّہ بن خَلَف۔ کل ستر کافر مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے اور کل چودہ مسلمان شہید ہوئے، ان میں سے چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے، مورخین اس معرکہ کو ''غزوۂ بدر کُبریٰ'' اور ''غزوۂ بدر عُظمیٰ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور خدائے ذوالجلال نے قرآن کریم میں اسے ''یوم الفُرقان'' کے لقب سے یاد فرمایا ہے، یعنی وہ دن جب حق و باطل کے درمیان فرق آشکارا ہو گیا، اندھوں اور بہروں

کو بھی پتہ چل گیا کہ حق کا علم بردار کون ہے اور باطل کا نقیب کون؟ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ (الانفال:۴۱)

(اور جسے اتارا ہم نے اپنے (محبوب) بندے پر فیصلہ کے دن، جس روز دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں)۔

غزوۂ احد شوال ۳ھ میں ہوا، کفارِ قریش کو بدر میں شکست کھانے اور اپنے بڑے بڑے سرداروں کے مارے جانے کا بڑا رنج تھا، ان کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، اس لیے انہوں نے ماہ شوال ۳ھ میں اپنے آزمودہ کار بہادر جوانوں کا ایک زبردست لشکر تیار کیا جو تین ہزار جنگ آزما سورماؤں پر مشتمل تھا، جس میں سات سو زرہ پوش، دو سو گھوڑ سوار، تین ہزار اونٹ، مدینہ طیبہ کی ایک چھوٹی سی بستی پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو رہے تھے، اگرچہ یہ تعداد مسلمانوں کے لشکر سے پانچ گنا زیادہ تھی، اگرچہ مسلمانوں کے پاس اسلحہ کی جو قلیل مقدار تھی اس کی حیثیت کفار کے بہترین اسلحہ کے بڑے ذخائر کے سامنے پرِ کاہ کی بھی نہ تھی، لیکن اس کے باوجود وہ میدانِ جنگ سے فرار کے ایک فی صد امکان کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے، انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو بھی ہمراہ لے جائیں گے، تاکہ انہیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگنے کا کوئی تصور ہی نہ کر سکے، چنانچہ ان کے بڑے بڑے سردار، عالی خاندانوں سے تعلق رکھنے والی اپنی بیویوں کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے اور مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو تھی، جن میں ایک سو زرہ پوش، باقی سب بے زرہ اور سب کے سب پیدل تھے، جبل احد کے دامن میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا، احد پہاڑ لشکرِ اسلام کی پشت پر تھا، اس میں ایک تنگ راستہ تھا، اس لیے اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں دشمن پیچھے سے آ کر نہ حملہ کر دیں، لہٰذا آپ نے حضرت عبداللہ بن جُبیر کی سرکردگی میں پچاس تیر اندازوں کو وہاں متعین کر دیا اور فرمایا کہ تم اس درّے کی خبر رکھنا، اگر ادھر سے کفار حملہ کی کوشش کریں تو تم تیرے برسا کر انہیں پسپا کر دینا اور کسی بھی حال میں اس جگہ سے نہ

ملنا، چاہے ہماری فتح ہو یا شکست، جب دونوں فوجیں میدان میں اتریں اور جنگ شروع ہوئی تو اسلامی مجاہدین نے خوب خوب داد شجاعت دی اور میدان کارزار کو کفار کے خون سے لالہ زار بنادیا، ادھر درّے کی جانب سے کفار نے حملہ کرنا چاہا مگر عبداللہ بن جُبیر کے ہمراہیوں نے اپنی تیراندازی سے ان کے حملے ناکام کردیے، آخر کافروں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی فوج میں کھلبلی مچ گئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا، کفار کی بدحواسی اور مسلمانوں کا فاتحانہ حملہ دیکھ کر وہ پچاس تیرانداز جو درّہ پر متعین تھے آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ چلو ہم بھی مال غنیمت لوٹنے میں شریک ہوجائیں، اب تو ہماری فتح ہوگئی ہے، ان کے افسر عبداللہ بن جبیر منع کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت یاد دلاتے رہے، لیکن ان لوگوں نے ان کی ایک نہ سنی اور مال غنیمت لوٹنے میں لگ گئے، موقع پاکر خالد بن ولید نے جو اس وقت مسلمان نہ ہوئے تھے اور کفار کے لشکر میں شامل تھے کفار کی ایک جماعت لے کر درّے کی جانب سے حملہ کردیا، پہلے تو درّے پر موجود لوگوں کو شہید کردیا اور پھر آگے بڑھ کر پیچھے کی جانب سے مسلمانوں پر اتنا شدید حملہ کیا کہ لشکر اسلام کے قدم اکھڑ گئے اور انہیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ کفار کے حملہ سے سرکار اقدس ﷺ کا چہرۂ انور خون آلود ہوگیا اور ایک پتھر لگنے سے آپ کا دندان مبارک شہید ہوگیا، اس جنگ میں مسلمانوں کا زبردست جانی نقصان ہوا، ۷۰ صحابہ کرام شہید ہوئے اور کافر صرف بائیس مارے گئے، مگر اس سب کے باوجود صحابہ کرام اور اسلامی لشکر کے بہادر جیالوں نے خوب خوب اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور کفار دشمنوں کے دلوں پر اپنی شجاعت اور جواں مردی کا سکہ بٹھادیا۔

(۱۳۰)

لَعَمْرِي لَيْضٌ حُمْرٌ أَعْدَ مَاوَرَدَتْ
مِنَ الْعِدَى كُلَّ مُسْوَدٍّ مِنَ اللِّمَمِ

ترجمہ وہ صحابہ کرام اپنی سفید تلواریں دشمنوں کے سیاہ بالوں پر آزما کر (ان کے خون

سے) سرخ بنا کر واپس لاتے۔

لغات: **اَلْمُصْدِرِي**: یہ اَلْمُصْدِرْ کی جمع ہے، بمعنی واپس لانے والے، یہ اَصْدَرَ الْاِبِلَ مِنَ الْمَاءِ سے اسم فاعل ہے، بمعنی اونٹ کو چشمہ سے واپس لوٹایا، یہ اصل میں "اَلْمُصْدِرِيْنَ" تھا، نون جمع اضافت کی وجہ سے گر گیا، یہ یا تو مدح کی بنا پر منصوب ہے اصل عبارت ہے اَمْدَحُ الْمُصْدِرِي الْبِيْضِ، یا شعر نمبر ۱۲۸ میں ضمیر منهم سے بدل ہونے کی بنا پر مجرور ہے. اَلْبِيْضُ: چمکتی ہوئی لوہے کی تلواریں، اس کا واحد اَبْيَضُ ہے. حُمْرًا: أَحْمَرُ کی جمع ہے، بمعنی سرخ، یہ بیض سے حال واقع ہے. مُسْوَدٌّ سیاہ، یہ اصل میں "شَعْرٌ مُسْوَدٌّ" (سیاہ بال) ہے. اَللِّمَمْ: لِمَّةٌ کی جمع، زلفیں، کانوں کی لَو سے نیچے لٹکنے والے بال، "مِنَ اللِّمَمْ" "مُسْوَدٌّ" کا بیان ہے۔

تشریح: اس شعر میں بھی صحابہ کرام کی بہادری، شمشیر زنی اور فن سپہ گری میں ان کی مہارت کو بیان کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام اس قدر بہادر اور حرب وضرب کے ماہر تھے کہ جب ان کی چمکتی ہوئی سفید تلواریں نوجوان دشمنوں کے سروں پر گرتیں تو وہ ان کے جسم میں اتر جاتیں اور ان کے خون سے سرخ ہو کر واپس ہوتیں، اس طرح ان کا کوئی بھی وار خالی نہ جاتا، بالوں کے سیاہ ہونے سے ان کافروں اور دشمنوں کے جوان ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) "اَلْمُصْدِرِي الْبِيْضِ" میں استعارہ بالکنایہ ہے، اس طرح کہ چمکتی تلواروں کو اونٹوں سے تشبیہ دی، پھر مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کے متعلقات و مناسبات میں سے "اَلْمُصْدِرِي" کو ذکر کیا (۲) "كُلَّ مُسْوَدٍّ مِنَ اللِّمَمْ" سے بطور کنایہ دشمنوں کا جوان ہونا مراد ہے (۳) اور اس میں "بیض" (سفید)، "حمر" (سرخ) اور "مسود" (سیاہ) کو یکجا کرنا صنعت تدبیج ہے (۴) المصدري اور وردت کے درمیان صنعت طباق ایجاب ہے۔

(۱۳۱)

وَ الْكَاتِبِيْنَ بِسُمْرِ الْخَطِّ مَا تَرَكَتْ
اَقْلَامُهُمْ حَرْفَ جِسْمٍ غَيْرَ مُنْعَجِمِ

ترجمہ: یہ بہادرانِ اسلام گندم گوں خطی نیزوں سے ایسی تحریر لکھتے کہ ان کے قلم (نیزے) دشمنوں کے جسم کے کسی حرف (عضو) کو بغیر نقطہ (زخم) نہ رہنے دیتے۔

لغات: **اَلْكَاتِبِيْن**: لکھنے والے، کاتب کی جمع، اس سے مراد نیزہ مارنے والے ہیں، اس کا عطف المصدری پر ہے. **سُمْر**: اَسْمَرُ کی جمع، گندمی رنگ کے، مراد نیزے، کیوں کہ ان کی لکڑی گندمی رنگ کی ہوتی تھی. **اَلْخَطّ**: بحرین کی بندرگاہ اور اس کی ساحلی بستیاں، جہاں ہندوستان سے نیزوں کی لکڑی جایا کرتی تھی اور نیزے تیار ہوکر فروخت ہوا کرتے تھے۔ (معجم البلدان ۲/۳۷۸، دار بیروت للطباعة والنشر، لبنان). **اَقْلَام** قلم کی جمع، یہاں مراد نیزے. **حَرْف**: کنارہ، حروف تہجی میں سے ایک. یہاں مراد عضو ہے (ج) حروف وأحرف. **مُعْجَم**: نقطہ دار. **غَيْرُ مُعْجَم**: غیر منقوط، نقطوں سے خالی، یہاں مراد زخموں سے خالی۔

تشریح: اس شعر میں بھی صحابۂ کرام کی شجاعت و بہادری اور نیزہ بازی میں مہارت کو استعارات وتشبیہات کی زبان میں بیان کیا گیا ہے، مفہوم یہ ہے کہ وہ نیزہ بازی میں اس قدر ماہر تھے کہ جب وہ ہاتھوں میں نیزہ لے کر میدانِ مقابلہ میں آجاتے تو ان کے سامنے آنے والے ہر دشمن کے جسم پر کہیں نہ کہیں زخم کا نشان ضرور ہوتا اور ان کا کوئی وار بھی خالی نہیں جاتا، اس وقت ان کی کیفیت اس کاتب کی سی ہوتی جس کے ہاتھ میں قلم ہو اور وہ ہر حرف پر نقطہ لگاتا جارہا ہو۔

محاسن بلاغت: (۱) ''الکاتبین'' میں استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے (۲) اور ''اقلام'' کا ذکر ترشیح ہے (۳) ''حرف'' میں صنعتِ ایہام ہے (۴) یوں ہی ''حَرفِ جِسْمٍ'' میں استعارۂ تصریحیہ اصلیہ ہے (۵) کاتبین، أقلام، حرف اور منعجم کے ذکر میں صنعت ایہام تناسب ہے۔

شَاكِي السِّلَاحِ لَهُمْ سِيمَا تُمَيِّزُهُمْ
وَالْوَرْدُ يَمْتَازُ بِالسِّيمَا مِنَ السَّلَمِ (۱۳۲)

ترجمہ وہ ہتھیار بند ہوتے، ان کا ایک خاص امتیازی نشان ہوتا اور گلاب تو اپنے نشان

ہی کے ذریعہ سلم سے ممتاز ہوتا ہے۔

لغات: شَاكِي السِّلاحِ: مسلح، ہتھیار بند، کیل کانٹوں سے لیس، یہ "المصدری" کی صفت یا حال ہے اور "المصدری" ہی کی طرح یہ بھی جمع کا صیغہ ہے جس سے نونِ جمع اضافت کی وجہ سے ساقط ہو گیا، "شاکی" اصل میں "شائک" تھا جو شَاکَ يَشَاكُ شَوْكاً (س) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، پھر اس میں قلبِ مکانی ہوا تو شَاكِوٌ ہو گیا، پھر اس میں "داع" کا قاعدہ جاری ہوا تو "شاکٍ" ہوا. سِيمَا. علامت، خاص نشان، قرآن کریم میں ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ (الفتح:۲۹) ان کی علامت ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے نشان سے. الْوَرْد: گلاب. السَّلَمْ: ایک قسم کا کانٹے دار درخت جس کے پتوں سے چمڑے کو دباغت دی جاتی ہے۔

تشریح: اس شعر کا تعلق بھی صحابۂ کرام سے ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحابۂ کرام ہتھیار بند ہوتے تھے اور دشمنانِ اسلام بھی ہتھیار بند ہوتے، تو اگر چہ دشمن بظاہر ان کے مشابہ ہوتے، لیکن ان کے اندر شجاعت و جواں مردی، دیانت و تقویٰ جیسے خاص اوصاف پائے جاتے تھے یا ان کے چہروں پر سجدہ کے نورانی آثار ہوتے تھے جو انہیں دشمنانِ اسلام سے ممتاز کر دیتے تھے، بالکل ایسے ہی جیسے "سَلَم" بظاہر پتہ دار اور کانٹے دار ہونے میں گلاب کے مشابہ ہوتا ہے، لیکن جو خوشبو، حسن و جمال اور خوب صورتی و شادابی گلاب میں ہے وہ سَلَم میں کہاں؟ اسی طرح جو اوصاف صحابۂ کرام میں ہوتے تھے وہ ان کافروں میں کہاں؟

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ تمثیل ہے، جیسا تشریح سے ظاہر ہو چکا۔

(۱۳۳)
تُهْدِي إِلَيْكَ رِيَاحُ النَّصْرِ نَشْرَهُمْ
فَتَحْسِبُ الزَّهْرَ فِي الْأَكْمَامِ كُلَّ كَمِيٍّ

ترجمہ: فتح و نصرت کی ہوائیں ان کی خوشبو کا یہ تحفہ تیرے پاس بھیجتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہتھیار بند مجاہد غلاف میں لپٹا ہوا پھول ہے۔

لغات: تُهْدِي: تحفہ بھیجتی ہیں، فعل مضارع از اِهْدَاءٌ. رِيَاحُ النَّصرِ: نسیم فتح مندی، فتح و نصرت کی ہوائیں. نَشْر: خوشبو، مراد خوش خبری. زَهْر: شگوفہ، کلی، ناشگفتہ پھول (ج) اَزْهَار وزُهُوْر وَاَزْهُر. اَلْاَكْمَام: کلی کے غلاف، واحد: الكِمُّ. كَمِي: (بتشدید یا، ضرورتِ شعری کی بناپر یا کو مخفف کردیا گیا) زرہ پوش، ہتھیار بند، بہادر، دلاور (ج) كُمَاة وَاَكْمَاء۔

تشریح: شاعر کا اصل مقصود یہ ہے کہ ان صحابہ کرام کی فتح ونصرت اور ظفر مندی کی خبریں دور دور تک پھیل جاتی تھیں، لیکن شاعر نے خوش آئند خبروں کو خوشبو سے تشبیہ دی ہے اور مجاہدین اسلام (صحابۂ کرام) کو اس ناشگفتہ کلی سے تشبیہ دی ہے کہ جو غلاف میں لپٹی ہوئی ہو، کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ مجاہدین جو خُود اور زرہ پہنے ہوئے ہوتے، ایسے لگتے جیسے ناشگفتہ کلی ہو جو اپنے غلاف میں لپٹی ہوئی ہے اور جس طرح غلاف میں ہونے کے باوجود ہوائیں کلیوں کی خوشبو ہر طرف پھیلاتی ہیں اور پورے ماحول کو معطر کرتی ہیں اسی طرح ان مجاہدین اسلام کی کامیابی اور فتح مندی کی خوشبو اہل ایمان کے مشام جاں کو معطر کر دیتی تھی۔

عربی داں حضرات کے لیے یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ اس شعر کے آخری مصرع کا عربی ترکیب کے لحاظ سے ترجمہ یہ ہے کہ "تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلاف میں لپٹا ہوا پھول ہر ہتھیار بند مجاہد ہے" اس طرح غلاف میں لپٹے ہوئے ناشگفتہ پھول کو ہتھیار بند مجاہد سے تشبیہ دی ہے، جب کہ ہتھیار بند مجاہد کو ناشگفتہ پھول سے تشبیہ دی جاتی ہے، نہ کہ ناشگفتہ پھول کو ہتھیار بند مجاہد سے، تشبیہ کے اس طریقے کو علماے بیان "تشبیہِ مقلوب" کہتے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اصولاً وجہِ شبہ، مشبہ کی بہ نسبت مشبہ بہ میں اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے، لہٰذا کسی چیز کو مشبہ بہ قرار دینے کا یہی مطلب ہے کہ اس میں وجہِ شبہ نسبتاً اعلیٰ واکمل ہے، اب دو چیزوں میں سے جو شے نسبتاً اعلیٰ نہیں اسے مشبہ بہ قرار دیا جائے تو یہ دکھانا مقصود ہے کہ متکلم کی نگاہ میں یہی اعلیٰ ہے جبھی تو اسے مشبہ بہ قرار دیا ہے، علم بیان کی اصطلاح میں اس طرزِ تعبیر اور پیرایۂ بیان کو "تشبیہِ مقلوب" کہا جاتا ہے، خیال رہے کہ ہر تشبیہِ مقلوب میں مبالغہ بھی ہوتا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) نشر بمعنی خوشبو سے خوش خبری مراد لینا بطور استعارۂ تصریحیہ ہے (۲) دوسرے مصرع میں تشبیہِ مقلوب ہے (۳) اور اس میں صنعتِ مبالغہ بھی ہے (۴) نَصر اور نَشر کے درمیان تجنیس شبہِ اشتقاق ہے۔

كَأَنَّهُمْ فِي ظُهُوْرِ الْخَيْلِ نَبْتُ رُبًا
مِنْ شِدَّةِ الْحَزْمِ لَا مِنْ شَدَّةِ الْحُزُمِ (۱۳۴)

ترجمہ: وہ گھوڑوں کی پشت پر ایسے جمے ہوتے ہیں جیسے بلند ٹیلوں کے پودے (جمے ہوتے ہیں) یہ ان کی احتیاط و مہارت کی وجہ سے ہے، بندھن مضبوط ہونے کی وجہ سے نہیں۔

لغات: ظُهُوْر: ظَهْرٌ کی جمع، پشت، پیٹھ. فِيْ: اس شعر میں علیٰ کے معنی میں ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ. اَلْخَيْل: گھوڑے، گھوڑوں کا گروہ، یہ اسم جمع ہے، اس کا کوئی واحد نہیں (ج) خُيُوْل وَاَخْيَالٌ. نَبْتٌ: پودا، سبزہ (ج) نُبُوْتٌ، واحد: نَبْتَةٌ. رُبًا: ٹیلے، یہ رُبْوَة کی جمع ہے، اس کے واحد میں "ر" پر تینوں حرکتیں پڑھی جاسکتی ہیں، شِدَّةٌ: سختی، مصدر از باب (ض، ن). اَلْحَزْم: دور اندیشی، احتیاط، مہارت. شَدَّةٌ: (ض، ن) مصدر، مضبوط کرنا، باندھنا، کسنا. اَلْحُزُمُ: حِزَام کی جمع، جانور کا تنگ، وہ رسی جس سے جانور کی پشت پر زین وغیرہ باندھی جاتی ہے۔

تشریح: اس شعر میں امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہدین اسلام کو ان پودوں سے تشبیہ دی ہے جو کسی بلند ٹیلے پر اُگے ہوئے ہوں اور جب وہ دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے آگے پیچھے، دائیں بائیں مڑتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہوا کے جھونکوں سے پودوں کی شاخیں دائیں بائیں ہوتی ہیں، مگر وہ اپنے اصل مقام سے نہیں ٹلتے، ان پودوں کی جڑیں بہت گہرائی میں پانی تک اتری ہوتی ہیں اور یہ عام پودوں سے زیادہ پائدار اور مضبوط ہوتے ہیں، شعر کا حاصل یہ ہے کہ صحابۂ کرام فن سواری میں ایسے طاق تھے کہ جب وہ گھوڑوں کی پشت پر ران جما کر بیٹھ جاتے تو ان کے آسن ٹیلوں کے پودوں کی طرح جے

رہتے، جن کی جڑیں دور تک زمین میں اتری ہوتی ہیں، ان کا اس طرح جم کر بیٹھنا اس وجہ سے نہ تھا کہ ان کے گھوڑوں کے تنگ کسے ہوتے تھے، کیوں کہ تنگ کا کسا ہوا ہونا ناتجربہ کار اناڑی اور ناواقف انسان کے لیے کچھ بھی مفید نہیں ہوتا، بلکہ فنِ شہ سواری میں کمال اور مہارت کی وجہ سے تھا۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ مرکب ہے، کیوں کہ شاعر نے گھوڑوں کی پشت کو ٹیلوں سے اور مجاہدین اسلام کو ٹیلوں پر اُگے ہوئے پودوں سے تشبیہ دی ہے (۲) اور ''شِدّة'' و ''شَدّة'' کے درمیان تجنیس محرف ہے، یوں ہی ''حَزم'' اور ''حُزُم'' کے درمیان بھی۔

(۱۳۵)

طَارَتْ قُلُوْبُ الْعِدیٰ مِنْ بَأْسِهِمْ فَرَقاً
فَمَا تُفَرِّقُ بَيْنَ الْبَهْمِ والْبُهَمِ

ترجمہ: ان کے رعب اور دہشت کی وجہ سے دشمنوں کے ہوش اس طرح اڑ گئے کہ وہ بھیڑ بکریوں کے بچوں اور بہادر جیالوں میں فرق نہیں کر پاتے تھے۔

لغات: **اَلْعِدیٰ**: عدو کی جمع، بمعنی دشمن. **بَأْس**: طاقت وقوت، بہادری وجواں مردی. **فَرَقاً**: خوف ودہشت کی وجہ سے، مصدر از باب سمع. **اَلْبَهْم**: بھیڑ بکری کے بچے، واحد **بَهْمَةٌ** وَ **بَهَمَةٌ**. **اَلْبُهَمُ**: **بُهْمَة** کی جمع، وہ دلیر انسان جس پر کوئی قابو نہ پا سکے۔

تشریح: صحابۂ کرام کی بہادری، جواں مردی اور سخت حملہ کی وجہ سے دشمنوں کے دلوں پر ان کے خوف ودہشت کا سکہ جم چکا تھا، ان کے مقابلہ کے خوف سے دشمنوں کا پِتّہ پانی ہو جاتا تھا اور وہ ایسے حواس باختہ ہو جاتے تھے کہ بھیڑ بکری کے بچوں اور بہادرانِ اسلام کے درمیان تمیز نہیں کر پاتے تھے، بلکہ بھیڑ بکری کے بچوں کو بہادرانِ اسلام سمجھ بیٹھتے تھے، کہ اگر ان کے سامنے سے بھیڑ یا بکری کا کوئی بچہ اچھلتا کودتا ہوا آتا تو وہ سہم جاتے اور سمجھتے کہ کوئی بہادر شہ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آ رہا ہے، فارسی زبان کی کہاوت بالکل صحیح ہے:

''مار گزیدہ از ریسماں می ترسد''یعنی (سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے ڈرتا ہے)، مگر خیال رہے کہ یہ سارا رعب ودبدبہ حضور اکرم ﷺ کی نصرت وحمایت اور تائید کی بدولت تھا، اسی مفہوم کو اگلے شعر میں بیان کیا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱)طَارَت بمعنی اضطَرَبَتْ میں استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے (۲)اور ''البُهَمُ ''اور'' البُهَمُ'' کے درمیان تجنیس محرف ہے (۳) اور فَرَق اور تُفَرِّقُ کے درمیان تجنیس شبہِ اشتقاق ہے۔

وَمَنْ تَكُنْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ نُصْرَتُهٗ
(۱۳۶)
اِنْ تَلْقَهُ الْاُسْدُ فِيْ اٰجَامِهَا تَجِمِ

ترجمہ: اور جسے رسول اللہ ﷺ کی نصرت وحمایت حاصل ہو تو اگر شیر بھی اپنے کچھاروں میں اس کے سامنے آجائیں، مارے خوف ودہشت کے دم بخود ہو جائیں۔

لغات: الْاُسْدُ: اَسَدٌ کی جمع، شیر. آجَام: اَجَم کی جمع اور اَجَم، اَجَمَۃ کی جمع، اس طرح آجام اَجَمَۃ کی جمع الجمع ہے، کچھار، جھاڑی، گنجان درخت، شیر کے رہنے کی جگہ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اُجُم بمعنی قلعہ کی جمع ہو، کما قال الشيخ ابراهيم الباجوري في شرحه.
تَجِمُ (ض): مضارع معروف از وَجَمَ يَجِمُ وَجْماً ، خوف ودہشت کی وجہ سے بول نہ پانا، دم بخود رہنا۔

تشریح: یہ شعر معنوی حیثیت سے گزشتہ شعر سے ہی مربوط ہے اور مطلب یہ ہے کہ دشمنان اسلام کے دلوں پر صحابۂ کرام کے خوف ودہشت کا ایسا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ وہ ان کے مقابلہ کے وقت حواس باختہ ہو جاتے تھے اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیوں کہ صحابۂ کرام کو رسول اکرم ﷺ کی نصرت وحمایت حاصل تھی اور جس کا سہارا، آسرا اور مدد کا سرچشمہ اللہ کے رسول ﷺ ہوں اگر جنگل کے شیر اپنے کچھاروں میں بھی اس کے سامنے آجائیں تو اس کے رعب سے دم بخود ہو جائیں اور مارے دہشت کے ان کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکے، شیروں کے ساتھ

جنگلوں اور کچھاروں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ شیر جنگل کا راجا ہوتا ہے، وہ جب تک جنگلوں میں رہتا ہے اس کی جرأت، ہمت اور بہادری نسبتاً بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس شعر میں رسول اللہ ﷺ کے غلام حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے مشہور واقعہ کی جانب اشارہ ہے کہ وہ سرزمین روم پر اسلامی لشکر سے بچھڑ گئے اور گرفتار کر لیے گئے، پھر وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلے اور اسلامی لشکر کی تلاش و جستجو میں تھے کہ اچانک ایک جنگل میں شیر سامنے آگیا، آپ نے شیر سے فرمایا:

یَا اَبَا الْحَارِثِ ! اَنَا مَوْلیٰ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم.

(اے ابوالحارث! (ابوالحارث شیر کی کنیت ہے) میں اللہ کے رسول ﷺ کا غلام ہوں)۔

مجھے اس طرح کا حادثہ پیش آگیا ہے، تو شیر حملہ کرنے کی بجائے آپ کے ساتھ ہی ساتھ آپ کے پہلو میں چلنے لگا اور آپ کی حفاظت و رہ نمائی کرنے لگا، جب آپ لشکر تک پہنچ گئے تو واپس آگیا۔ (رواہ محی السنة فی شرحه عن ابن المنکدر واخرجه صاحب مشکوٰۃ المصابیح فی باب الکرامات)۔ (الزبدۃ العمدۃ للملا علی قاری)۔

حضرت علامہ شیخ ابراہیم باجوری علیہ الرحمہ اس شعر کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی تائید و نصرت آپ کی سنت کی پیروی کرنے اور خلاف شرع باتوں سے بچنے سے حاصل ہوتی ہے، اور اسی کا دوسرا نام تقویٰ و پرہیز گاری ہے جس کی بنیاد خوف الٰہی پر ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو دنیا کی ساری چیزیں اس سے ڈرنے لگتی ہیں، یہاں تک کہ شیر اپنے کچھاروں میں رہتے ہوئے بھی اس سے خوف کھاتے اور ڈرتے ہیں اور جسے خشیتِ ربانی اور خوف خداوندی کا یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو اس کے خوف سے دشمنوں کے ہوش و حواس اڑ جاتے ہیں اور ان میں تابِ مقابلہ نہیں رہتی، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''الاسد'' سے مجازاً بہادر لوگ مراد ہوں اور ''آجام'' قلعہ کے معنی میں ہو۔

(شرح الباجوری، ص ٦٨، مکتبہ محمد توفیق الکتبی، مصر)

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں صنعتِ تلمیح بھی ہے (۲) آجام اور تَجم کے درمیان تجنیس شبہِ اشتقاق ہے۔

وَلَنْ ترىٰ مِنْ وَّلِيٍّ غَيْرَ مُنْتَصِرٍ
(۱۴۷)
بِهٖ ، وَلا مِنْ عَدُوٍّ غَيْرَ مُنْقَصِمِ

ترجمہ: تو حضور کے کسی دوست کو ایسا نہیں پائے گا کہ آپ کی مدد سے وہ فاتح ومنصور نہ ہو اور آپ کا کوئی دشمن ایسا نہ ملے گا جو شکست خوردہ اور مغلوب نہ ہو۔

لغات: وَلِيّ: دوست، چاہنے والا، محبت کرنے والا (ج) اَوْلِيَاء . مُنْتَصِرٌ: اسم فاعل از انتصار بمعنی استنصار، مدد مانگنے والا. مُنْقَصِمٌ: اسم فاعل از انقصام، شکست خوردہ۔

تشریح: اس شعر میں "ولی" (دوست) سے مراد وہ مومن ہے جو سنت وشریعت کا پابند ہو اور "عدو" (دشمن) سے مراد وہ ہے جو سنت وشریعت کا مخالف ہو، بدعمل اور بدعقیدہ ہو، یہ شعر معنوی اعتبار سے گزشتہ شعر کی تاکید وتائید ہے، مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام سرکارِ اقدس ﷺ کی نصرت وحمایت سے ہمیشہ شادکام اور کامیاب رہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ سرکار کا کوئی چاہنے والا کبھی بھی تمہیں ناکام ونامراد اور شکست خوردہ نظر نہیں آسکتا اور ان کا دشمن کبھی کامیاب وبامراد نہیں ہوسکتا۔

ولی کامل عارف باللہ حضرت شیخ احمد ملثم فرماتے ہیں:

لم تكن الأقطاب أقطاباً ولا الأوتاد أوتاداً و لا العماد عماداً إلا برسول الله و بتعظيمهم لهٗ و اجلالهم شريعتهٗ و كل من كان عدواً لشريعته كان عدواً لهٗ عليه السلام و كذا كلُّ من كان عدواً لصاحب الشرع من العلماء و كل من يتكلم بما يتأذىٰ به عليه الصلوٰة والسلام فهو عدوّہٗ.

(رسول اللہ ﷺ کے واسطے اور ان کی عزت وتکریم اور آپ کی شریعت کی تعظیم کے بغیر نہ کوئی قطب، قطب ہوسکتا ہے، نہ کوئی اوتاد، اوتاد بن سکتا ہے اور نہ کوئی عماد، عماد

ہوسکتا ہے، اور جو سرکار کی شریعت کا دشمن ہو وہ درحقیقت خود سرکار کا دشمن ہے، یوں ہی جو اہل شریعت علمائے حق کا دشمن ہو۔ اور جو شخص سرکار کی شان میں کوئی تکلیف دہ بات کہے وہ یقیناً دشمن رسول ہے)۔

اسی کے تعلق سے حضرت شیخ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر روح البیان میں فرماتے ہیں:

بعض اکابر سے منقول ہے کہ ہم (دین وشریعت سے) غافل ایک شخص کی مجلس میں تھے کہ بات کرتے کرتے اس نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ خواہش نفسانی سے کوئی شخص نجات نہیں پاسکا، اگرچہ وہ "فلاں" ہی کیوں نہ ہو، "فلاں" سے اس نے سرکارِ اقدس ﷺ کو مراد لے لیا اور کہنے لگا کہ حضور نے بھی فرمایا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں، ارشاد ہے: حُبِّبَ اِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ، الطِّيْبُ، وَالنِّسَاءُ، وَقُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ (مجھے تمہاری دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں، (۱) خوشبو (۲) عورتیں (۳) اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے)۔ تو میں نے کہا: (کم بخت) تجھے اللہ سے شرم نہیں آتی، سرکار نے تو یہ فرمایا ہے: حُبِّبَ اِلَيَّ الخ کہ تمہاری دنیا کی تین چیزیں میرے لیے محبوب اور پسندیدہ بنادی گئی ہیں، یہ نہیں فرمایا: اَحْبَبْتُ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثًا یعنی تمہاری دنیا کی تین چیزیں میں محبوب رکھتا ہوں، تو جو چیز کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت وکرامت کے طور پر حاصل ہوئی ہے اس پر اس بندہ کو ملامت کیسے کی جاسکتی ہے؟ پھر مجھے اس بات پر قلبی تکلیف اور دلی صدمہ ہوا کہ میں نے اس طرح کی بات کیوں سنی، پھر میں سوگیا تو خواب میں سرکار اقدس ﷺ کے جمالِ جہاں آرا کی زیارت سے شرف یاب ہوا، آپ نے فرمایا تو غم نہ کر، ہم اس کے لیے کافی ہیں، (وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ) پھر ہم نے سنا کہ وہ شخص اپنی زمین جائداد دیکھنے کے لیے جارہا تھا کہ راستے ہی میں اسے قتل کردیا گیا، اللہ تعالیٰ انبیا اور ان کے وارثین علما اور اولیا کی شان میں زبان درازی سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین! (عصیدۃ الشھدۃ، ص ۲۰۶)

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں صنعتِ مقابلہ ہے جیساکہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں (۲) اور اس میں صنعتِ مماثلت بھی ہے، صنعتِ مماثلت کا مطلب یہ ہے کہ ایک فقرے کے تمام یا اکثر الفاظ دوسرے فقرے کے الفاظ کے ہم وزن ہوں جو ان کے مقابل آئے ہیں، جیسے آیت کریمہ: وَ اٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ٥ وَ هَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ٥۔ (الصافات: ۱۱۷-۱۱۸)

اَحَلَّ اُمَّتَــهٗ فِيْ حِرْزِ مِلَّتِــهٖ
كَاللَّيْثِ حَلَّ مَعَ الْاَشْبَالِ فِيْ اَجَمِ (۱۳۸)

ترجمہ: آپ نے اپنی پوری امت کو اپنے دین کے محفوظ قلعہ میں اتار دیا، جس طرح شیر اپنے بچوں کے ساتھ جھاڑی میں محفوظ ہو۔

لغات: اَحَلَّ: اتار دیا، فعل ماضی معروف از اِحلال. حِرْزٌ: قلعہ، انتہائی محفوظ مقام، مضبوط جگہ (اَحراز). مِلَّةٌ مذہب، شریعت، دین (ج) مِلَلٌ. لَیْثٌ: شیر (ج) لُیُوث، مَلْیَثَة. حَلَّ: (ن،ض) اترا، فعل ماضی معروف از حُلُوْلٌ بمعنی اترنا. اَشْبَالٌ: شِبْلٌ کی جمع، شیر کے بچے. اَجَمٌ جھاڑی، گنجان درخت، کچھار، واحد اَجَمَةٌ، جمع آجَامٌ۔

تشریح: اس شعر میں گزشتہ شعر کے حکم کی علت بیان کی گئی ہے، اس میں امام بوصیری نے رسول اکرم ﷺ کو طاقت وقوت، شجاعت وبہادری، رعب ودبدبہ اور حفاظت کرنے میں شیر سے تشبیہ دی ہے، آپ کی امت کو شیر کے بچوں سے اور آپ کے دین اور شریعت کو شیر کے بھٹ یا جھاڑی سے تشبیہ دی ہے، شعر کا مفہوم یہ ہے کہ سرکار کی امت کے لیے آپ کا دین اور آپ کی شریعت ایسی محفوظ پناہ گاہ ہے جیسے شیر کے بچوں کے لیے شیروں کا بن اور جھاڑی اور جس طرح شیر کے بچوں کو شیروں کے بن اور جھاڑی میں رہ کر کوئی ڈر نہیں رہتا اسی طرح سرکار کی امت کو آپ کے دین پر قائم رہتے ہوئے آتشِ جہنم کا کوئی کھٹکا نہیں رہتا۔

اس شعر میں امام بوصیری نے سرکار کو شیر سے اور آپ کی امت کو شیر کے بچوں سے

تنبیہ دے کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح شیر اپنے بچوں کی زندگی کا سامان، ان کی نشو ونما کا ذریعہ اور ان کی اصل ہوتا ہے اسی طرح سرورِ کونین ﷺ اپنے امتیوں کی حقیقی زندگی کا سامان، ان کی روحانی نشو ونما کا ذریعہ اور ان کی اصل ہیں اور آپ کی ازواج مطہرات ان کی مائیں ہیں، ارشادِ ربانی ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ ط (الأحزاب:۳۳/۶)

(یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جانوں سے زیادہ مالک ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں)۔

حضرت صدر الافاضل علامہ نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ والرضوان اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت میں مِنْ اَنْفُسِهِمْ کے بعد وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی ہے (یعنی سرکار مسلمانوں کے باپ ہیں)، مجاہد نے کہا: کہ تمام انبیا اپنی امت کے باپ ہوتے ہیں اور اسی رشتہ سے مسلمان آپس میں بھائی کہلاتے ہیں کہ وہ اپنے نبی کی دینی اولاد ہیں'' (تفسیر خزائن العرفان بر ترجمہ کنز الایمان، پ۲۱، آیت ۶)

اس شعر میں اسی آیتِ کریمہ کی طرف تلمیح ہے اور ایک حدیثِ قدسی کی جانب بھی اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لا اِلٰه الا اللّٰه حِصْنِي، و مَن دخل حِصْنِيْ اَمِنَ عَذَابِيْ. (عصیدۃ الشھدۃ ص۲۰۷)

(کلمۂ طیبہ میرا قلعہ ہے اور جو میرے قلعے میں آگیا میرے عذاب سے مامون ومحفوظ ہو گیا)۔

سوال: ہم نے بارہا دیکھا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں بھی پڑھا ہے کہ دشمنانِ اسلام سرکار کے امتیوں پر غالب آئے ہیں اور ان کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہوئے ہیں اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں پر طرح طرح کی بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں تو امام بوصیری

نے ان دو اشعار میں ان کے مغلوب وشکست خوردہ نہ ہونے اور بلاؤں سے محفوظ و مامون ہونے کی جو بات کہی ہے وہ کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے؟

جواب اول: امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سرکار کی برکت سے آپ کے امتی آخرت کی بلاؤں اور ان مصائب وآلام سے محفوظ و مامون ہیں جو سابقہ امتوں پر عذاب بن کر نازل ہوئی تھیں، ارشاد ربانی ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيهِمْ. (الانفال ۸/۳۳)

(اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک (اے محبوب) تم ان میں تشریف فرما ہو)۔

یہ مراد نہیں کہ دنیا کی تمام مصیبتوں سے محفوظ و مامون ہیں، کیوں کہ اپنی بداعمالیوں کے نتیجہ میں تو انہیں مصائب وآلام کا مزہ چکھنا ہی ہے، قرآن کریم میں ہے:

وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ. (الشوریٰ ۴۲، آیت ۳۰)

(اور جو تمہیں مصیبت پہنچی وہ ان (گناہوں) کے سبب ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کیا)۔

جواب دوم: حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ نے سرکار کے امتیوں کے دشمنوں کے سامنے مغلوب نہ ہونے اور تمام مصائب وآلام سے محفوظ و مامون ہونے کی جو بات کہی ہے وہ ان امتیوں کے لیے ہے جو صحیح معنوں میں آپ کے امتی ہیں اور صحیح معنوں میں آپ کے امتی وہی ہیں جو مومن کامل ہیں، آپ کی شریعت پر پورے طور پر عامل ہیں اور دنیا سے کنارہ کش ہیں، کیوں کہ حضور اقدس ﷺ نے صرف اللہ تعالیٰ سے لو لگانے اور آخرت کی طرف توجہ کرنے کی تعلیم دی ہے اور دنیا اور اس کی فانی لذتوں سے روگردانی کی تلقین فرمائی ہے، تو جو دنیا سے منھ موڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے لو لگاتا ہے اور آخرت کی طرف رغبت رکھتا ہے وہ دشمنوں کے سامنے سرنگوں ہونے، ان کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہونے اور تمام مصائب وآلام سے سے محفوظ و مامون رہتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (المنافقون ۶۳ آیت ۸)
(اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں ہی کے لیے ہے، مگر منافقوں کو علم نہیں)۔
اور جو سرکار کی پے روی چھوڑ کر شیطان کی پے روی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور آخرت سے منھ موڑ کر صرف دنیا کی طرف رغبت کرتا ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جن کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى۝
(النازعات: ۷۹، آیت ۳۷ تا ۳۹)

(تو وہ جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو بے شک جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہے)۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ مرکب ہے (۲) اور ملت کی قلعہ سے تشبیہ، تشبیہِ بلیغ ہے (۳) اَحَلَّ اور حَلَّ کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے (۴) لَیْث، اَشْبَال اور اَجَم کے یک جا ذکر کرنے میں صنعت مراعاۃ النظیر ہے (۵) اور اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے، جیسا کہ ابھی شعر کی تشریح میں گزرا۔

(۱۳۹)
كَمْ جَدَّلَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ مِنْ جَدِلٍ
فِيْهِ وَكَمْ خَصَمَ الْبُرْهَانُ مِنْ خَصِمِ

ترجمہ: قرآنی آیات نے نہ معلوم کتنے کٹ حجتی کرنے والوں کو چت کر دیا اور آپ کے معجزات نے نہ جانے کتنے مُعاندوں کو زیر کر دیا۔

لغات: كَمْ: خبریہ ہے، بمعنی کثیر، اس کی تمیز مجرور ہوتی ہے، کتنی بار. جَدَّلَتْ: چت کر دیا، زمین پر گرا دیا، پٹک دیا. كَلِمَاتُ اللّٰهِ: آیاتِ قرآنی. مِنْ: زائدہ ہے. جَدِلٌ: کٹ حجتی کرنے والا، بہت جھگڑالو. خَصَمَ (ض): زیر کر دیا. خَصِمٌ: جھگڑالو، معاند، مخالف، مدِمقابل (ج) اَخْصَام وَخَصِمُوْنَ۔

تشریح: اس شعر کا گزشتہ اشعار سے تعلق یوں ہے کہ سرکار کی نصرت وحمایت کبھی تلوار اور ظاہری ہتھیار سے ہوتی تھی اور کبھی دلائل و براہین کے ذریعہ، گزشتہ اشعار میں پہلی قسم کی نصرت وحمایت کا بیان تھا اور اس شعر میں دوسری قسم کی نصرت وحمایت کا بیان مقصود ہے۔

پہلے مصرعہ میں ان واقعات کی جانب اشارہ ہے جن میں معاندین کا منھ توڑ جواب قرآنی آیات نے دیا ہے، روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کو آزمانے کے لیے یہودی علما بعض اہل قریش کو سوالات سکھا کر سرکار کی بارگاہ میں بھیجا کرتے تھے کہ وہ آپ سے معلوم کریں اور کہا کرتے تھے کہ اگر سب کا جواب پورا پورا دے دیں تو ان کی نبوت کا دعویٰ غلط ہوگا، کیوں کہ اس سے پتہ چلے گا کہ کسی نے ان کو سوال و جواب سب بتا دیا ہے اور اگر کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکیں تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہوگی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی علم نہیں دیا گیا، ہاں! اگر بعض باتوں کا صحیح جواب دیں اور بعض کے بارے میں یہ کہیں کہ اللہ کو معلوم ہے، یا اللہ خوب جانتا ہے تو بے شک یہ نبی کی شان ہے، چنانچہ اہل قریش نے آکر کبھی روح کے بارے میں، کبھی ذوالقرنین کے بارے میں اور کبھی اصحابِ کہف کے بارے میں آپ سے دریافت کیا، اصحابِ کہف کے تعلق سے سرکار نے قرآن کا وہ بیان سنا دیا جو سورۂ کہف میں آیت (۹) سے آیت (۲۶) تک تفصیلاً مذکور ہے اور ذوالقرنین کے بارے میں بھی انہیں وہ ربانی ارشاد سنایا جو سورۂ کہف کی آیت (۸۳) سے شروع ہو کر آیت (۹۹) پر ختم ہوتا ہے، مگر روح کے بارے میں قرآن کی یہ آیت ان کے سامنے رکھی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ .

(تم سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر سے ہے)۔

اس طرح اس کی حقیقت، ماہیت نہ بتا کر اسے اللہ کے حوالے کر دیا، اس طرح قرآنی آیات نے ان کٹ حجتی کرنے والوں کو چت کر دیا اور دھول چٹا دی۔

اور دوسرے مصرعہ میں ان واقعات کی جانب اشارہ ہے جن میں سرکار نے معجزات دکھا کر معاندین کی زبانیں بند کردیں اوران کو زیر کردیا، مثلاً ابوجہل مٹھی میں کنکریاں لے کر آیا تو ان کنکریوں نے سرکار کی رسالت کی گواہی دی، چاند کو آپ نے دو ٹکڑے فرمادیا، درخت چل کر حاضر بارگاہ ہوئے اور پھر اپنی جگہ پر واپس چلے گئے، اس طرح ان معجزات نے بارہا مخالفین و معاندین کا ناطقہ بند کردیا اورانہیں پسپا کیا۔

مجدد اعظم امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ ایک نعتِ پاک میں لکھتے ہیں:

چاند شق ہو، پیڑ بولیں، جانور سجدہ کریں
بارک اللہ مرجع عالم یہی سرکار ہے

محاسن بلاغت: (۱) جَـدَّلَتُ اور جَدِلُ کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے، یوں ہی خَصَم اور خَصِم کے درمیان بھی۔

(۱۴۰)
كَفَاكَ بِالْعِلْمِ فِي الْأُمِّيِّ مُعْجِزَةً
فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَالتَّادِيبِ فِي الْيُتَمِ

ترجمہ: زمانۂ جاہلیت میں امی ہوتے ہوئے آپ کا عالم ہونا اور یتیمی کے باوجود آپ کا تربیت یافتہ ہونا آپ کے اعجاز کے لیے کافی ہے۔

لغات: **الأمّي:** جو پڑھا لکھا نہ ہو. **الجَاهِلِيّة:** وہ زمانہ جس میں دین حق سے جہالت، ناآشنائی عام تھی، یہ وہ زمانۂ فترت ہے جو سرکار کی بعثت سے پہلے تھا، جب کہ لوگ گزشتہ شریعتوں سے منحرف ہو چکے تھے. **التاديب:** مہذب اور شائستہ ہونا، تربیت یافتہ ہونا. **اليُتَم:** (مصدر، ض، س، ک) یتیمی کی حالت۔

تشریح: امی اس شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو اور بطور عادت اس نے کسی معلم و استاذ سے تعلیم نہ پائی ہو، گویا وہ اسی حالت پر باقی ہے جو ماں کے شکم سے پیدا ہونے کے وقت تھی، دوسرے انسانوں کے لیے تو یہ عیب کی بات ہے مگر رسول اکرم ﷺ کے لیے مدح

وستائش اور فخر واعزاز کی بات ہے، کیوں کہ یہ آپ کے صادق ہونے کی دلیل ہے اور اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن کریم کلام الٰہی ہے، خود آپ کا کلام نہیں، قرآن کریم میں ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ. (الجمعۃ ۶۲، آیت ۲)

[(اللہ) وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔]

بعض فضولی قسم کے لوگوں کا کہنا ہے کہ امی (ان پڑھ) ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں، بلکہ یہ ایک قسم کا عیب ہے تو اس معنی کو دیکھتے ہوئے مقام مدح میں اس کا ذکر کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس کو "ام القریٰ" (مکہ مکرمہ) سے منسوب کیا جائے اور امی کا مطلب ہوا کہ ام القریٰ کے رہنے والے، اس کو امام راغب اصفہانی نے بھی مفردات القرآن میں ذکر کیا ہے، کہ بعض لوگوں کو یہ وہم ہے، ہم اس پر یہ عرض کرتے ہیں کہ صرف ام القریٰ کا باشندہ ہونا بھی کوئی فضیلت نہیں رکھتا ورنہ ابو جہل، ابولہب، عُتبہ، شَیبہ، اُمیّہ بن خَلف وغیرہ سرکار کے دشمن بھی تو یہیں کے باشندے تھے، مگر ان کے لیے یہ چیز فضیلت واہمیت اور امتیاز کا سبب نہ ہوئی، امتیاز کا سبب کوئی انوکھی اور عجوبہ چیز ہوتی ہے جو پہلے معنی میں پورے طور پر موجود ہے۔

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ سرکار کی ولادت اور نشو ونما زمانۂ جاہلیت میں ہوئی، جب کہ جزیرۂ عرب کے لوگ دینِ حق، علم حقیقی اور معرفت ربانی سے نا آشنا تھے، اس لیے سرکار امی تھے کہ تعلیم بھی حاصل کرتے تو کس سے؟ مگر اس کے باوجود آپ کی زبان مبارک سے علم وحکمت کے سوتے پھوٹے، دنیا وآخرت کے غیبی علوم سے لوگوں کو آگاہ فرمایا، آسمان وزمین اور آفاق وانفس کے سربستہ رازوں سے انہیں مُطّلع کیا، یوں ہی یتیمی کی حالت میں پروان چڑھنے کے باوجود ایسے تربیت یافتہ، شائستہ اور بلند اخلاق ہوئے کہ آپ کی ذات اخلاق وآداب اور تعلیم وتربیت کا سب سے عظیم سرچشمہ بن گئی، یہ محیّر العقول اوصاف آپ کی نبوت ورسالت کی دلیل اور آپ کا بلند پایہ معجزہ ہیں۔

الفصل التاسع
في طلب المغفرة من الله والتوسل برسول الله ﷺ

(۱۴۱)
خَدَمْتُهُ بِمَدِيحٍ اَسْتَقِيلُ بِه
ذُنُوبَ عُمْرٍ مَّضىٰ فِي الشِّعْرِ وَالْخِدَم

ترجمہ: اس نعت کے ذریعہ سرکار کی خدمت کر کے اپنی اس عمر کے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں جو اُمرا کی خدمت اور شاعری میں گزری۔

لغات: مَدِيح: تعریف و توصیف، نعتِ پاک (ج) مَدَائِحُ. اَسْتَقِيلُ: صیغہ واحد متکلم، فعل مضارع معروف از اِسْتَقَالَ اللّٰهُ ذُنُوبَهٗ: بمعنی اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنا، بخشش چاہنا. الشِّعر: شاعری. الخِدَم: خدمۃ کی جمع، مراد حکومت کی ملازمت۔

محاسن بلاغت: (۱) خَدَمْتُ اور اَلْخِدَمُ کے درمیان صنعتِ اشتقاق ہے (۲) اور مذکورہ متجانسین میں سے ایک کے شعر کے شروع میں آنے اور دوسرے کے آخر میں آنے سے صنعتِ تصدیر پیدا ہوئی جس کو ردالعجز علی الصدر بھی کہتے ہیں۔

(۱۴۲)
اِذْ قَلَّدَانِيَ مَا تُخْشىٰ عَوَاقِبُهٗ
كَاَنَّنِي بِهِمَا هَدْيٌ مِّنَ النَّعَم

ترجمہ: اس لیے کہ ملازمت اور شاعری نے میری گردن میں ایسے گناہوں کا قلادہ ڈالا جن کے انجام بد کا اندیشہ ہے، میں ان دونوں کے باعث ہدی کے جانور کی طرح (قلادہ ڈالا) ہو گیا ہوں۔

لغات: اِذْ: یہ تعلیل کے لیے ہے. قَلَّدَا: صیغہ تثنیہ غائب، فعل ماضی معروف از تقلید بمعنی

گلے میں قلادہ یا پٹہ ڈالنا. تُخْشٰی: فعل مضارع مجہول از خَشِيَ يَخْشٰى خَشْيَةً (س) بمعنی ڈرنا. عَوَاقِبُ: عَاقِبَة کی جمع، نتیجہ، انجام کار. هَدْيٌ: قربانی کے اس جانور کو کہتے ہیں جس کے گلے میں کوئی نشانی ڈال کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور حرم مکہ میں پہنچنے پر اسے ذبح کیا جاتا ہے. النَّعَمُ: جانور، چوپایہ (ج) انعام (جمع الجمع) اَنَاعِيمُ۔

تشریح: ان دونوں شعروں کا مفہوم یہ ہے کہ میں سراپا معصیت ہوں، میری پوری عمر اُمرا وسلاطین اور ارباب جاہ ومنصب کی خوشامد اور قصیدہ خوانی کرتے اور ان کی خواہشاتِ جاہ و منزلت کی تسکین کا سامان کرتے گزری ہے، اب سرکار اقدس ﷺ کی مدح خوانی کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسے اپنے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ بناتا ہوں اور مغفرت کی درخواست کرتا ہوں، کیوں کہ میں نے امرا وسلاطین کی خدمت اور شاعری کے ذریعہ اپنی گردن پر اُن گناہوں کا بار لے لیا ہے جن کے برے نتائج (جہنم کے گوناگوں عذاب) کا مجھے ڈر ہے، ان دونوں کی وجہ سے گویا میں قربانی کا جانور ہوں جو اپنی موت اور ہلاکت کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے اور جس طرح گردن میں مخصوص نشانی ہونے کی وجہ سے ہدی کا جانور سب کے نزدیک عیاں رہتا ہے اسی طرح میرے حالاتِ زندگی کو دیکھنے والے ہر شخص کے نزدیک میرے معاصی اور گناہ عیاں ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت بوصیری ابتدا میں ایک زمانہ تک حکومتِ وقت کے ملازم رہے اور شاہی ملازمت اگرچہ جائز اور درست ہے لیکن اس حالت میں کبھی مجبور ہو کر انسان کو ناجائز کام بھی کرنے پڑتے ہیں، ان دونوں اشعار میں اسی کی جانب اشارہ ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ مرسل اور تشبیہِ مجمل ہے۔

(۱۴۳)

اَطَعْتُ غَيَّ الصِّبَا فِي الْحَالَتَيْنِ وَمَا
حَصَّلْتُ اِلَّا عَلَى الْاٰثَامِ وَالنَّـدَمِ

ترجمہ: میں نے ان دونوں حالتوں میں نوعمری کی بے راہ روی کی پیروی کی اور اس

ے مجھے گناہوں اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

فصل تاسع

لغات: اَطَعْتُ: میں نے اطاعت کی، بات مانی، ماضی متکلم از اِطَاعَةٌ. غَيٌّ: گمراہی، بے راہ روی (مصدر از باب ضرب). الصِّبَا: بچپن، نوعمری. الحَالَتَيْنِ: دونوں حالتیں، مراد سلاطین واُمرا کی مدح خوانی اور شاعری. الآثَام: اِثْم کی جمع، گناہ، ناجائز کام، جرم۔

تشریح: میں نے دونوں حالتوں میں سلامت روی اور اعتدال کا طریقہ ملحوظ نہ رکھا، دونوں میں مجھ سے بچپن جیسی بے اعتدالیاں سرزد ہوئیں، شاعری کی تو اس میں امرا وسلاطین کی مدح وثنا میں میانہ روی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ملازمت کی تو ایسی کی کہ بسا اوقات اس میں جواز کی سرحدیں پار کر کے ناجائز وحرام کی حدوں میں داخل ہوگیا، جس کے نتیجہ میں مجھے گناہوں اور ان پر ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

(۱۴۴)

فَيَا خَسَارَةَ نَفْسِيْ فِيْ تِجَارَتِهَا

لَمْ تَشْتَرِ الدِّيْنَ بِالدُّنْيَا وَلَمْ تَسُمِ

ترجمہ: تو ہائے افسوس! میرے نفس نے تجارت میں کتنا نقصان اٹھایا کہ اس نے نہ دنیا کے بدلے میں دین خریدا اور نہ ہی اس کا مول بھاؤ کیا۔

لغات: يَا: حرفِ ندا ہے، جو یہاں حسرت واستعجاب کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور ''خَسَارَةَ نَفْسِ'' اس کا منادیٰ ہے، اس سے بطور کنایہ مراد یہ ہے کہ یہ خسارہ بہت بڑا اور انتہائی سنگین ہے، کیوں کہ عربوں کا طریقہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کی سنگینی دیکھ کر محوِ حیرت ہوتے ہیں تو اس پر حرفِ ندا داخل کر کے اس کو پکارتے ہیں، جیسے کہ وہ جب سیلاب کی صورت میں پانی کی فراوانی دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یَا لَلْمَاءِ. لَمْ تَسُمِ: بھاؤ تاؤ نہ کیا، از سَامَ الْمُشْتَرِيْ السِّلْعَةَ سَوْمًا (ن) بھاؤ کرنا، کہا جاتا ہے: سَامَ فُلَانٌ بِسِلْعَتِهٖ كَذَا وَكَذَا، فلاں نے اپنے سامان کا اتنے اور اتنے کا بھاؤ کیا۔

تشریح: اس شعر میں شاعر حضرت امام بوصیری علیہ الرحمہ اپنی گزشتہ زندگی کے خسارہ اور

نقصان کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حیرت وتعجب کا اظہار کررہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میرا نفس اس تجارتِ زندگی میں کیسے عظیم خسارے اور سنگین نقصان سے دوچار ہوا کہ وہ دنیا ہی کو مضبوطی سے پکڑے رہا، نہ اسے دے کر بدلے میں دین لیا اور نہ اس کے لینے کی فکر کی۔

مطلب یہ ہے کہ میں نے امراء وسلاطین کی مدح سرائی اور ملازمت کرکے بڑے گھاٹے کا سودا کیا، اگر توفیق الٰہی میرے ہم رکاب ہوتی تو میں اس دنیاداری کو چھوڑ کر دین کے کاموں میں لگتا، لیکن کیا کیا جائے، کارِ خیر کی توفیق تو اللہ تعالیٰ ہی کے دستِ قدرت میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) ''یا'' حرفِ ندا میں مجازِ لغوی ہے، کیوں کہ وہ یہاں اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہے، (۲) ''لَمْ تَشْتَرِ'' میں استعارۂ مصرحہ تبعیہ ہے، کیوں کہ وہ یہاں ''بدلنے'' کے معنی میں ہے اور اس پر قرینہ مبیع اور ثمن کی جگہ میں دین اور دنیا کا ذکر کرنا ہے، کیوں کہ یہ دونوں حقیقی بیع وشرا کے لیے مبیع اور ثمن نہیں بن سکتے (۳) تجارۃ، اشتراء اور سوم کے یکجا ذکر کرنے میں صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے (۴) دین اور دنیا کو یکجا لانے میں صنعتِ طباق ایجاب ہے۔

(۱۴۵)

وَمَنْ يَّبِعْ اٰجِــلاً مِّنْهُ بِعَاجِلِهٖ
يَبِنْ لَهُ الْغَبْنُ فِيْ بَيْعٍ وَّ فِيْ سَلَمٖ

ترجمہ: اور جو اپنی عاجل (دنیا) کے بدلے آجل (عقبیٰ) کو بیچ دے تو اس بیع سَلَم میں اس کا نقصان عیاں ہے۔

لغات: اٰجِلٌ: اسم فاعل از اَجِلَ اَجلاً (س) دیر میں آنے والی چیز، مراد عقبیٰ، آخرت۔ عَاجِلٌ: جلد آنے والی چیز مراد دنیا۔ یَبِنْ: فعل مضارع معروف مجزوم از بَانَ یَبِیْنُ بَیَاناً و تِبْیَاناً (ض) ظاہر ہونا، واضح ہونا۔ اَلْغَبْنُ: نقصان، گھاٹا، دھوکہ۔ وَفِیْ سَلَمٍ: اس میں واؤ عاطفہ عطفِ تفسیری کے لیے ہے۔ بیع سلم: وہ بیع ہے جس میں قیمت پیشگی دی جاتی ہے، بلفظ

دیگر جس میں قیمت نقد ہو اور سامان ادھار۔

تشریح: یہ شعر معنوی حیثیت سے گزشتہ شعر ہی سے مربوط ہے، اور اس سے بعض دنیا داروں کے اس مقولہ کی تردید مقصود ہے: اَلدُّنْیَا نَقْدٌ وَالْاٰخِرَةُ نَسِیْئَةٌ وَاِعْطَاءُ النَّقْدِ بِهَا غَیْرُ مَعْقُوْلٍ (دنیا نقد ہے اور آخرت قرض اور نقد کو قرض کے بدلے میں دینا بے عقلی ہے)، تردید اس طرح ہوئی کہ بیع سلم جو دنیا میں ہوتی ہے اس میں نقد دے کر وعدہ پر مبیع لیا جاتا ہے اور سبھی ماہرین تجارت بیع سلم کو قبول کرتے ہیں تو اگر اس طریقۂ بیع میں کوئی خوبی نہ ہوتی تو ماہرین تجارت اسے کبھی تسلیم نہ کرتے اور ان کے معاشرے میں اس کا چلن نہ ہوتا۔

کون نہیں جانتا کہ آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے اور دنیا فانی ہے، تو جو آخرت دے کر دنیا لے وہ باقی دے کر فانی لینے والا ہے اور اس طرح کے سودے میں خسارہ اور نقصان بالکل عیاں ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) آجل اور عاجل کو یکجا ذکر کرنے میں صنعتِ طباق ایجاب ہے (۲) آجل اور عاجل میں کنایہ ہے (۳) یَبِعْ اور بَیْع کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے (۴) بیع، سلم اور غبن کو اکٹھا کرنے میں صنعتِ مراعاة النظیر ہے۔

(۱۴۶)

اِنْ اٰتِ ذَنْبًا فَمَا عَهْدِيْ بِمُنْتَقِضٍ
مِّنَ النَّبِيِّ وَلَا حَبْلِيْ بِمُنْصَرِمِ

ترجمہ: اگر مجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو بھی سرکار سے میرا عہد ٹوٹنے والا اور میرا رشتہ منقطع ہونے والا نہیں۔

لغات: اٰتِ: فعل مضارع معروف مجزوم، واحد متکلم، یہ اصل میں "اٰتِيْ" تھا، یا جزم کی وجہ سے گر گئی۔ ذَنْبٌ: گناہ (ج) ذُنُوْبٌ۔ عَهْدٌ: میثاق، پیمان، یہاں اس سے مراد پیمان اطاعت اور ایمان ہے (ج) عُهُوْدٌ۔ مُنْتَقِضٌ: ٹوٹنے والا، اسم فاعل از انتقاض۔ حَبْلٌ: رسی، باندھنے کی چیز، مراد رشتۂ ایمان، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عہد اور حبل دونوں سے مراد وعدہ و

بشارت ہو جو محمد نام ہونے کی بنا پر احادیث میں آیا ہے (ج) حِبَال وَاَحْبُل وحُبُوْل وَ اَحْبَال ۔ مُنْصَرِمٌ: اسم فاعل از انصرام، ٹوٹنے والا۔

تشریح: گناہوں کے اعتراف اور اس پر اظہار ندامت کے بعد وہ اپنے غم زدہ دل کے لیے سامانِ تسکین فراہم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر چہ مجھ سے گناہ سرزد ہوئے ہیں مگر پھر بھی سرکار سے میرا رشتۂ ایمانی نہیں ٹوٹا اور میں بہر حال مسلمان ہوں، کیوں کہ اہل سنت و جماعت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کرنے سے ایمان رخصت نہیں ہوتا، خواہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، جب تک وہ کفر و شرک کی سرحد میں داخل نہ ہو جائے، جب وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلے گا، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا، امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان اپنی ایک نعت میں فرماتے ہیں:

بد سہی، چور سہی، مجرم و ناکارہ سہی ۔۔۔ اے وہ کیسا ہی سہی ہے تو کریما تیرا

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں لفظ ''حبل'' میں استعارۂ مصرحہ اصلیہ ہے اور بعد میں ''منصرم'' کا ذکر کرنا ترشیح ہے (۲) اور آخری مصرعے میں ایجازِ حذف بھی ہے، کیوں کہ اس کی اصل ''وَلاحَبلِي بِمُنْصَرِمٍ مِّنَ النَّبِيِّ'' ہے۔

(۱۴۷)

فَاِنَّ لِيْ ذِمَّةً مِّنْهُ بِتَسْمِيَتِيْ
مُحَمَّدًا وَّهُوَ اَوْفَى الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

ترجمہ: کیوں کہ میرا نام محمد ہونے کی وجہ سے آپ کی جانب سے مجھے ایک عہد و پیمان مل چکا ہے اور آپ ساری مخلوق سے بڑھ کر عہد و پیمان کو پورا فرمانے والے ہیں۔

لغات: ذِمَّة: عہد، امان (ج) ذِمَم. اَوْفیٰ: اسم تفضیل از وَفیٰ یَفِيْ وَفَاءً بمعنی پورا کرنا۔

تشریح: اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ امام بوصیری علیہ الرحمہ کا نام محمد ہے اور کسی کے نام کو اپنانا یا اپنے بیٹوں یا رشتہ داروں کا نام رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اس ذات سے قلبی تعلق اور گہری محبت ہے جس کا نام اس نے انتخاب کیا ہے، کیوں کہ کبھی کوئی شخص کسی

ناپسندیدہ انسان کے نام پر اپنا یا اپنے فرزندوں اور رشتہ داروں کا نام نہیں رکھتا، لہٰذا محمد نام رکھنے کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ جس نے یہ نام رکھا ہے اسے حضور اکرم ﷺ سے قلبی لگاؤ ہے اور اپنے فرزند کے لیے وہ تمنا رکھتا ہے کہ وہ آپ کا مطیع و فرماں بردار ہو، اس شعر پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ ''محمد'' نام رکھنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

مختلف احادیث میں سرکار اقدس ﷺ کے نام نامی پر نام رکھنے کی فضیلتیں آئی ہیں، ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں،

○ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن دو بندے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں جانے کا حکم دے گا، وہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں گے: ہم کس بنا پر جنت کے مستحق قرار پائے؟ ہمارے اعمال تو ایسے نہ تھے کہ جن کے بدلے میں ہمیں جنت ملتی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میرے بندو! جنت میں داخل ہو جاؤ

فَاِنِّي اٰلَيْتُ عَلٰى نَفْسِي اَنْ لَّا يَدْخُلَ النَّارَ مَنْ اِسْمُهٗ اَحْمَدُ وَ لَا مُحَمَّدٌ. (المواهب اللدنيه)

(کیوں کہ میں نے اپنے ذمہ کرم پر لازم کر لیا ہے کہ جس کا نام احمد یا محمد ہوگا وہ دوزخ میں نہیں جائے گا)۔

○ حضرت نبیط بن شریط رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: وَعِزَّتِي وَجَلَالِي لَا عَذَّبْتُ اَحَدًا تَسَمّٰى بِاسْمِكَ فِي النَّارِ. (المواهب اللدنيه) رواه ابونعيم وعنه ابوعلى الحداد وعنه ابومنصور الديلمى في مسند الفردوس بسنده مرفوعا.

(اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم، میں تیرے ہم نام کو آتش دوزخ میں عذاب نہ دوں گا)۔

○ حضرت جعفر بن محمد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ نَادىٰ مُنَادٍ: أَلا لِيَقُمْ مَنِ اسْمُهٗ مُحَمَّدٌ فَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ كَرَامَةً لِاِسْمِهٖ صلى الله تعالىٰ عليه وسلم.

(قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ وہ کھڑے ہو جائیں جن کا نام محمد ہو اور سرکارِ اقدس ﷺ کے نام پاک کی برکت سے وہ جنت میں داخل ہوں گے)۔

(هـذا الحديث اورده القاضى عياض فى الشفا أيضا، وقال العلامة الخفاجى فى نسيم الرياض: وليس هذا مما يقال بالرأي، فهو حديث له حكمُ الرفع، وماقيل من أنه يؤدي الى الاتكال وعدم العمل مما لا يُلتفتُ اليه)

○ ایک روایت میں یہی مضمون یوں آیا ہے:

يُنَادىٰ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا مُحَمَّدُ، فَيَرْفَعُ رَأْسَهٗ فِي الْمَوْقِفِ مَنِ اسْمُهٗ مُحَمَّدٌ، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ: أُشْهِدُكُمْ أَنِّي قَدْ غَفَرْتُ لِكُلِّ مَنِ اسْمُهٗ عَلَى اسْمِ مُحَمَّدٍ نَبِيِّي. (كتاب الشفا للقاضى عياض)

(قیامت کے دن پکارا جائے گا: اے محمد! تو اس نام کے سارے لوگ موقف میں اپنے سر اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ہر اس شخص کو بخش دیا جس کا نام میرے نبی محمد کے نام پر ہے)۔

○ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

قَالَ: مَنْ وُلِدَ لَهٗ مَوْلُوْدٌ فَسَمَّاهُ مُحَمَّدًا تَبَرُّكًا كَانَ هُوَ وَمَوْلُوْدُهٗ فِي الْجَنَّةِ. (رواه صاحب الفردوس وابنه منصور)

(فرمایا: جس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور تبرکاً اس کا نام محمد رکھے تو باپ بیٹا دونوں جنتی ہوں گے)۔

○ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَا مِنْ مَّائِدَةٍ وُضِعَتْ فَحَضَرَ عَلَيْهَا مَنِ اسْمُهٗ أَحْمَدُ وَمُحَمَّدٌ اِلَّا قَدَّسَ اللّٰهُ

ذٰلِکَ الْمَنْزِلَ مَرَّتَیْنِ. (جواھر البحر للعلامة النبھانی)

(جہاں کوئی دستر خوان بچھایا جائے اور اس پر محمد یا احمد نام کا کوئی شخص حاضر ہو تو اللہ تعالیٰ اس مقام کو دو بار تقدس عطا فرماتا ہے)۔

اس مفہوم کی کثیر احادیث ہیں جو المواہب اللدنیہ، شرح الزرقانی علی المواہب، شفا شریف، نسیم الریاض للخفاجی وغیرہ شروح شفا اور جواہر البحار وغیرہ کتب میں مذکور ہیں۔

اس شعر میں ''عہد و پیمان'' سے مراد محمد یا احمد نام کی برکت سے دوزخ سے نجات اور جنت کی حصول کی بشارت دینے والی حدیثیں ہیں اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میرا نام محمد ہے اور حدیثوں میں حضور نے وعدہ فرمایا کہ جس کا نام محمد ہوگا وہ دوزخ میں نہ جائے گا اور سرکارِ اقدس ﷺ ساری مخلوق سے بڑھ کر وعدہ وفا کرنے والے ہیں، اس لیے مجھے اس پر ناز ہے۔

محاسنِ بلاغت: (۱) ذِمَّۃٌ اور ذِمَمْ کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے (۲) اور اس میں صنعتِ ردالعجز علی الصدر بھی ہے (۳) اور اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے۔

(۱۴۸)
اِنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْ مَعَادِیْ اٰخِذًا ۢبِیَدِیْ
فَضْلًا وَ اِلَّا فَقُلْ یَا زَلَّۃَ الْقَدَمِ

ترجمہ: اگر رسول اللہ اپنے فضل و کرم سے آخرت میں میری دست گیری نہ فرمائیں تو مجھے کہنا چاہیے ہائے لغزشِ قدم!

لغات: مَعَاد: لوٹنے کی جگہ، مگر یہاں پر مجازاً اس سے مراد عالم آخرت ہے، جو موت کے وقت ہی شروع ہو جاتا ہے (ج) مَعَاوِدُ. وَ اِلَّا: ورنہ، یعنی اگر آپ وہاں میری دست گیری فرمائیں، یہ اصل میں اِنْ شرطیہ اور لَا نافیہ سے مرکب ہے، یہاں اس کی شرط اور جزا دونوں محذوف ہیں، اصل عبارت یہ بنتی ہے: وَاِلَّا یَکُنْ کَذَاکَ فَقُلْ یَا ثَبَاتَ الْقَدَمِ اور فَقُلْ یَا زَلَّۃَ الْقَدَمِ شرطِ اول کی جزا ہے، کچھ شارحین نے لکھ کہ ''وَاِلَّا'' میں واو حرفِ عطف ہے اور اِلًّا تنوین کے ساتھ اسم ہے جو عہد کے معنی میں ہے، قرآن کریم میں ہے: لَا یَرْقُبُوْنَ

فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (التوبہ:۱۰)اور یہ ''فَضْلًا'' پر معطوف ہے، حضرت علامہ عمر بن احمد خر پوتی علیہ الرحمہ نے عصیدۃ الشہدۃ میں لکھا: وَ هُوَ الْأَصْوَبُ (یہی سب سے زیادہ درست اور صحیح ہے)۔ شیخ خالد ازہری نے اپنی شرح بردہ میں لکھا: میں نے نیم خوابی کے عالم میں سنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر میں ''وَاِلَّا'' زائد ہے، بعض شارحین کا کہنا ہے کہ یہ شرطِ اول کی تاکید ہے۔ يَا زَلَّةَ الْقَدَمِ: اس میں حرف ندا اظہارِ تاسف کے لیے ہے، جیسے عربی میں کہتے ہیں: يَا خَيْبَةَ اَمَلِيْ (ہائے رے میری امیدوں کی ناکامی) اور يَا سُوْءَ حَظِّيْ (ہائے رے میری بدنصیبی) اور ''زَلَّة'' زَلَّ زَلًّا وَزَلَلًا (ض،س) کا مصدر ہے، بمعنی لغزش، پھسل کر گرنا (ج) زَلَّات۔

تشریح: اس شعر میں دستگیری کرنے سے بطور کنایہ آخرت میں بارگاہِ الٰہی میں شفاعت کرنا مراد ہے اور ''ہائے لغزش قدم'' سے مراد یہ ہے کہ میرا قدم پل صراط پر بری طرح سے پھسلے گا جس کا نتیجہ جہنم میں گرنے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا، اب پورے شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ میں نے بے شمار گناہ کیے ہیں، میں گناہوں کے دریا میں ڈوبا ہوا ہوں تو اگر قیامت کے دن سرکارِ اقدس ﷺ اپنے کرم ونوازش سے بارگاہِ الٰہی میں میرے گناہوں کی بخشش کے لیے شفاعت نہ فرمائیں اور میری دست گیری نہ کریں تو پل صراط پر میرے قدم بری طرح پھسلیں گے جس کا نتیجہ جہنم میں جانے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا اور اگر آپ وہاں میری شفاعت اور دست گیری فرمائیں تو مجھے پل صراط پر اعلیٰ درجے کی ثابت قدمی حاصل ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا، اور ''فَضْلًا'' (یعنی فضل وکرم سے) کہنے میں اس جانب اشارہ ہے کہ سرکار کا ہم گناہ گاروں کی شفاعت کرنا آپ کا فضل وکرم اور نوازش ہے، آپ پر فرض اور لازم نہیں۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں دو کنایے ہیں، جیسا کہ تشریح سے واضح ہے (۲) اور اس میں ایجاز حذف بھی ہے۔

حَاشَاهُ اَنْ يُحْرِمَ الرَّاجِيْ مَكَارِمَهٗ
اَوْ يَرْجِعَ الْجَارُ مِنْهُ غَيْرَ مُحْتَرَمٖ (۱۴۹)

ترجمہ: آپ کی شان اس سے بلند ہے کہ اپنی ذات سے فیض وکرم کا آسرا رکھنے والوں کو محروم فرمادیں یا آپ کے جوارِ رحمت میں پناہ لینے والا ناکام و بے توقیر واپس ہو۔

لغات: حَاشَا: تنزیہ کے لیے ہے، مُحَاشَاۃٌ کا اسم مصدر ہے، پوری عبارت یوں ہوگی، اُحَاشِیْهِ حَاشاً أي مُحَاشَاۃً یعنی میں سرکار کو اس سے دور رکھتا ہوں کہ الخ. یُحْرِمُ یہ باب افعال سے فعل مضارع معروف ہے، محروم کرے. مَکَارِمُ مَکْرُمَۃٌ کی جمع، بخشش، کرم، فیاضی، مراد شفاعت. اَلْجَارُ: پناہ لینے والا، اسم فاعل از جَارَ یَجُوْرُ جِوَاراً (ن) (ج) جِیْرَانٌ وَجِیْرَۃٌ وَ جِوَارٌ وَ اَجْوَارٌ۔

تشریح: گزشتہ شعر سے ذہن میں یہ شبہہ پیدا ہوسکتا تھا کہ جب شفاعت کرنا سرکار پر لازم نہیں ہے تو امید وارِ شفاعت کی امید اور پناہ دینے کی درخواست کرنے والے کی درخواست آپ کی بارگاہ میں رد بھی ہوسکتی ہے، اس شعر میں قلبِ مضطرب کے لیے تسکین کا سامان کرتے ہوئے اور اس شبہہ کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ شفاعت کرنا گوکہ آپ پر لازم نہیں مگر آپ کی شان کریمی سے یہ بعید ہے کہ کوئی آپ سے فیض وکرم کا آسرا لگائے اور آپ کی ذات سے شفاعت کی امید باندھے اور آپ اسے محروم کردیں، یا کوئی پریشان حال آپ کے جوارِ رحمت میں پناہ ڈھونڈے اور آپ اس کی درخواست رد کر کے اسے ذلیل و بے توقیر واپس کریں، کیوں کہ آپ اپنی امت کے لیے سراپا رحمت بن کر تشریف لائے، وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ٥ (الانبیاء: ۲۱، آیت ۱۰۷) اور آپ جود وسخاوت کی کان اور اس کا اصل سرچشمہ ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ:

مَاقَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِيْ تَشَهُّدِهٖ — لَوْ لَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاءَهٗ نَعَمٖ (فرزدق)

نرفت لا بزبان مبارکش ہرگز — مگر بہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ (اقبال)

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا (امام احمد رضا)

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
دریا بہادیے ہیں، دُر بے بہا دیے ہیں (//)

حضور اکرم ﷺ سے استغاثہ اور آپ کے وسیلہ سے بارگاہِ الٰہی میں اپنی مقصد براری کے لیے دعا کرنا انبیا و مرسلین اور سلفِ صالحین کا ہمیشہ سے معمول رہا ہے، سرکارِ اقدس ﷺ کے اس خاک دان گیتی میں ظہور قدسی سے پہلے ہی انبیاے سابقین نے ان کے وسیلہ سے بارگاہِ خداوندی میں دعائیں کی ہیں اور آپ کی ظاہری حیات میں بھی صحابۂ کرام نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور آپ کے وصال کے بعد بھی اولیاے کاملین اور عامۂ مومنین میں اس کا رواج رہا ہے اور آج تک ہے اور کل میدان قیامت میں اہل ایمان سرکار کی بارگاہ میں استغاثہ اور استمداد کریں گے اور آپ ان کی فریادیں سن کر بارگاہِ الٰہی میں ان کے لیے شفاعت فرمائیں گے اور آپ ہی کی ذات سے شفاعت کا دروازہ کھلے گا، جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، یہی ہم اہل سنت و جماعت کا ہمیشہ سے مذہب رہا ہے، تفصیل کے لیے اسی کتاب کے مقدمہ میں ''قصیدۂ بردہ کا فکری تجزیہ'' کا عنوان دیکھیں۔

محاسن بلاغت: (۱) یُحْرِمُ اور مُحْتَرَم کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے (۲) اور ان میں سے ایک کے مصرع اول کے درمیان میں آنے اور دوسرے کے شعر کے آخر میں آنے سے صنعتِ رد العجز علی الصدر پیدا ہوئی۔

(۱۵۰)

وَمُنْذُ اَلْزَمْتُ اَفْكَارِيْ مَدَائِحَهُ
وَجَدْتُـهُ لِخَلَاصِيْ خَيْرَ مُلْتَزِمِ

ترجمہ: جب سے میں نے اپنے افکارِ سخن کو نعتِ نبوی لکھنے کا پابند بنالیا، اپنی نجات کے لیے سرکار کو بہترین کفیل پایا۔

لغات: اَلْزَمْتُ: لازم کرنا، پابند بنانا۔ اَفْكَار: فکر کی جمع، مراد افکار سخن، نظم اشعار کے تعلق

سے غور وفکر. مَدَائِح: مَدِيْحَة کی جمع، مدح وستائش، تعریف، مراد نعتِ پاک ہے.
خَلاص: (مصدر، ن) چھٹکارا، نجات. مُلْتَزِم: اسم فاعل از التزام، کفیل، ضامن. یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مُلْتَزَم اسم ظرف ہو بمعنی جائے پناہ، پناہ گاہ۔

تشریح: یعنی جب سے میں نے شاہانِ وقت اور اُمرائے زمانہ کی مدح سرائی چھوڑ کر سرکارِ اقدس ﷺ کی نعتِ پاک لکھنے اور ان کی مدح وثنا کرنے کو اپنا مشغلہ بنایا اس کی برکت سے دنیا کی مصیبتیں دور ہوگئیں، اس طرح مصائب وآلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میں نے سرکارِ دو جہاں ﷺ کو سب سے بہترین ضامن وکفیل پایا۔

اس شعر میں امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اس واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے جو اس نعتیہ قصیدہ کے لکھنے کا باعث بنا تھا، واقعہ یہ ہے کہ آپ کے جسم پر فالج کا اثر ہوگیا تھا جس نے آپ کو مفلوج بنا کر رکھ دیا تھا، وقت کے ماہر اَطِبّا اور حُکَما اس کے علاج سے عاجز آگئے تھے، اس وقت آپ نے یہ مبارک قصیدہ لکھا اور اس کے وسیلے سے بارگاہِ خداوندی میں شفا کی درخواست کی، رات کو سوئے تو قسمت بیدار ہوگئی اور خواب میں سرکارِ اقدس ﷺ کا دیدار ہوا، آپ نے خواب ہی میں یہ نعتیہ قصیدہ سرکار کو سنایا جس پر سرکار اتنے خوش ہوئے کہ اپنی مبارک چادر ان کو اڑھا دی اور ان کے جسم پر اپنا دستِ شفا پھیر دیا، جس کی برکت سے آپ بالکل صحت مند ہوگئے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں "اَلْزَمتُ" اور "مُلْتَزِم" کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے (۲) اور اس میں صنعتِ ردالعجز علی الصدر بھی ہے۔

وَلَنْ يَّفُوْتَ الْغِنىٰ مِنْهُ يَداً تَرِبَتْ
(۱۵۱) اِنَّ الْحَيَا يُنْبِتُ الْاَزْهَارَ فِي الْاَكَمِ

ترجمہ: آپ کی عطا و بخشش کسی محتاج کے ہاتھ کو خالی نہ چھوڑے گی، کیوں کہ بارش پہاڑیوں پر پھول اگا دیتی ہے۔

لغات: لَنْ یَفُوْتَ :فعل مضارع منصوب بلن از فَاتَ الشَّیْئُ فَوْتاً وَفَوَاتاً (ن): تجاوز کرنا، آگے بڑھ جانا. اَلْغِنیٰ: تونگری، مالداری، مراد عطاؤ بخشش. تَرِبَتْ: فعل ماضی معروف از باب سمع، تَرِبَ الشَّیْئُ تَرَبًا :خاک آلود ہونا، تَرِبَ الرَّجُلُ تَرَباً وَ مَتْرَباً محتاج ہونا اور اسی سے ہے: تَرِبَ بَعْدَ اَنْ اَتْرَبَ یعنی وہ مال دار ہونے کے بعد محتاج ہو گیا. اَلْحَیَا: بارش. اَلْاَکَمْ اَکَمَۃٌ کی جمع، ٹیلہ، چھوٹی پہاڑی (ج) اَکَامٌ وَ اُکُمٌ وَ اٰکَامٌ۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا فیض رحمت اور فیضانِ شفاعت عام ہے، اس سے سب گنہ گار امتی بہرہ ور ہوں گے، مستحق ہوں یا غیر مستحق، کیوں کہ آپ کا فیضِ بخشش تیز بارش کی مانند ہے اور جب تیز بارش ہوتی ہے تو صرف ہموار زمینیں ہی پھول اور پودے نہیں اگاتی ہیں بلکہ پہاڑیوں اور ٹیلوں پر بھی سبزے اگتے ہیں اور کوہستان بھی لالہ زار بن جاتے ہیں۔

باراں کہ از لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ رُوئید ودر شورہ بوم خس

(شیخ سعدی شیرازی)

لہٰذا اگر اعمال کے لحاظ سے ہمارا وجود پہاڑی پتھروں کی طرح سخت اور ناقابل روئیدگی ہے جب بھی سرکار کی بارش رحمت اور آپ کا فیضان کرم اسے محروم نہ چھوڑے گا۔

برستا نہیں دیکھ کر ابر رحمت

بدوں پر بھی برسا دے برسانے والے　　(امام احمد رضا بریلوی)

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں تشبیہِ ضمنی ہے اور تشبیہِ ضمنی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ کو تشبیہ کے عام، معروف اور رائج طریقوں میں سے کسی صورت میں نہیں پیش کیا جاتا ہے بلکہ ایک بات بطور دعویٰ کہی جاتی ہے جس میں مشبہ کا ذکر ہوتا ہے، پھر دوسری بات دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے جس میں مشبہ بہ کا اشارتاً ذکر ہوتا ہے، اس طرح اس تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ صراحتاً مذکور نہیں ہوتے بلکہ ان کا ذکر اشارتاً وضمناً ہوتا ہے، مزید تشریح کے لیے اسی کتاب کے مقدمہ میں ''بلاغی پیمائش'' کے عنوان کے تحت

ثنیہ ضمنی'' کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

وَلَمْ أُرِدْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا الَّتِي اقْتَطَفَتْ

(۱۵۲)

يَدَا زُهَيْرٍ بِمَا أَثْنَى عَلَى هَرِمِ

ترجمہ: میں (اس نعتیہ قصیدہ کے ذریعے) دنیوی مال ومتاع کا خواہاں نہیں جسے زُہیر بن ابی سُلمیٰ نے ہَرِم بن سِنان کی مدح سرائی سے حاصل کیا تھا۔

لغت: لَمْ أُرِدْ: میرا ارادہ اور میری خواہش نہیں۔ زَهْرَةَ الدُّنْيَا: دنیا کی رونق وخوبی، مراد دنیوی مال ومتاع، ویسے زهرة کا اصل معنی ہے کلی، شگوفہ (ن) اَزْهَرَ وَاَزْهَارٌ وَزُهُورٌ. اِقْتَطَفَتْ ماضی معروف از اقتطاف بمعنی چننا، جمع کرنا، حاصل کرنا. زُهَيْر: زہیر بن ابی سلمیٰ، زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر. هَرِمْ: مراد ہرم بن سنان المری. بِمَا: با برائے سببیت ہے اور ما موصولہ ہے یا مصدریہ. اَثْنیٰ: مدح وثنا کی، تعریف کی۔

تشریح: زہیر بن ابی سلمیٰ جاہلی شعرا میں انتہائی بلند حیثیت کا مالک تھا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسے ''اَشْعَرُ النَّاسِ'' (لوگوں میں سب سے بڑا شاعر) قرار دیتے تھے، ثعلب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اپنی سند کے ساتھ روایت کی کہ حضرت ابن عباس نے کہا کہ مجھ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اَنْشِدْنِي اَشْعَرَ شُعَرائِكُم (مجھے اپنے سب سے بڑے شاعر کے اشعار سناؤ) میں نے کہا وہ کون ہے؟ فرمایا: وہ زہیر ہے، ابن اعرابی نے کہا کہ زہیر کی ایک امتیازی خصوصیت ہے جو اس کے سوا کسی اور شاعر میں نہیں پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا باپ بھی شاعر، اس کا ماموں بھی شاعر، اس کی دونوں بہنیں سلمیٰ اور خنسا بھی شاعرہ اور اس کے دونوں بیٹے کعب اور بُجَیر بھی شاعر تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ دور جاہلیت کا سب سے بڑا شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ تھا اور دورِ اسلام کے سب سے بڑے شاعر اس کے بیٹے حضرت کعب رضی اللہ عنہ (صاحب قصیدۂ بانت سعاد) تھے۔ (عصیدۃ الشہدۃ، ص ۲۱۷)۔

یہ دنیوی مال ومتاع کی لالچ میں ہرم بن سنان بن حیانُ المری کی مدح میں قصیدے لکھا کرتا تھا اور وہ اسے خوب انعام واکرام سے نوازتا تھا، ہرم عرب کا مشہور سخی بادشاہ تھا، زہیر نے اس کی مدح میں کہا:

قِفْ بِالدِّیَارِ الَّتِي لَمْ یَعْفُهَا الْقِدَمُ بَلٰی وَغَیَّرَهَا الْاَرْوَاحُ وَالدِّیَمُ
اِنَّ الْبَخِیلَ مَلُوْمٌ حَیْثُ کَانَ وَلٰکِنَّ الْجَوَادَ عَلٰی عِلَّاتِهِ هَرِمُ
هُوَ الْجَوَادُ الَّذِي یُعْطِیکَ نَائِلَهُ عَفْواً وَیُظْلَمُ اَحْیَاناً فَیَنظَلِمُ
وَاِنْ اَتَاهُ خَلِیلٌ یَوْمَ مَسْغَبَةٍ یَقُوْلُ لَا غَائِبٌ مَالِي وَلَا حُرِمُ

- ان مکانات کے پاس ٹھہر جا جن کو کُہنگی (پرانا پن) مٹا نہ سکی، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہواؤں اور بارشوں نے ان کی صورت بدل دی ہے۔
- بخیل مستحقِ ملامت ہے جہاں بھی رہے، لیکن صحیح معنوں میں سخی اپنی کمزوریوں کے باوجود ہَرِم ہی ہے۔
- وہ ایسا سخی داتا ہے جو تم کو اپنے عطیے بے طلب دیتا ہے اور جب اس پر ظلم وزیادتی کی جاتی ہے تو اسے برداشت کر لیتا ہے۔
- اور اگر فاقہ اور تنگی کے وقت کوئی دوست اس کے پاس آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میری دولت نہ کم ہوئی ہے اور نہ ختم ہوئی ہے۔

امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اپنے اس شعر میں زہیر بن ابی سلمٰی کی اسی قصیدہ خوانی کا ذکر کیا ہے، آپ کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ یہ نعتیہ قصیدہ لکھنے سے میرا مقصد دنیوی مال و متاع کا حصول نہیں بلکہ میرا مقصدِ اصلی سرکار کی رضا وخوشنودی اور آپ کی قبولیت اور شفاعت ہے:

ثنائے سرکار ہے وظیفہ، قبولِ سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا، رَوِی تھی کیا کیسے قافیے تھے (امام احمد رضا بریلوی)

اسی مفہوم کو اردو کی ایک رباعی میں ادا کیا گیا ہے جو سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے:

مدح خوانی کے عوض لعل نہ گوہر لیں گے جس میں تسنیم چھلک جائے وہ ساغر لیں گے

اشک ٹپکا کے غم سبط نبی میں دو چار آنکھیں اس بات پہ مچلی ہیں کہ کوثر لیں گے

محاسن بلاغت: (۱) زَهْرَةَ الدُّنْيَا میں استعارۂ تصریحیہ اصلیہ ہے، کیوں کہ شاعر نے دنیوی مال و متاع اور اس کی فانی لذتوں کو کلی اور نا شگفتہ پھول سے تشبیہ دی ہے جس سے کوئی شخص ہمیشہ لطف اندوز نہیں ہو پاتا، بلکہ یہ بہت جلد ہی مرجھا جاتا ہے، یہی حال دنیوی مال و دولت کا بھی ہے کہ فرمایا گیا: اَلْمَالُ غَادٍ وَرَائِحٌ (یعنی مال صبح کو آتا ہے اور شام کو چلا جاتا ہے) اَلْمَالُ ظِلٌّ زَائِلٌ (مال ڈھلتی چھاؤں ہے) پھر شاعر نے مشبہ بہ کو صراحتاً ذکر کیا ہے اور یہاں ''اِقْتِطَاف'' کا ذکر کرنا ترشیح ہے۔

الفصل العاشر
في ذكر المناجات وعرض الحاجات

يَا اَكْرَمَ الْخَلْقِ مَالِيْ مَنْ اَلُوْذُ بِهٖ
سِوَاکَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ (۱۵۳)

ترجمہ: اے ساری خلقت میں سب سے افضل و برگزیدہ نبی! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں کہ بلائے عام کے نازل ہونے کے وقت میں جس کی پناہ لوں۔

لغات: اَکْرَمَ: سب سے افضل و برگزیدہ، یا کرم فرمانے والے. مَا: نافیہ ہے. اَلُوْذُ: میں پناہ لوں، فعل مضارع معروف، صیغہ واحد متکلم از لَا ذَ یَلُوْذُ لِوَاذاً بِالشَّیْیءِ بمعنی پناہ لینا. حُلُوْل: (مصدر، ن، ض) نازل ہونا. اَلْعَمَمْ عام، "الحادث العمم" سے مراد قیامت کی ہولناکیاں ہیں جو ساری مخلوق کو عام ہوں گی اور بعض شارحین نے کہا کہ اس سے مراد حادثۂ موت ہے، شارح خرپوتی نے اسی احتمال کو پہلے ذکر کیا ہے، حالاں کہ یہاں زیادہ واضح وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے، گو کہ یہ بھی درست ہے۔

تشریح: گزشتہ اشعار میں سرورِ کونین ﷺ کی صفاتِ ذات اور کمالاتِ صفات کو غائب کے صیغوں سے اتنی بار بیان کیا کہ سرکار کا تصور و خیال ذہن کے نہاں خانے میں رچ بس گیا اور دل و دماغ پر پوری طرح چھا گیا اور محسوس ہونے لگا کہ آپ سامنے تشریف فرما ہیں، تو طرزِ کلام اور پیرایۂ بیان بدل دیا اور غائب کی بجائے حاضر کے صیغوں سے آپ کو خطاب کرتے ہوئے یوں عرض کرنے لگے: اے ساری مخلوق میں سب سے برگزیدہ نبی! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں کہ قیامت کی ہولناکیوں کے وقت میں جس سے شفاعت کی آس لگاؤں اور ان مصائب سے نجات کے لیے میں جس کی پناہ میں آؤں، کیوں کہ کل میدان

محشر میں جب سارے انبیاے کرام اور پیغمبران اولوالعزم نفسی نفسی کہتے ہوں گے، کسی میں بھی اتنی ہمت وجرأت نہ ہوگی کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوکر عام مخلوق کی شفاعت کے لیے سلسلہ جنبانی کرے، ایسے آڑے وقت پر آپ بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوکر اذن شفاعت طلب کریں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت ہوگی تو آپ اپنی شفاعت کے ذریعہ گنہگار امتیوں کو ان زہرہ گداز پریشانیوں سے چھٹکارا دلائیں گے اور ان کے لیے مسرت وشادمانی کا سامان کریں گے۔

پیشِ حق مژدہ شفاعت کا سناتے جائیں گے
آپ روتے جائیں گے ہم کو ہنساتے جائیں گے

تو ایسے نازک وقت میں آپ کے سوا میری دست گیری کرنے والا کوئی نہیں۔

عام حالات میں بھی قرآن کریم نے گنہ گاروں کو اپنی بگڑی بنوانے کے لیے سرکار کی جانب رجوع کرنے اور اپنی دعاؤں میں آپ کو وسیلہ بنانے کی تعلیم دی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۝ (النساء: ۴/۶۴)

(اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں، پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے)۔

مفسر قرآن صدر الا فاضل علامہ محمد نعیم مرادآبادی علیہ الرحمہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہِ الٰہی میں رسول اللہ ﷺ کا وسیلہ اور آپ کی شفاعت کار براری کا ذریعہ ہے، سید عالم ﷺ کی وفات شریف کے بعد ایک اعرابی روضۂ اقدس پر

حاضر ہوا اور روضہ شریف کی خاک پاک اپنے سر پر ڈالی اور عرض کرنے لگا: یا رسول اللہ! جو آپ نے فرمایا ہم نے سنا اور جو آپ پر نازل ہوا اس میں یہ آیت بھی ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا الخ میں نے بے شک اپنی جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے حضور میں اللہ سے اپنے گناہ کی بخشش چاہنے حاضر ہوا ہوں، تو میرے رب سے میرے گناہ کی بخشش کرائیے، اس پر قبر شریف سے ندا آئی کہ تیری بخشش کی گئی۔ اس سے چند مسائل معلوم ہوئے۔ مسئلہ (۱): اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض حاجت کے لیے اس کے مقبولوں کو وسیلہ بنانا ذریعہ کامیابی ہے۔ مسئلہ (۲): قبر پر حاجت کے لیے جانا بھی "جَاءُوْكَ" میں داخل اور خیر القرون کا معمول ہے۔ مسئلہ (۳): بعد وفات مقبولان حق کو "یَا" کے ساتھ ندا کرنا جائز ہے۔ مسئلہ (۴): مقبولان حق مدد فرماتے ہیں اور ان کی دعا سے حاجت روائی ہوتی ہے (تفسیر خزائن العرفان بر ترجمہ کنز الایمان)۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان ایک نعت شریف میں فرماتے ہیں:

شرِ خیر، شور سُور، شرر دور، نار نور ‏ ‏ بشریٰ کہ بارگاہ یہ خیر البشر کی ہے

مجرم بلائے آئے ہیں جاؤک ہے گواہ ‏ ‏ پھر رد ہو کب یہ شان کریموں کے در کی ہے

بد ہیں مگر انہیں کے ہیں، باغی نہیں ہیں ہم ‏ ‏ نجدی نہ آئے اس کو یہ منزل خطر کی ہے

بے ان کے واسطے کے خدا کچھ عطا کرے ‏ ‏ حاشا غلط غلط یہ ہوس بے بصر کی ہے

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں صنعتِ التفات من الغیبة الیٰ الخطاب ہے جیسا کہ اس شعر کی تشریح سے واضح ہو چکا ہے۔

(۱۵۴)

وَلَنْ يَّضِيقَ رَسُوْلَ اللّٰهِ جَاهُكَ بِيْ
اِذَ الْكَرِيْمُ تَجَلّٰى بِاسْمِ مُنْتَقِمِ

ترجمہ: یا رسول اللہ آپ کی قدر و منزلت اس دن میرے لیے تنگ نہ ہو گی جب کہ رب

کریم صفت ''منتقم'' کے ساتھ جلوہ فرما ہوگا۔

لغات: رَسُوْلَ اللّٰہِ: یہ منادیٰ ہے جس کا حرفِ ندا محذوف ہے، یعنی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔
اَلْجَاہُ: وجاہت، قدر و منزلت، شرف و بلندی، مراد مرتبہ کی وسعت اور کشادگی،
''جَاھُکَ'' لَنْ یَّضِیْقَ کا فاعل ہے۔ تَجَلّی: جلوہ گر ہوا۔ مُنْتَقِمْ: انتقام لینے والا۔

تشریح: جس دن اللہ تعالیٰ صفتِ منتقم کے ساتھ جلوہ فرما ہوگا اس سے مراد قیامت کا دن ہے اور صفتِ منتقم کے ساتھ جلوہ فرما ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں اور گنہ گاروں سے انتقام لے گا اور انہیں ان کے کرتوتوں کی سزا دے گا، اس شعر کے آخری مصرع میں لفظِ ''تَجَلّٰی'' جیم مفتوح کے ساتھ ہے، جس کے معنی ہیں آراستہ ہونا، متصف ہونا، علامہ شیخ ابراہیم باجوری علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ روایت کے لحاظ سے ''تَحَلّٰی'' حائے مفتوح کے ساتھ زیادہ صحیح ہے لیکن درایت کے لحاظ سے تَجَلّٰی زیادہ قرین قیاس اور صورت حال کے زیادہ مطابق ہے۔

اس شعر پر بظاہر کئی اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں:

اعتراض (۱): اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں، حادث نہیں ہیں کہ کسی زمانے کے ساتھ خاص ہوں، لہٰذا اس صفت کو قیامت کے دن اور مستقبل کے زمانے کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے۔

جواب: حضرت بوصیری علیہ الرحمہ نے یہ گفتگو حضرت امام ابوالحسن اشعری علیہ الرحمہ کے اصول پر کی ہے اور انہیں کا مذہب اہل سنت و جماعت کے نزدیک پسندیدہ اور راجح ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کریم اور منتقم صفاتِ فعلیہ ہیں اور صفاتِ فعلیہ حادث ہیں، قدیم نہیں ہیں اور حادث کا تعلق کسی نہ کسی زمانہ سے ہوتا ہے۔

اعتراض (۲): کریم کا معنی ہے مہربانی کرنے والا، کرم فرمانے والا اور منتقم کا معنی ہے انتقام لینے والا، سزا دینے والا، یہ دونوں متضاد صفتیں ہوئیں، تو یہ دونوں ایک ساتھ کیوں کر

پائی جائیں گی؟ کیوں کہ اجتماع متضادین اور اجتماع نقیضین محال و ناممکن ہے۔
جواب: کریم سے مراد یہ ہے کہ اس صفت کے ساتھ بالقوۃ متصف ہو، اس لحاظ سے کریم کا معنی ہے وہ ذات جس کی شان یہ ہو کہ وہ خطا کاروں کے ساتھ مہربانی کا معاملہ فرمانے اور ان کی خطائیں درگزر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور ''منتقم'' سے مراد وہ ہے جو صفتِ انتقام کے ساتھ بالفعل متصف ہو اور جب قوت اور فعل کا فرق ہو گیا تو اجتماع متضادین اور اجتماع نقیضین نہ ہوا، اس لحاظ سے اس جملہ کا مفہوم یہ ہوا کہ جس دن خطا کاروں کے ساتھ مہربانی کرنے اور ان کی خطائیں معاف کرنے کی قدرت رکھنے والا خدا ان سے انتقام لے گا اور اس کی صفتِ منتقم خوب ظاہر اور آشکارا ہوگی۔

اب شعر کا حاصل یہ ہوا کہ یا رسول اللہ! قیامت کے دن جب ربِ کریم کی صفت منتقم کی تجلی اور ظہور کا دن ہوگا، گناہ گار عذابِ جہنم کے خوف سے کانپ رہے ہوں گے اس دن آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور جو قدر و منزلت اور شرفِ تقرُّب حاصل ہے اس کا دائرہ ہرگز اتنا تنگ نہیں ہوگا کہ مجھ جیسے گناہ گار کو اپنی آغوش شفاعت میں نہ لے سکے، کیوں کہ آپ کو بارگاہِ خداوندی سے وہ وسیع اور بلند مرتبہ حاصل ہے جو میں کیا، مجھ جیسے لاکھوں، کروروں گنہ گاروں کو بہ آسانی اپنی آغوش شفاعت میں لے سکتا ہے، گویا آپ بارگاہِ رسالت میں عرض کر رہے ہیں: یا رسول اللہ!

ایک میں کیا مرے عصیاں کی حقیقت کتنی
مجھ سے سو لاکھ کو کافی ہے اشارا تیرا (امام احمد رضا)

گنہ رضا کا حساب کیا وہ اگرچہ لاکھ سے ہیں سوا
مگر اے عفو ترے عفو کا نہ حساب ہے نہ شمار ہے (امام احمد رضا)

حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی اسی مفہوم کو اپنی کتاب ''بوستاں'' کی ایک نعتِ پاک میں یوں ادا کرتے ہیں:

چہ کم گردد اے صدر فرخندہ پے　زقدرِ رفیعت بدرگاہِ حَیّ
کہ باشند مشتے گدایان خیل　بمہمان دارالسلامت طفیل

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں "رَسُوْلَ اللّٰہِ" میں ایجاز حذف ہے، کیوں کہ اس کی اصل ہے یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (۲) آخری مصرعہ میں کنایہ ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِکَ الدُّنْیَا وَ ضَرَّتَھَا
(۱۵۵)
وَمِنْ عُلُوْمِکَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

ترجمہ: کیوں کہ دنیا و آخرت آپ کی بخشش و عطا کا اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے۔

لغات: الضَرَّۃُ: سوتن (ج) ضَرَائِر. ضَرَّۃُ الدُّنْیَا: دنیا کی سوتن، اس سے مراد آخرت ہے، آخرت کو دنیا کی سوتن اس لیے کہا کہ جس طرح عام حالات میں دو سوتنوں کو یکجا رکھنا سخت دشوار ہے اسی طرح دنیا و آخرت کو بھی ایک ساتھ جمع کرنا انتہائی دشوار ہے، اسی لیے حدیث پاک میں آیا ہے:

مَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَہٗ اَضَرَّ بِدُنْیَاہُ وَ مَنْ اَحَبَّ دُنْیَاہُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِہٖ.

(جو آخرت سے محبت کرتا ہے وہ اپنی دنیا کا نقصان کرتا ہے اور جو دنیا کو چاہتا ہے وہ آخرت کا نقصان کرتا ہے)۔

اس تعلق سے عربی کے درج ذیل اشعار بھی پڑھیے:

عَتَبْتُ عَلَی الدُّنْیَا لِتَاْ خِیْرِ عَالِمٍ　وَتَقْدِیْمِ ذِیْ جَھْلٍ فَقَالَتْ خُذِ الْعُذْرٰی
بَنُو الْجَھْلِ اَوْلَادِیْ لِذَاکَ رَفَعْتُھُمْ　وَ اَھْلُ النُّھٰی اَوْلَادُ ضَرَّتِیَ الْاُخْرٰی

(میں نے دنیا پر اس وجہ سے ناراضی اور خفگی کا اظہار کیا کہ وہ عالم کو پیچھے کرتی ہے اور جاہل کو آگے بڑھاتی ہے، تو اس نے کہا اس سلسلے میں میری مجبوری مانیے، جاہل میری اولاد ہیں، اسی لیے میں نے انہیں بلندی دی اور اہل علم و دانش میری سوتن آخرت کی اولاد ہیں)۔

تشریح: یہ شعر معنوی حیثیت سے گزشتہ شعر سے مربوط ہے، گزشتہ شعر میں امام بوصیری علیہ الرحمہ نے بارگاہِ رسالت میں یوں استغاثہ کیا ہے: یا رسول اللہ! قیامت کے دن جب کہ رب کریم صفتِ منتقم کے ساتھ جلوہ گر ہوگا، نفسی نفسی کا عالم ہوگا، گناہ گار عذابِ جہنم کے خوف سے کانپ رہے ہوں گے، اس دن آپ کو بارگاہِ الٰہی میں جو عزت و وجاہت اور رتبۂ شفاعت حاصل ہے کہ اس کا دائرہ اتنا تنگ نہ ہوگا کہ مجھ جیسے گناہ گار کو اپنی آغوش میں نہ لے سکے، اور اس شعر میں اسی کی وجہ اور علت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: کیوں کہ دونوں جہان آپ کے طفیل وجود میں آئے ہیں اور آپ موجودات پر فیضان وجود اور ہر نعمت ظاہری و باطنی میں واسطہ ہیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر علوم کثیرہ عطا کیے ہیں کہ لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک جز اور ایک حصہ ہے، اس قدر علم ہونا آپ کے رتبے کی عظمت و بزرگی کو عیاں کر رہا ہے، جب آپ کے رتبہ کی وسعت و عظمت کا یہ حال ہے تو پھر آپ کے لیے مجھ جیسے گنہ گار، خطاوار کی شفاعت کیا مشکل ہے؟

اس شعر میں ”سرکار کے علوم“ سے مراد وہ بے پایاں علوم و معارف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولین و آخرین کے سارے علوم عطا فرمائے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ وہ علوم عطا کیے ہیں جن کا تعلق اس دنیا سے نہیں بلکہ عالم آخرت سے ہے اور ”لوح و قلم کے علم“ سے وہ معلومات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے قلم نے لوح محفوظ میں لکھی ہیں، کیوں کہ حدیث میں ہے:

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اكْتُبْ، قال: وَمَا اَكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبْ مَقَادِيْرَ كُلِّ شَيْئٍ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ. (شرح الباجوری علی البردة، ص۷۶)

(سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا فرمایا اور اس سے کہا لکھ، قلم نے عرض کیا: کیا لکھوں؟ فرمایا: قیامت قائم ہونے تک ہر چیز کی تقدیریں لکھ)۔

حضرت شیخ اکبر محی الدین بن عربی فرماتے ہیں:

اعلم ان اللّٰہ تعالیٰ لما تجلیٰ للقلم اشتق منه موجود آخر سماه اللوح، و امر القلم أن يتدلیٰ اليه و يودع فيه جميع ما يكون الیٰ يوم القيامة.

(جب اللہ تعالیٰ نے قلم پر اپنی تجلی فرمائی تو اس سے ایک اور شے وجود میں آئی جس کا نام "لوح" رکھا اور قلم کو حکم دیا کہ وہ لوح کے قریب جائے اور قیامت تک ہونے والی ساری چیزوں کا علم اس میں لکھ دے)۔

امام عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب "اليواقيت والجواهر فی عقائد الاكابر" میں لکھتے ہیں:

"اگر کوئی سوال کرے کہ قلم نے لوح محفوظ میں قیامت تک رونما ہونے والے واقعات وحوادث لکھے ہیں، کیا ان کی تعداد اولیاے کرام میں سے کسی کو معلوم ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب "الفتوحات المکیہ" کے باب نمبر ۱۶۸ میں لکھا ہے:

نعم: أنا ممن أطلعه اللّٰه علیٰ ذلک.

(ہاں! خود میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی اطلاع دی ہے)۔

اور شیخ اکبر نے مزید یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے علوم ام الکتاب کے اصل علوم سے مجھے باخبر فرمایا ہے، وہ ایک لاکھ، انتیس ہزار، چھ سو قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم میں کئی کئی علوم ہیں۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد حضرت علامہ شیخ عمر بن احمد خرپوتی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

ان اللّٰه تعالیٰ أطلعه عليه السلام علی ما كتب القلم فی اللوح المحفوظ وزاده أيضا، لأن اللوح والقلم متناهيان فما فيهما متناهٍ، ويجوز إحاطة المتناهی بالمتناهی، وقال شيخ زاده: هٰذا علی قدر فهمک وأما من اكتحلت عين بصيرته بالنور الالٰهي فيشاهد أن علوم اللوح والقلم جزء من

علومه كما هي جزء من علم الله تعالى، لأنه عليه السلام عند الانسلاخ عن البشرية كما لا يسمع ولا يبصر و لا يبطش ولا ينطق إلا به جلت قدرته وعمت نعمته، كذلك لا يعلم إلا بعلمه الذي لا يحيطون بشيء منه إلا بما شاء، كما اشار إليه بقوله: وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ".

(عصیدۃ الشہدۃ وشرح شیخ زادہ،ص۲۲۹-۲۳۰)

(قلم نے لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو اس سے تو باخبر کیا ہی ہے، اس سے زیادہ کا بھی علم دیا ہے، کیوں کہ لوح وقلم متناہی اور محدود ہیں اور ان میں جو کچھ علوم ومعارف ہیں وہ بھی متناہی اور محدود ہیں اور ایک متناہی چیز دوسری متناہی چیز کا احاطہ کرسکتی ہے۔ شیخ زادہ حضرت علامہ محی الدین محمد بن مصطفےٰ علیہ الرحمہ نے لکھا ہے: یہ ساری گفتگو تمہاری فہم ودانش کے لحاظ سے ہے، رہ گیا وہ شخص جس کے چشم بصیرت میں نورِ الٰہی کا سرمہ لگا ہوا ہے وہ خود مشاہدہ کرتا ہے کہ لوح وقلم کے علوم، سرکار اقدس ﷺ کے علوم کا ایک حصہ ہیں، جس طرح وہ علم الٰہی کا ایک حصہ ہیں، کیوں کہ لباس بشریت سے نکل جانے پر جس طرح آپ کا سننا، دیکھنا، پکڑنا اور گفتگو کرنا صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت ہی کے سہارے ہوتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کے اس علم ہی سے آپ کو علم ہوتا ہے جس میں سے لوگ اتنا ہی پاتے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ چاہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر اس نکتے کی جانب اشارہ فرمایا ہے: "اور اس نے تمہیں سکھادیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے")۔

سوال: لوح وقلم کے علم کو سرکار اقدس ﷺ کے علوم کا جزو قرار دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے، جب کہ لوح محفوظ میں ان پانچ غیبی باتو کا علم بھی موجود ہے جن کا ذکر سورۂ لقمان کی آخری آیتوں میں کچھ اس طرح ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَداً وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (لقمان:۳۴)

(بے شک اللہ کے پاس ہے قیامت کا علم، وہ بارش اتارتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹ میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ جاننے والا، بتانے والا ہے)۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا علم اپنے لیے خاص فرمایا ہے تو لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ساری باتوں کا جاننا ہی کسی مخلوق کے لیے ممکن نہیں، کسی کے علوم کا جز ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

جواب: اولاً تو ہمیں یہ تسلیم ہی نہیں کہ ان پانچ چیزوں کا علم قلم نے لوح محفوظ میں تحریر کیا ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے وہ خاص بندے بھی ان پر مطلع ہوں گے جو لوح محفوظ سے باخبر ہوتے ہیں، جیسے بعض ملائکہ مقربین۔

اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ غیوب خمسہ بھی لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ سرکار کے بے پایاں علوم کا جز لوح وقلم کا وہ علم ہے جس سے مخلوق واقف ہوسکتی ہے اور چوں کہ یہ پانچوں چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی مخلوق باخبر ہوسکے، اس لیے یہ علوم مصطفیٰ کا بھی جز نہیں۔

یہ جواب دینے کے بعد حضرت علامہ شیخ ابراہیم باجوری علیہ الرحمۃ والرضوان نے بڑا ایمان افروز جملہ تحریر فرمایا ہے جو اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے، لکھتے ہیں:

علیٰ أنه صلی اللّٰه علیه وسلم لم یخرج من الدنیا الاّ بعد أن أعلمه اللّٰه تعالیٰ بهٰذه الأمور. (شرح الباجوری علی البردہ، ص۷۶)

(علاوہ ازیں سچی بات تو یہ ہے کہ سرورِ عالم ﷺ اس کے بعد ہی دنیا سے تشریف لے گئے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان چیزوں کا بھی علم عطا فرما دیا تھا)۔

اس موقع پر میں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ سورۂ لقمان کی مذکورہ بالا آیت کے تعلق سے مفسرین کرام کے ارشادات اور جمہور اہل سنت و جماعت کے عقیدہ کا خلاصہ مفسر قرآن

صدرالافاضل حضرت علامہ محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کے مختصر اور جامع الفاظ میں پیش کردوں، آپ اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں جن پانچ چیزوں کے علم کی خصوصیت اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ بیان فرمائی گئی انہیں کی نسبت سورۂ جن میں ارشاد ہوا: عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًاۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (یعنی اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے تو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے) غرض یہ کہ بغیر اللہ تعالیٰ کے بتائے ان چیزوں کا علم کسی کو نہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں میں جسے چاہے بتائے اور اپنے پسندیدہ رسولوں کو بتانے کی خبر خود اس نے سورۂ جن میں دی ہے، خلاصہ یہ کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور انبیا واولیا کو غیب کا علم اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے بطریق معجزہ وکرامت عطا ہوتا ہے، یہ اس اختصاص کے منافی نہیں اور کثیر آیتیں اور حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں، بارش کا وقت اور حمل میں کیا ہے اور کل کو کیا کرے گا اور کہاں مرے گا؟ ان امور کی خبریں بکثرت اولیا وانبیا نے دی ہیں اور قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں نے حضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی اور حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی اور حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی خبریں دیں تو ان فرشتوں کو بھی پہلے سے معلوم تھا کہ ان حملوں میں کیا ہے اور ان حضرات کو بھی جنہیں فرشتوں نے اطلاعیں دی تھیں اور ان سب کا جاننا قرآن کریم سے ثابت ہے، تو آیت کے معنی قطعاً یہی ہیں کہ بغیر اللہ تعالیٰ کے بتائے کوئی نہیں جانتا، اس کے یہ معنی لینا کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بھی کوئی نہیں جانتا، محض باطل اور صدہا آیات واحادیث کے خلاف ہے۔ (خازن، بیضاوی، احمدی، روح البیان وغیرہ)

(تفسیر خزائن العرفان بر ترجمۂ کنز الایمان)

سوال: جب لوح وقلم کا علم، علوم مصطفیٰ کا جز ہے تو اس کے سوا سرکار کے اور علوم کیا ہیں؟

جواب: لوح وقلم کے علاوہ سرکارِ مصطفیٰ ﷺ کے اور علوم وہ ہیں جو احوال آخرت سے متعلق ہیں، کیوں کہ لوح محفوظ میں تو صرف قیامت تک رونما ہونے والے واقعات کے احوال وکوائف درج ہیں، جیسا کہ حدیثِ پاک سے ثابت ہے (شرح الباجوری)، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو آخرت کے بے شمار احوال وکوائف کا بھی علم عطا فرمایا ہے، جس کی حد بندی کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں، مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ دینے والا خدا جانے اور لینے والے مصطفیٰ جانیں کہ کیا کیا علوم ومعارف بارگاہِ الٰہی سے انہیں عطا ہوئے۔

حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمہ والرضوان اسی شعر کی تشریح کرتے ہوئے اپنی کتاب ''الزبدة العمدة في شرح البردة'' میں فرماتے ہیں:

وكون علومهما من علومه ﷺ أن علومه تتنوع إلىَ الكليات والجزئيات وحقائق ودقائق وعوارف ومعارف تتعلق بالذات والصفات، وعلمهما يكون سطراً من سطور علمه و نهراً من بحور علمه صلى الله تعالىٰ عليه و اله وسلم.

(اور لوح وقلم کے علوم ومعارف حضور اکرم ﷺ کے علوم کے بعض اس لیے ہیں کہ آپ کے علوم، کلیات وجزئیات اور ان حقائق ومعارف میں منقسم ہیں جن کا تعلق ذات اور صفات سے ہے، لہٰذا لوح وقلم کا علم سرکار کے علم کی سطروں میں سے ایک سطر اور آپ کے علم کے سمندروں کی ایک نہر ہے)۔

حضرت علامہ شیخ اسماعیل حقی علیہ الرحمہ والرضوان اپنی کتاب تفسیر روح البیان میں لکھتے ہیں:

قال شيخنا العلامة ــ أبقاه الله بالسلامة ــ في الرسالة الرحمانية في بيان الكلمة الفرقانية: علم الأولياء من علم الأنبياء بمنزلة قطرة من سبعة أبحر، وعلم

سوال: جب لوح وقلم کا علم، علوم مصطفیٰ کا جز ہے تو اس کے سوا سرکار کے اور علوم کیا ہیں؟
جواب: لوح وقلم کے علاوہ سرکارِ مصطفیٰ ﷺ کے اور علوم وہ ہیں جو احوال آخرت سے متعلق ہیں، کیوں کہ لوح محفوظ میں تو صرف قیامت تک رونما ہونے والے واقعات کے احوال وکوائف درج ہیں، جیسا کہ حدیثِ پاک سے ثابت ہے (شرح الباجوری)، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو آخرت کے بے شمار احوال وکوائف کا بھی علم عطا فرمایا ہے، جس کی حد بندی کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں، مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ دینے والا خدا جانے اور لینے والے مصطفیٰ جانیں کہ کیا کیا علوم ومعارف بارگاہِ الٰہی سے انہیں عطا ہوئے۔

حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمہ والرضوان اسی شعر کی تشریح کرتے ہوئے اپنی کتاب ''الزبدة العمدة في شرح البردة'' میں فرماتے ہیں:

وكون علومهما من علومه ﷺ أن علومه تتنوع إلى الكليات والجزئيات وحقائق ودقائق وعوارف ومعارف تتعلق بالذات والصفات، وعلمهما يكون سطراً من سطور علمه و نهراً من بحور علمه صلى الله تعالىٰ عليه و اله وسلم.

(اور لوح وقلم کے علوم ومعارف حضور اکرم ﷺ کے علوم کے بعض اس لیے ہیں کہ آپ کے علوم، کلیات وجزئیات اور ان حقائق ومعارف میں منقسم ہیں جن کا تعلق ذات اور صفات سے ہے، لہٰذا لوح وقلم کا علم سرکار کے علم کی سطروں میں سے ایک سطر اور آپ کے علم کے سمندروں کی ایک نہر ہے)۔

حضرت علامہ شیخ اسماعیل حقی علیہ الرحمہ والرضوان اپنی کتاب تفسیر روح البیان میں لکھتے ہیں:

قال شيخنا العلامة ـ أبقاه الله بالسلامة ـ في الرسالة الرحمانية في بيان الكلمة الفرقانية: علم الأولياء من علم الأنبياء بمنزلة قطرة من سبعة أبحر، وعلم

الأنبیاء من علم نبینا محمد علیه الصلاة والسلام بهٰذه المنزلة وعلم نبینا من علم الحق سبحانهٗ بهٰذه المنزلة. (روح البیان، ج ،ص ۳۷۵)

(ہمارے شیخ نے (اللہ تعالیٰ انہیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھے) رسالہ رحمانیہ کے اندر کلمہ فرقانیہ کے بیان میں فرمایا: اولیاء اللہ کا علم انبیاے کرام کے علم کے مقابلے میں ایسا ہی ہے، جیسے سات سمندروں کے سامنے ایک قطرہ اور انبیاے کرام کا علم ہمارے نبی ﷺ کے علم کے سامنے اسی درجہ کا ہے اور ہمارے نبی ﷺ کا علم حق سبحانہٗ تعالیٰ کے علم کے سامنے اسی درجہ کا ہے)۔

اور سرکار اقدس ﷺ کی وسعتِ علمی کے بارے میں کثیر احادیث مروی ہیں، جب بات آ ہی گئی ہے تو آپ بھی کچھ حدیثیں سن لیجئے اور سرورِ کونین ﷺ کے علوم و معارف کی وسعت اور کثرت کے جلووں سے اپنے قلب و نظر کو جلا بخشیے:

(۱) عن طارق بن شهاب، قال: سمعتُ عمر -رضی اللّٰه تعالیٰ عنه- یقول: قام فینا النبي - صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم - مقاما فأخبرنا عن بدء الخلق حتیٰ دخل أهل الجنة منازلهم وأهل النار منازلهم، حفظ ذلک من حفظهٗ و نسیهٗ من نسیهٗ.

(صحیح البخاری، مشکوۃ المصابیح، ص ۵۰۶، مطبوعۂ مجلس برکات، مبارک پور)

(حضور ﷺ نے ہمارے درمیان قیام فرما کر سب مخلوقات کی ابتدا سے لے کر جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے تک کی تمام خبریں دیں، یاد رکھا جس نے یاد رکھا اور بھلا دیا جس نے بھلا دیا)۔

(۲) عن ثوبان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰه ﷺ: إن اللّٰه زوی لي الأرض، فرأیتُ مشارقها ومغاربها. (صحیح مسلم و مشکوۃ، باب فضائل سید المرسلین، ص ۵۱۲، مطبوعہ مجلس برکات)

(حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین سمیٹ دی تو میں نے اس کے مشرقوں اور مغربوں کو دیکھ لیا)۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، شرح شفالملاعلی قاری، زرقانی شرح مواہب اورنسیم الریاض شرح شفامیں ہے:

وحاصلهٗ أنه طویٰ لهٗ الارض وجعلها مجموعة کهیئة کف فیه مراۃ ینظر إلیٰ جمعها وطواها بتقریب بعیدها إلیٰ قریبها حتیٰ اطلعتُ علیٰ ما فیها.

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے لیے زمین سمیٹ دی اور اسے اس طرح جمع فرمادیا جیسے ہتھیلی جس میں آئینہ ہو جسے پورا کا پورا دیکھا جاسکتا ہو اور زمین کو اس طرح سمیٹا کہ دور والی کو قریب والی کے قریب کردیا، یہاں تک کہ زمین کی تمام چیزیں میں نے دیکھ لیں۔

(۳) وعن عمرو بن الأخطب الأنصاري قال: صلیٰ بنا رسول اللّٰه ﷺ یوما الفجر، وصعد المنبر فخطبنا حتیٰ حضرت الظهر، فنزل، فصلیٰ، ثم صعد المنبر فخطبنا حتیٰ حضرت العصر ثم نزل فصلیٰ ثم صعد المنبر فخطبنا حتیٰ غربت الشمس فأخبرنا بما هو کائن الیٰ یوم القیامة فأعلمُنا أحفظُنا. (صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۴۳)

(عمرو بن اخطب انصاری سے روایت ہے، کہا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہم کو فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر تشریف لے گئے تو ہمیں خطاب فرمایا، یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آ گیا تو منبر سے اترے اور نماز پڑھی، پھر منبر پر تشریف لے گئے اور ہمیں خطاب فرمایا، یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا، پھر نیچے اترے اور عصر کی نماز ادا کی، پھر منبر پر چڑھے اور ہمیں خطاب فرمایا، یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا، تو آپ نے ہمیں قیامت تک ہونے والی تمام چیزوں کی خبر دی، تو ہم میں سے بڑا علم والا وہ ہے جو سب سے زیادہ یاد رکھنے والا ہے)۔

(۴) عن عبدالرحمن بن عایش قال، قال رسول اللّٰه ـ صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم ـ رأیتُ ربي في أحسن صورة ، قال: فیم یختصم الملأ الأعلیٰ؟ قلتُ: أنت أعلم،

قال: فوضع كفهٗ بين كتفي فوجدتُ بردها بين ثديي فعلمتُ مافي السمٰوٰت والأرض ، وتلا "كَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَo". رواه الدارمي مرسلا والترمذي نحوهٗ (مشکوٰۃ المصابیح،ص ۶۹)

(حضرت عبدالرحمٰن بن عائش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب عزوجل کو بہترین صورت میں دیکھا، اس نے فرمایا: ملائکہ مقربین کس بات میں جھگڑا کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کی، مولا! تو خوب جانتا ہے، حضور فرماتے ہیں: پھر اس نے اپنا دستِ قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھ دیا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان پائی، تو مجھے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کا علم ہو گیا، پھر حضور نے آیت کریمہ تلاوت فرمائی: وَكَذٰلِكَ نُرِيْ الخ یعنی ایسے ہی ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملک دکھاتے ہیں اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں سے ہو جائے)۔

(۵) وعن ابي هريرة قال: جاء ذئب إلىٰ راعي غنم فأخذ منها شاةً فطلبهٗ الراعي حتى انتزعها منه، قال: فصعد الذئب علىٰ تل فأقعىٰ ، وقال: قدعمدت إلىٰ رزق رزقنيه الله أخذتهٗ ، ثم انتزعتهٗ مني، فقال الرجل: تالله إن رأيت كاليوم ذئبٌ يتكلم، فقال الذئب: أعجب من هذا رجل في النخلات بين الحرتين يخبركم بمامضى وبما هو كائنٌ بعدكم. رواه في شرح السنة.

(مشکوٰۃ، باب المعجزات، ج ۲، ص ۵۴۱)

(حضرت ابوہریرہ ﷺ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ ایک بھیڑیا بکریوں کے ایک چرواہے کے پاس آیا اور اس کی بکریوں میں سے ایک بکری دبوچ لی، تو چرواہے نے اسے تلاش کیا یہاں تک کہ اس نے بھیڑیے سے وہ بکری چھین لی، حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ وہ بھیڑیا اپنے مخصوص انداز میں ایک ٹیلہ پر جا بیٹھا اور کہنے لگا (اے چرواہے) اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک رزق عطا فرمایا تھا جس کو میں نے پالیا تھا تو نے مجھ سے جان بوجھ کر اسے چھین لیا،

چرواہا بولا میں نے آج کی طرح کبھی نہ دیکھا کہ بھیڑیا باتیں کر رہا ہے، بھیڑیے نے کہا کہ اس سے زیادہ حیرت انگیز حال اس (مقدس) انسان کا ہے جو کالے پتھر والے دو میدانوں کے درمیان نخلستان (مدینہ) میں ہے، وہ تمہیں گزشتہ اور آئندہ کی خبریں دیتا ہے۔

(۶) أخرج الطبراني عن ابن عمر قال، قال رسول الله ﷺ إن الله قد رفع لي الدنيا، فأنا أنظر إليها وإلىٰ ما هو كائن فيها إلىٰ يوم القيامة كأنما أنظر إلىٰ كفي هذه. (المواہب اللدنیہ مع شرح الزرقانی، ج۷، ص۲۳۴)

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے ساری دنیا کو پیش فرما دیا۔ تو میں اس دنیا کو اور اس میں قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اسے ایسے ہی دیکھ رہا ہوں جیسے میں اپنی اس ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں)۔

یہ نمونے کے طور پر چند احادیث کریمہ تھیں جو نذرِ قارئین کی گئیں اور جسے سرکار اقدس ﷺ کے علوم و معارف کی وسعتوں کے جلوے دیکھنے ہوں وہ مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ کی تصانیف اور فتاویٰ کا مطالعہ کرے، خاص طور سے "الدولة المكية بالمادة الغيبية" کو پڑھے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب اب تک منظرِ عام پر نہیں آئی۔

محاسن بلاغت: ضَرَّتُهَا (یعنی دنیا کی سوتن) سے بطور کنایہ آخرت مراد ہے۔

يَانَفسُ لَا تَقْنَطِيْ مِنْ زَلَّةٍ عَظُمَتْ
(۱۵۶) اِنَّ الْكَبَائِرَ فِي الْغُفْرَانِ كَاللَّمَمِ

ترجمہ: اے میرے نفس! تو کسی گناہِ کبیرہ کی بخشش سے مایوس نہ ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش کے آگے گناہِ کبیرہ کی حیثیت معمولی لغزشوں کی ہے۔

لغات: يَانَفْسُ: سین کے زیر کے ساتھ، یائے متکلم کی طرف مضاف ہے، اصل میں يانفسي تھا، یا کو حذف کر کے اس پر دلیل کے طور پر کسرہ باقی رکھا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ

یا نفس ہو، اس صورت میں ادغام ہوگی۔ **لَا تَقْنَطِي** تو مایوس نہ ہو، ناامید نہ ہو، فعل نہی، از **قَنِطَ قُنُوطًا وَ قَنَاطَةً** (س)۔ **زَلَّة** لغزش، غلطی، گناہ (ج) **زَلَّات**۔ **اَلْكَبَائِر** کبیرۃ کی جمع، مراد گناہِ کبیرہ۔ **اَللَّمَم** گناہِ صغیرہ۔

تشریح: جب شاعر کو اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں شدتِ خوف کے باعث اس کا نفس رحمت الٰہی سے ناامید نہ ہو جائے تو اس کو مخاطب کر کے اس کے لیے سامان تسکین مہیا کیا اور اسے یوں دلاسہ دیا کہ اے میرے نفس! الخ، شعر کا مفہوم یہ ہے کہ گناہ کبیرہ جن کی سزا بڑی سخت ہے اور جن سے ہر مومن کو پناہ مانگنی چاہیے اور ان سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، یہ اللہ تعالیٰ کی بخشش و کرم کے آگے ہیچ ہیں، جس طرح وہ غفور رحیم گناہِ صغیرہ بخش دے گا، گناہِ کبیرہ کی بخشش فرمادے گا، لہٰذا اے میرے خطا کار، سیہ کار نفس! اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

اس شعر میں آیتِ کریمہ "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا" کی جانب اشارہ ہے، (یعنی اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخش دے گا)۔

اس میں معتزلہ اور خوارج کا رد ہے، کیوں کہ ان کا مذہب یہ ہے کہ گناہِ کبیرہ کرنے والا ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، کبھی بخشا نہ جائے گا، معتزلہ کے نزدیک تو اس لیے کہ ایسا شخص نہ مومن رہ جاتا ہے اور نہ کافر ہوتا ہے، بلکہ اس کے لیے ایمان اور کفر کے درمیان ایک اور درجہ ہے، اس لیے اسے عذاب تو ہمیشہ ہوگا مگر کافر سے ہلکا عذاب ہوگا اور خوارج کے نزدیک گناہِ کبیرہ کرنے والا مومن نہیں رہتا بلکہ کافر ہو جاتا ہے اور اہل سنت و جماعت کا مذہب وہی ہے جسے امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اس شعر کے آخری مصرعے میں نظم کیا ہے۔

لَعَلَّ رَحْمَةَ رَبِّيْ حِيْنَ يَقْسِمُهَا (۱۵۷)
تَأْتِيْ عَلٰى حَسَبِ الْعِصْيَانِ فِي الْقِسَمِ

ترجمہ: امید ہے کہ میرا پروردگار جب اپنی رحمت تقسیم فرمائے گا تو وہ گناہ گاروں کے گناہ

کے مطابق حصوں میں آئے گی۔

لغات: لَعَلَّ: امید ہے، یہ ترجی کے لیے ہے. حَسَبُ: اندازہ، مقدار، مطابق. اَلْقِسَمُ: قِسْمَۃٌ کی جمع، حصہ، نصیب۔

تشریح: شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا دریائے رحمت جوش میں آئے گا اور وہ گناہ گاروں کے درمیان اپنی رحمت تقسیم کرنے پر آئے گا تو وہ ان کے گناہوں کے اندازے کے مطابق ان کے حصوں میں آئے گی، یعنی جس کا گناہ بڑا ہوگا اس کا حصہ رحمت بھی بڑا ہوگا اور جس کا گناہ چھوٹا ہوگا اس کا حصہ رحمت بھی چھوٹا ہوگا۔

خیال رہے کہ یہاں رحمت سے مراد وہ رحمتِ خاصہ ہے جو گناہ گاروں کو حاصل ہوگی، رحمتِ عامہ مراد نہیں، لہٰذا یہ اعتراض ہی جڑ سے ختم ہوگیا کہ جب رحمتِ خداوندی گناہوں کے اندازہ کے مطابق ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے اطاعت شعار اور فرماں بردار بندوں کو اس میں سے کچھ بھی حصہ نہ ملے گا۔

محاسن بلاغت: (۱) یَقْسِمُ اور اَلْقِسَمُ کے درمیان تجنیس اشتقاق ہے (۲) اور اس شعر میں صنعتِ رد العجز علی الصدر بھی ہے۔

(۱۵۸)

يَارَبِّ وَاجْعَلْ لِيْ رَجَائِيْ غَيْرَ مُنْعَكِسٍ
لَدَيْکَ وَاجْعَلْ حِسَابِيْ غَيْرَ مُنْخَرِمِ

ترجمہ: اے میرے پالنہار! تجھ سے وابستہ میری امید پلٹنے نہ پائے اور تجھ سے متعلق میرے حسن ظن میں کوئی رخنہ نہ آئے۔

لغات: وَاجْعَلْ: اس کا معطوف علیہ محذوف ہے، اصل عبارت یوں ہے: يَارَبِّيْ اِرْحَمْنِيْ وَاجْعَلْ رَجَائِيْ الخ اے میرے پروردگار مجھ پر رحم فرما اور تجھ سے وابستہ میری امید پلٹنے نہ پائے. رَجَائِيْ: میری امید. لَدَيْکَ: تیرے نزدیک. حِسَابُ: ظن، گمان. مُنْخَرِمْ: منقطع، ٹوٹ جانے والا۔

تشریح: ایک حدیث قدسی ہے: ''اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ'' یعنی میں اپنے بندے کی امید اور اس کے گمان کے مطابق اس سے معاملہ کرتا ہوں اور ایک دعاے ماثورہ میں یوں آیا ہے: اَللّٰھُمَّ قَدِ انْقَطَعَ الرَّجَاءُ اِلَّا اِلَیْکَ وَخَابَتِ الْاٰمَالُ اِلَّا فِیْکَ. بارالٰہا! میرا رشتۂ امید تیرے سوا ہر ایک سے کٹ چکا ہے اور تیری ذات سے وابستہ توقعات کے سوا ساری توقعات ناکام ہو چکی ہیں، انہیں احادیث کریمہ کے پیش نظر اپنے نعتیہ قصیدہ کے اختتام پر امام بوصیری علیہ الرحمہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں یوں عرض کرتے ہیں: مولا! تیری ذات سے جو امید میں نے باندھ رکھی ہے اس کے خلاف معاملہ میرے ساتھ نہ ہو اور تیری ذات سے وابستہ میرے حسن ظن میں کوئی رخنہ نہ آئے۔

(۱۵۹)

وَالْطُفْ بِعَبْدِکَ فِي الدَّارَیْنِ اِنَّ لَهٗ
صَبْراً مَّتیٰ تَدْعُهُ الْاَھْوَالُ یَنْھَزِمِ

ترجمہ: اور اپنے کمزور بندے کے ساتھ دونوں جہان میں لطف و کرم کا معاملہ فرما، کیوں کہ اس کا صبر ایسا کمزور ہے کہ ہولناکیوں کے مقابلہ میں شکست خوردہ ہو جائے گا۔

لغات: اُلْطُفْ: امر حاضر معروف از لَطَفَ بِهٖ وَلَهٗ لُطْفاً (ن): بمعنی کسی پر رحم کرنا، مہربانی کرنا، نرمی برتنا، اَللّٰهُ لَطِیْفٌ م بِعِبَادِهٖ: اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے. بِعَبْدِکَ: اپنے اس بندے کے ساتھ، اس میں اضافت عہدِ حضوری کے لیے ہے اور اس سے شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے. الدَّارَیْنِ: یہ دارٌ کا تثنیہ ہے، یعنی دونوں گھر، مراد دنیا اور آخرت. اَلْاَھْوَالُ: ھَوْل کی جمع، ہولناکیاں، خطرات. یَنْھَزِمْ: شکست کھا جائے گا، فعل مضارع معروف از اِنْھَزَمَ بمعنی شکست کھانا، ہارنا۔

تشریح: یہ شعر بھی گزشتہ شعر سے مربوط ہے اور دعا کا حصہ ہے، اس شعر میں امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اپنا ذکر وصفِ عبودیت (بندگی) سے کیا ہے اور اپنے آپ کو ''عبد'' (بندہ) کہا ہے، اس بنا پر کہ یہ دعا کا مقام ہے اور دعا کے وقت بندہ بارگاہِ الٰہی میں جتنا زیادہ

عاجزی کا اظہار کرتا ہے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور عنایتیں اس کی جانب متوجہ ہوتی ہیں اور دعا کی مقبولیت کی زیادہ امید ہوتی ہے۔

شعر کا مفہوم واضح ہے کہ ربِ کریم! میں بڑا بے صبرا انسان ہوں، صبر وتحمل میں اتنا کمزور ہوں کہ مصائب وآلام کے وقت مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہوں اور پریشانیوں کے مقابلہ کے وقت صبر وشکیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، تو اگر تیری رحمتیں، عنایتیں اس وقت مجھے سہارا نہ دیں گی تو میری ہلاکت یقینی ہوگی۔

حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ یوں دعا کر رہا ہے: اَللّٰھُمَّ ھَبْ لِي الصَّبْر، اے اللہ مجھے صبر عطا فرما۔ تو آپ نے اس سے فرمایا: طَلَبْتَ مِنَ اللّٰہِ الْبَلاءَ فَاطْلُبْ مِنْہُ الْعَافِیَۃَ، تو نے اللہ تعالیٰ سے مصیبت وبلا مانگی ہے تو اس سے عافیت بھی مانگ۔

امام بوصیری علیہ الرحمہ نے اسی حکم پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے خیر وعافیت اور حفظ وامان کی دعا کی ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) اس شعر میں ''الأھوال'' میں استعارۂ مکنیہ اصلیہ ہے، کیوں کہ ''اھوال'' کو جنگجو دشمن سے تشبیہ دی ہے اور مشبہ کو حذف کر کے اس کے مناسبات ومتعلقات میں سے ''دعوت'' (مقابلہ کے لیے بلانا) کو عبارت میں ذکر کیا ہے اور آگے ''ینھزم'' (شکست کھانے) کا ذکر ترشیح ہے۔

(۱۶۰)
وَائْذَنْ لِسُحْبِ صَلاۃٍ مِنْکَ دَائِمَۃٍ
عَلَى النَّبِيِّ بِمُنْھَلٍّ وَمُنْسَجِمِ

(۱۶۱)
مَا رَنَّحَتْ عَذَبَاتِ الْبَانِ رِیْحُ صَبًا
وَأَطْرَبَ الْعِیْسَ حَادِي الْعِیْسِ بِالنَّغَمِ

ترجمہ: اے اللہ تو اپنی رحمت کے بادلوں کو حکم دے کہ وہ سدا نبی کریم ﷺ پر موسلا دھار

اور لگاتار رحمت کی بھرن برساتے رہیں۔

جب تک بادِ صبا سے درختِ بان کی شاخیں جھومتی رہیں اور حدی خواں اپنے پرکیف نغموں سے اونٹوں کو مست اور تیز گام کرتے رہیں۔

لغات: اِئْذَنْ: حکم دے، صیغہ امر حاضر از أَذِنَ بِـهٖ اِذْناً (س) بمعنی اجازت دینا، مباح کرنا، حکم دینا. سُحْبٌ: سَحَابٌ کی جمع، بادل، یہ اصل میں سُحُبٌ تھا، ''حا'' کے پیش کو ضرورتِ شعری کی وجہ سے ساکن کر دیا. صَلاةٌ: رحمت (ج) صَلَوَاتٌ. دَائِمَةٌ: ہمیشہ، یہ صلاۃ کی صفت ثانیہ ہے اور ''عَلَى النَّبِي'' اسی سے متعلق ہے، یہ ''صلاۃ'' سے متعلق نہیں ہے، اس لیے کہ عمل کرنے سے پہلے جس مصدر کی کوئی صفت آجاتی ہے وہ کسی بھی لفظ میں عامل نہیں ہوتا ہے. مُنْهَلٌّ: اسم فاعل از اِنْهِلاَلٌ، زوردار برسنے والا مینھ. مُنْسَجِمٌ: اسم فاعل از انسجام، موسلا دھار. مَارَنَّحَتْ: ''مَا'' مصدریہ ظرفیہ ہے، جو بمعنی مَادَامَ استعمال ہوتا ہے اور رَنَّحَتْ تَرْنِيحٌ بمعنی ہلانا، جھمانا سے فعل ماضی ہے، رَنَّحَ الشَّرَابُ فُلاناً: شراب کا کسی کو لڑکھڑا دینا، ہچکولے دینا اور رَنَّحَتِ الرِّيحُ الْغُصْنَ: ہوا کا ٹہنی کو ہلانا، ہوا سے ٹہنی کا جھومنا. عَذَبَاتٌ: شاخیں، ٹہنیاں، واحد عَذَبَةٌ. الْبَانُ: ایک عربی درخت کا نام ہے جو نہایت حسین وجمیل اور پرکشش ہوتا ہے، عربی شعرا عموماً حسینوں کے قامتِ زیبا کو حسن ودل کشی میں اس سے تشبیہ دیتے ہیں، جس طرح فارسی اور اردو زبان کے شعرا انہیں ''سرو'' سے تشبیہ دیتے ہیں. رِيْحٌ: ہوا (ج) رِيَاحٌ وَ أَرْوَاحٌ وَ أَرْيَاحٌ. صَبَا: پروائی، وہ ہوا جو پورب سے چلے (ج) أَصْبَاءٌ وَصَبَوَاتٌ. اَطْرَبَ: فعل ماضی از اِطْرَابٌ بمعنی مست بنانا، بےخود کرنا، رقت طاری کرنا، خوشی سے مگن کرنا. الْعِيْسُ: واحد أَعْيَسُ وَ عَيْسَاءُ، سفید بھورے رنگ کا اونٹ، عمدہ نسل کا اونٹ. حَادِيْ: حدی خواں، مخصوص گانوں اور راگوں کے ذریعہ اونٹوں کو ہنکانے والا، اس گانے اور راگ کو حدی کہتے ہیں (ج) حُدَاةٌ. النَّغَمُ: نغمہ کی جمع، سریلی آواز، گیت، راگ۔

تشریح: امام بوصیری علیہ الرحمہ دعا کے بعد صلاۃ وسلام پر اپنے نعتیہ قصیدہ کو ختم کر کے یہ پیغام دے رہے ہیں کہ نیک کاموں کا اختتام صلوٰۃ وسلام پر ہونا چاہیے، یہی ہمارے اسلاف کرام اور بزرگان دین کا طریقہ رہا ہے۔

آخری شعر میں درختِ بان کی شاخیں جھومنے اور حدی خوانوں کے اپنے نغموں سے اونٹوں کو مستانہ وار چلانے کا ذکر ہے اور کسے نہیں معلوم کہ یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا، تو ان دونوں اشعار کا خلاصہ یہ ہوا کہ اے اللہ! قیامت تک اپنے محبوب اکرم ﷺ پر رحمت کی موسلا دھار لگاتار بارش برساتا رہ۔

عربی شاعری میں ہمیشگی اور دوام کو بتانے کے لیے مختلف تعبیریں استعمال کی جاتی ہیں، مثلاً مَا اخْتَلَفَ الْمَلَوَانِ اور مَا تَعَاقَبَ الْمَلَوَانِ (جب تک صبح وشام آتے جاتے رہیں اور جب تک یہ ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہیں)، مَارَنَّتِ الْحَمَامَةُ عَلٰى غُصُوْنِ الْبَانِ (جب تک کبوتری درختِ بان کی شاخوں پر نغمہ سنجی کرتی رہے)، مَا رَنَّحَتْ رِيْحُ صَبَا عَذَبَاتِ الْبَانِ (جب تک بادِ صبا سے بان کی شاخیں جھومتی رہیں)، مَا اَطْرَبَ الْعِيْسَ حَادِي الْعِيْسِ بِنَغْمِهٖ (جب تک حدی خواں اپنے نغموں سے اونٹوں کو مستانہ وار چلاتے رہیں) وغیرہ جیسے اردو زبان میں کہتے ہیں: جب تک چاند سورج نکلتے رہیں، جب تک سانس لینے والے سانس لیتے رہیں۔ میر انیس نے اسی طرح کی ایک تعبیر سے طول بقا اور درازیِ مدت کا مفہوم یوں ادا کیا ہے:

جب تک کہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

اس قصیدہ کو لفظ ''النَّغَم'' پر ختم کیا ہے، جس کا معنیٰ نغمے، گیت، سریلی آواز ہے، جس سے اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اسے خوش الحانی اور سریلی آواز سے پڑھنا چاہیے، تاکہ سامعین کے دل پوری طرح اس کی جانب مائل ہوں اور وہ دل لگا کر اس نعتِ پاک کو سنیں اور اس کے فیوض و برکات سے اپنے دامن بھریں۔

فائدہ: قصیدۂ بردہ شریف کے صحیح ترین نسخوں میں "مَا رَنَّحَتْ عَذَبَاتِ الْبَانِ" الخ تک ہی اشعار ہیں، لیکن بعض نسخوں میں ان کے بعد کچھ اور اشعار کا اضافہ بھی ملتا ہے اور علمی وروحانی حلقوں میں ان کا ورد بھی ہوتا ہے، جن میں خلفاے راشدین، اہل بیت، صحابہ، تابعین، عامۃ المسلمین اور پھر قصیدہ لکھنے والے اور پڑھنے والے کے لیے دعا کی گئی ہے، ان اشعار میں معنوی اور شرعی حیثیت سے کوئی قباحت نہیں ہے، اس لیے انہیں بلا جھجک پڑھا اور سنا جاسکتا ہے، مگر روایت کے اعتبار سے یہ اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترتے، اس لیے صحیح ترین نسخوں میں یہ نہیں ملتے اور اسی بنا پر عام طور سے شارحین نے ان کی شرح نہیں کی ہے، علامہ شیخ ابراہیم باجوری علیہ الرحمہ نے اپنی شرح بردہ میں اس مضمون کی صراحت کی ہے، اس طرح صحیح ترین نسخوں کے مطابق قصیدۂ بردہ کے کل اشعار ایک سو ساٹھ (۱۶۰) ہیں، گزشتہ اشعار میں شعر نمبر (۵۴) بھی بعض نسخوں ہی میں ملتا ہے، بیش تر نسخے اس سے خالی ہیں، مگر میں نے بغرضِ تکمیل اس شعر اور دوسرے اشعار کو بھی اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔

محاسن بلاغت: (۱) پہلے شعر میں صلوٰۃ (درود اور رحمت) کی بادلوں سے تشبیہ، تشبیہِ بلیغ ہے (۲) اور اس میں "سُحُبٌ" کے ساتھ مُنْهَلٍّ اور مُنْسَجِمٌ کے ذکر کرنے میں صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے، اسی طرح آخری شعر میں بھی یہ صنعت دونوں مصرعوں میں موجود ہے (۳) ساتھ ہی ساتھ آخری شعر کے دونوں مصرعوں میں کنایہ بھی ہے جیسا کہ شعر کی تشریح سے واضح ہو چکا۔

ㅇ ثُمَّ الرِّضَا عَنْ أَبِي بَكْرٍ وَ عَنْ عُمَرَ ... وَعَنْ عَلِيٍّ وَعَنْ عُثْمَانَ ذِي الْكَرَمِ

ㅇ وَالْآلِ وَالصَّحْبِ ثُمَّ التَّابِعِيْنَ لَهُمْ ... أَهْلِ التُّقَى وَالنُّقَى وَالْحِلْمِ وَالْكَرَمِ

ترجمہ: پھر حضرت ابو بکر و عمر و علی اور پیکر جود وسخا حضرت عثمان اور سرکار کی آل واصحاب اور تابعین کرام سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جو تقویٰ و پرہیز گاری، طہارت و پاکیز گی، حلم و بردباری اور جود وسخا کے پیکر ہیں۔

ㅇ يَا رَبِّ بِالْمُصْطَفٰى بَلِّغْ مَقَاصِدَنَا ... وَاغْفِرْ لَنَا مَا مَضٰى يَا وَاسِعَ الْكَرَمِ

ترجمہ: اے میرے پالنہار! سرکارِ مصطفیٰ ﷺ کے وسیلے سے ہماری مرادیں پوری فرما، اور اے وسعتِ کرم والے! ہمارے سابقہ گناہ بخش دے۔

ㅇ يَا رَبِّ جَمْعًا طَلَبْنَا مِنْكَ مَغْفِرَةً ... وَحُسْنَ خَاتِمَةٍ يَا مُبْدِئَ النِّعَمِ

ترجمہ: اے پروردگار اور اے ساری نعمتوں کو وجود بخشنے والے! ہم سب تجھ سے مغفرت اور حسن خاتمہ کے طالب ہیں۔

o وَاغْفِرْ إِلٰهِي لِكُلِّ الْمُسْلِمِينَ بِمَا يَتْلُوْهُ فِي الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰى وَ فِي الْحَرَم

ترجمہ: بارالٰہا! ہر مسلمان کو اس کے وسیلہ سے بخش دے جو مسجد اقصیٰ اور حرم پاک میں وہ تلاوت کرتا ہے۔

o بِجَاهِ مَنْ بَيْتُهُ فِيْ طَيْبَةِ حَرَمٌ وَاسْمُهُ قَسَمٌ مِّنْ أَعْظَمِ الْقَسَم

ترجمہ: اس ذاتِ پاک کے طفیل جس کا کاشانۂ اقدس حرم طیبہ میں ہے اور جس کا نام نامی عظیم ترین قسموں میں سے ایک قسم ہے۔

o فَاغْفِرْ لِنَاشِدِهَا وَاغْفِرْ لِقَارِئِهَا سَأَلْتُكَ الْخَيْرَ يَا ذَا الْجُوْدِ وَالْكَرَم

ترجمہ: اے جود و کرم فرمانے والے خدا! اس قصیدہ کے لکھنے والے کو اور اسے پڑھنے والے کو بخش دے، میں تجھ سے خیر کا طالب ہوں۔

o وَهٰذِهٖ بُرْدَةُ الْمُخْتَارِ قَدْ خُتِمَتْ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ فِيْ بَدْءٍ وَّ فِيْ خَتَم

ترجمہ: یہ نبی مختار کی نعت ''قصیدۂ بردہ'' اختتام کو پہنچی، اس کی ابتدا اور انتہا میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے۔

o أَبْيَاتُهَا قَدْ أَتَتْ سِتِّيْنَ مَعْ مِائَةٍ فَرِّجْ بِهَا كَرْبَنَا يَا وَاسِعَ الْكَرَم

ترجمہ: اس کے اشعار ایک سو ساٹھ ہوتے ہیں، اے وسعتِ کرم والے معبود! اس کے وسیلہ سے ہماری مصیبت اور پریشانی دور فرما دے۔

فائدہ: صحیح ترین نسخے کے مطابق قصیدۂ بردہ شریف کے اصل اشعار کی تعداد کل ایک سو ساٹھ ہے، البتہ اس کے بعض نسخوں میں کچھ اضافے بھی ملتے ہیں، اس شعر میں صحیح ترین نسخے کے مطابق اشعار کی تعداد ایک سو ساٹھ (۱۶۰) بتائی گئی ہے۔

قد وقع الفراغ من ترجمة هٰذه القصيدة الميمونة و شرحها وتعليقها يوم الجمعة قُبَيْلَ أذان الجمعة ثالث شهر ذي الحجة سنة خمس وعشرين وأربع مائة وألف من الهجرة النبوية(١٤٢٥ھ) وأنا العبدالفقير إلى الله الغني نفيس أحمد القادري المصباحي من سُكّان مدينة سِدّهور (Siddhaur) بمديرية باره بنكي(Barabanki)، ولاية أترابرديش بالهند. اَللّٰهم فرج الكرب عني وعن سائر المسلمين بحق نبيّك الكريم ومديحه هذا العظيم. والحمدللّٰه أولا وآخراً، ظاهراً وباطناً وهو بكل شيءٍ عليم، وصلى اللّٰه وسلم على سيدنا ومولانا ومأوانا وملجانا محمد النبي الأمين وعلى آله الطاهرين وصحبه أجمعين إلىٰ يوم الدين.